

چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

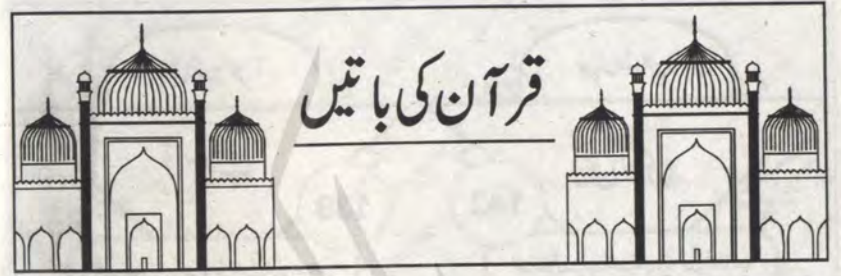
ڈائجسٹ

کراچی



مارچ 2013





قرآن کی باتیں

☆ کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت یعنی دین اسلام ہی ہدایت ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 120)

☆ اے پیغمبر کہہ دو کہ ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 73)

☆ تو جس شخص کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے، اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے اس طرح اللہ ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے، عذاب بھیجتا ہے۔ (سورۃ الانعام 6 آیت 125)

☆ اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھاتا۔ (سورۃ یونس 10 آیت 25)

☆ کہہ دو کہ لوگو تمہارے رب کے ہاں سے تمہارے پاس حق آچکا ہے تو جو کوئی ہدایت حاصل کرتا ہے تو ہدایت سے اپنے ہی حق میں بھلائی کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو گمراہی سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور میں تمہارا وکیل نہیں ہوں۔ (سورۃ یونس 10 آیت 108)

☆ جو شخص ہدایت اختیار کرتا ہے تو اپنے لئے اختیار کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو گمراہی کا ضرر بھی اسی کو ہوگا اور کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں، عذاب نہیں دیا کرتے۔

(سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 15)

☆ جس کو اللہ ہدایت دے وہ ہدایت یاب ہے۔ اور جس کو گمراہ کرے، تو تم اس کے لئے کوئی دوست راہ بتانے والا نہ پاؤ گے۔ (سورۃ کہف 18 آیت 17)

☆ کہہ دو کہ جو شخص گمراہی میں پڑا ہوا ہے اللہ اس کو آہستہ آہستہ مہلت دیئے جاتا ہے یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، خواہ عذاب اور خواہ قیامت تو اس وقت جان لیں گے کہ مکان کس کا برا ہے اور لشکر کس کا کمزور ہے اور جو لوگ ہدایت یاب ہیں، اللہ ان کو زیادہ ہدایت دیتا ہے اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں، وہ تمہارے رب کے صلے کے لحاظ سے خوب اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں۔ (سورۃ مریم 19 آیت 75 سے 76)

☆ جس کو اللہ روشنی نہ دے، اس کو کہیں بھی روشنی مل سکتی۔ (سورۃ نور 24 آیت 40)

☆ مگر جو غلام ہیں، بے سمجھے اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں تو جس کو اللہ گمراہ کرے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔ (سورۃ روم 30 آیت 29)

☆ اور جس کو اللہ گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں آوری جس کو اللہ ہدایت دے، اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ (سورۃ زمر 39 آیت 36 سے 37)

☆ اور جس شخص کو اللہ گمراہ کرے تو اس کے بعد اس کا کوئی دوست نہیں۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 44)

☆ اور جس کو اللہ گمراہ کرے اس کے لئے ہدایت کا کوئی رستہ نہیں۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 46)

☆ قسم نفس انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اس کے اعضا کو برابر کیا پھر اس کو بدکاری سے بچنے اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی یقیناً وہ فلاح پا گیا جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو بدایا۔ (سورۃ شمس 91 آیت 7 سے 9)

☆ مومنو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک ان الفاظ کو جو منہ سے کہو، سمجھنے نہ لگو، نماز کے پاس نہ جاؤ۔ (سورۃ نسا 4 آیت 32)

☆ لوگوں اپنے رب سے ڈرو کہ قیامت کا زلزلہ ایک حادثہ عظیم ہے۔ اے مخاطب جس دن تو اس کو دیکھے گا اس دن یہ حال ہوگا کہ تمام دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی اور تمام حمل والیوں کے حمل گر پڑیں گے اور لوگ تجھ کو متوالے نظر آئیں گے مگر وہ متوالے نہیں ہونگے بلکہ عذاب دیکھ کر مدہوش ہو رہے ہوں گے، بے شک اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔ (سورۃ حج 22 آیت 1 سے 2)

☆ اور ہدایت کی کہ بیٹا ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہوتا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہوتا اور میں اللہ کی تقدیر تو تم سے نہیں روک سکتا۔ بے شک حکم اسی کا ہے میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اہل توکل کو اسی پر بھروسہ رکھنا چاہئے اور جب وہ ان ان مقامات سے داخل ہوئے جہاں جہاں سے داخل ہونے کے لئے باپ نے ان سے کہا تھا تو وہ تدبیر اللہ کے حکم ذرا بھی ٹال نہیں سکتی تھی ہاں وہ یعقوبؑ کے دل کی خواہش بھی جو انہوں نے پوری کی تھی اور بے شک وہ صاحب علم تھے کیونکہ ہم نے ان کو علم سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سورۃ یوسف 12 آیت 67 سے 68)

☆ اور کافر جب یہ نصیحت کی کتاب سنتے ہیں تو یوں لگتے ہیں کہ تم کو اپنی نگاہوں سے پھسلا دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے اور لوگو یہ قرآن اہل عالم کے لئے نصیحت ہے۔ (سورۃ قلم 68 آیت 51 سے 52)

☆ اور جس شخص نے ایمان چھوڑ کر اس کے بدلے کفر کیا وہ سیدھا رستے سے بھٹک گیا۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 108)

(کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“ بشکر یہ شمع بک ایجنسی کراچی)

نوشین خان کوٹ مظفر ملکی سے، نیا شمارہ ستائیس تاریخ کو ملا۔ سرورق بہت اچھا اور جاذب نظر تھا۔ سب سے پہلے حسب معمول اسلامی باتیں پڑھیں۔ پھر کہانیوں کی وادی میں چھلانگ لگائی۔ تین ماہ سے آپ مجھے مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں۔ میں خط تواتر سے ارسال کرتی ہوں اور آپ شائع ہی نہیں کرتے۔ وجہ ضرور جانتا چاہوں گی۔ پائیز ایسا مت کیا کریں۔ دل ٹوٹ جاتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ خیال رکھیں گے۔ سب سے پہلے عمران قریشی کی اسٹوری لکھام کا مطالعہ کیا جو کہ سوسوچی۔ پھر ایلیس اتیاز کی جنات کا مہمان پڑھی۔ انجام ساجدہ راجہ کی اچھی کہانی تھی۔ ساجدہ جی اگر میں آپ سے دوستی کر ریکویسٹ کروں تو کیا آپ دوست بنیں گی میری؟؟ ضرور بتائیے گا۔ خودی کا قاتل مجھ سے بالآخر تھی۔ رولو کا اچھی تھی مگر اس میں جذباتی مناظر بہت تھے۔ بھیا نک سزا گزارا نا پ تھی۔ خونی جو کہ انگلش فلوں سے ماخوذ لگتی تھی۔ آئینی محمد..... وارث آصف کی کہانی میری خالہ زاد کی آپ بیتی تھی جو میں نے وارث آصف کو فون پر سنا کر گزراش کی تھی کہ اسے حرف بہ حرف ارسال کریں۔ انہوں نے اسے اسی مشکل میں ڈھالا جس پر میں ان کی شکر گزار ہوں۔ روح بیتی اچھی کہانی تھی۔ بدروح پیکر ٹھیک تھی۔ سنہری تابوت بھی اچھی تھی۔ مغرو ٹھیک نہیں تھی۔ تابوت جاسوسی کہانی کی تحریک شدہ شکل تھی۔ نقشہ اچھی کہانی تھی۔ اگر طویل ہوتی تو مزہ آتا۔ برنڈر نامورنی زبردست تحریر تھی۔ ڈرکا مختصری اور مزے دار اسٹوری تھی۔ بلیک ٹائیگر پرنومنس، ذرا سی بات دل کو لگی۔ پہاڑی کے جن واقعی تعریف کے لائق تھی۔ اپنی غزل شائع کرنے پر مشکور ہوں۔

☆ نوشین صاحبہ: آپ یقین کریں کہ ہم کسی کا بھی خط ضائع نہیں کرتے اگر خط ہم تک نہیں پہنچے تو ہمارا کیا قصور۔ اگر کوئی خط دیر سے موصول ہوتا ہے تو وہ بھی آئندہ شمارے میں شامل اشاعت ہو جاتا ہے۔ امید ہے آپ سائنڈ نہیں کریں گی اور نوازش نامہ ضرور ارسال کریں گی۔

افشان رمضان پٹنہ دادخان سے، السلام علیکم! آپ سب کو خوشیوں بھر 2013ء بہت مبارک ہو۔ خطوط شائع کرنے اور خطوط کو پسند کرنے والے تمام لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے توئی امید ہے کہ خطوط کہانی پڑھنے والوں کو پسند آئی ہوگی۔ اس کے علاوہ شمارے کی دیگر کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ آج کل زیادہ تر اسٹوریاں بڑی محنت سے اپنی کاوشیں ارسال کر رہے ہیں اور ان کی محنت کہانیوں میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ ایک ریکویسٹ تھی وہ یہ کہ ڈر میں "مختصر کہانیوں" کا سلسلہ جلدی شروع کیا جائے تاکہ چھوٹے اسٹوریاں بھی آگے آئے کہ موقع ملے میری غزل کی اشاعت کے لئے شکریہ۔ ساجدہ راجا، عاصمہ رمضان، عروج، سنبل، مدثر بخاری، احسان بھر، محمد اسلم کی غزلیں اچھی رہیں۔ کہانی ارسال خدمت ہے۔ امید ہے حوصلہ افزائی کر کے ضرور شکریہ کا موقع دیں گے۔

☆ افشان صاحبہ: خط لکھتے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے تنصیص۔ چلے خوش ہو جائیے آپ کی نیلی کوٹھی شامل اشاعت ہے اور اب نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ امید ہے بہت جلد شکریہ کا موقع دیں گی۔

نورین اعظم راولپنڈی سے، السلام علیکم، امید ہے کہ ڈرڈائجٹ روز و شب ترقی کی طرف رواں دواں ہو۔ تمام اسٹوریاں میری طرف سے سلام۔ 27 جنوری کو ڈرکا نیا شمارہ ملا، ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں، جلدی سے چھلانگ لگاتے ہوئے خطوط کی طرف دوڑی اپنا نام دیکھ کر جو خوشی اور مسرت مجھے ملی ہے اسے میں بیان کرنے سے قاصر ہوں بہت بہت شکریہ امید ہے آئندہ بھی ایسی ہی خوشی ملے گی۔ کہانی شائع نہ ہو سکی ارمانوں پر اوس بڑی پھر دل بہلانے کے لئے سوچا چلو غزل تو شائع ہو گئی ہوگی مگر جب دیکھا تو وہاں میرا نام نہ تھا۔ پائیز اسے شائع کر دیں۔ چلو خیر مگر آپ نے خطوط شائع کر کے میرا دل باغ باغ کر دیا۔ اتنی مایوسی نہیں ہوئی۔ امید ہے کہ آئندہ بھی مجھے یاد رکھیں گے۔ ایک کہانی اور ایک اشعار بھیج رہی ہوں۔ امید ہے کہ اسے شائع کریں گے اور میرا دل نہیں توڑیں گے ابھی صرف سنہری تابوت اور رولو کا پڑھی ہے اس لئے کہانیوں پر تیرہ کرنے سے قاصر ہوں، پائیز یہ کہانی میں نے بہت محنت اور لگن سے لکھی ہے اگر اس میں کوئی غلطی ہے تو پائیز اسے ٹھیک کر کے شائع ضرور کیجئے گا

نہیں تو میرا دل ٹوٹ جائے گا آپ نے مجھے جو خطوط شائع کر کے حوصلہ دیا ہے میں چاہتی ہوں کہ میں ہر ماہ ڈرڈائجٹ میں لکھنے کی سعادت حاصل کروں آپ کا شکریہ پائیز اسے ضرور شائع کریں میں نے پہلے بھی ایک کہانی بھیا نک سزا بھیجی تھی اس کے بارے میں بتائیے گا کہ وہ آپ کو کیسی لگی اگر آپ کہانی شائع نہیں کریں گے تو شاید میں پھر کہانی لکھنے کا حوصلہ نہ کر پاؤں اب یہ آپ پر ہے، اللہ آپ سب کو ترقی دے۔ آپ مجھے خط کی آخری تاریخ بھی بتادیں کہ میرا خط ہر ماہ وقت پر پہنچ جائے۔ شکریہ۔

☆ نورین صاحبہ: ہم بھی آپ کی خوشی میں خوش ہیں۔ بھیا نک سزا بہت ہی چھوٹی ہے اس سے بڑی انوکھا تعلق، آئندہ آپ کم از کم دس بارہ صفحات کی کہانیاں ارسال کیجئے گا، ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ ماہ انوکھا تعلق شائع ہو، غزل شامل اشاعت ہے، خط کی تاریخ ہر ماہ چھ سات تاریخ تک موصول ہو جائے۔ شکریہ۔

☆ سنبل طہ: سرگودھا سے، آداب، ڈرکا کرنت شمارہ 5 تاریخ کو ملا، سب سے پہلے خطوط میں اسارہ نوشین، بلقیس خان اور محمد آصف شہزاد کا شکریہ، کائنات بلوچ کو بھی آپ سے یہ شکایت ہے کہ خطوط کاٹ کر کیوں شائع کیا جاتا ہے۔ کہانیوں میں خطوط کا کوئی جواب نہ تھا۔ محاف، تابوت کہانی، ہولناک رات، گمشدہ مسافر بھی اچھی تھی۔ موت کے رنگ ٹھیک نہیں تھی۔ غزلوں میں میری غزل کی اشاعت کے لئے تنصیص، آستہ، عاصمہ، افشان، عروج، محمد آصف شہزاد، ایلیس اتیاز احمد اور غلام نبی نوری کے کلام بہت زبردست تھے۔ ایک ریکویسٹ تھی کہ کوئی ایسا سلسلہ بھی شامل کریں جس میں رائٹرز کے بارے میں جانا جائے۔ مطلب انٹرویوز کا سلسلہ۔ میں مختصر واقعات بھیج رہی ہوں آپ اپنے مختصر مختصر واقعات والے سلسلے میں شامل کر لیجئے گا۔ کچھ آڈیو ریکارڈ اور غزلیں بھیج رہی ہوں۔ پائیز جلد شائع کیجئے گا۔ اب اجازت چاہوں گی۔ امید ہے میرے خط اور آڈیو ریکارڈ کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ اللہ حافظ۔

☆ محفل صاحبہ: خطوط کے لئے چند صفحات محدود ہیں، لہذا سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اصل مقصد شائع کر دیا جاتا ہے۔ آپ سب کی غزلیں اور اشعار متواتر شائع ہو رہے ہیں۔ مختصر کہانیوں اور انٹرویو کا سلسلہ مغرب شروع کیا جائے گا۔ آئندہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

بلقیس خان پٹنہ سے، السلام علیکم، ڈرکا ماہ فروری کا شمارہ جنوری کی 21 تاریخ کو مل گیا۔ سب سے پہلے ٹائٹل کو سرسری دیکھا۔ ٹائٹل وغیر نقل ثر دے رہا تھا۔ اس کے بعد قرآن کی باتوں سے دل کو منور کیا۔ خطوط میں اپنا خط دیکھ کر دل خوش ہوئی۔ سب دوستوں کے خطوط زبردست اور کھلے اور خوب صورت تھے۔ رضیہ عارف صاحبہ واقعی آپ درست فرما رہی ہیں۔ پٹنہ شہر کے حالات بھی کراچی کی طرح دگرگوں ہیں۔ بس دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم کرے۔ فارینہ، نسیم، پرنسز ڈی، انوری رمضان کو اور ایلیس حبیب خان، عاصمہ رمضان اور نعمت محمود کو، پیار سے مہر پور سلام قبول۔ آپ نے رائٹرز کو حوصلہ دیتے ہیں۔ عثمان غنی کے شعر نے متاثر کیا۔ غزلوں اور نظموں میں احسان بھر کی غزل اور ساجدہ راجا کی نظم نے متاثر کیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے میناش پڑھی۔ ویلڈن کہانی واقعی ابتدائی صفحات کے قابل تھی۔ دوسرے نمبر پر واصل جنم رہی۔ مگر کہانی بڑی تھی اور رائٹرز کی مضبوط گرفت کی وجہ سے اچھی لگی۔ شائستہ جی قاتل نے تیسرا نمبر لے لیا۔ باقی سب دوستوں کی کہانیاں زبردست رہیں۔ قسط وار اسٹوریز میں بلیک ٹائیگر نے اس بار بازی لیٹ دی۔ البتہ اس بار مغربی کہانیاں زیادہ تھیں۔ البتہ ایلیس اتیاز احمد کی شیطانی کھوپڑی اور عابد علی کی خلا سے واپسی زبردست کہانیاں تھیں۔ باقی ڈر کے لئے دعا گو۔

☆ بلقیس صاحبہ: بہت بہت شکریہ، آپ قلبی لگاؤ سے خط لکھتی ہیں۔ تعریفی الفاظ کے لئے شکریہ، آپ کی کہانی دیوی ضرور شائع ہوگی، تجوڑ انتظار کر لیں پائیز!

فاریہ تبسم ٹھیک موز قصبہ سے، ڈر کے تمام اسٹوریاں، اشاف، قاریوں، لکھاریوں کو میری طرف سے بہت بہت سلام قبول ہو۔ نیا شمارہ بہت لیت ملا۔ قرآن کی باتیں زبردست تھیں۔ خطوط میں اپنا خط دیکھ کر مسرت ہوئی۔ بلقیس خان، رضیہ خان، نورین اعظم، ساجدہ راجا، انوری رمضان، غلام نبی نوری، پرنسز ڈی اور عاصمہ رمضان کے خطوط دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ کہانیوں میں رولو کا کیٹ آف دی ملتھ تھی۔ زندگی، بھروکن، قاتل، خلا سے واپسی، واصل جنم، سیاہ بھوت، خونی پاؤں، کلون، دل کے رشتے اور جادوگر بہت اچھی تھیں۔ لمبے بال اس سے پہلے ایک اور رسالے میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ تو س طرح میں افسانے رباب، فریدہ خانم، مریم ماہنیر، محمد ذاکر اور محمد وارث آصف کے کلام اچھے تھے۔ آخر میں سب کے لئے ڈھیر سلام۔

☆ قاریہ صاحبہ: کہانیوں کی تعریف اور خط لکھنے کے لئے تحفیکس، آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کا بہت انتظار ہے گا۔

انصوری رمضان چنڈا واخان سے، ڈر کے تمام رانٹرز اور ڈر کی پوری ٹیم کو میرا سلام! اب چلتے ہیں آگے، سب سے پہلے آپ سب کا میں شکر یہ ادا کرتی ہوں کہ میری غزل اور خط واد میں شامل ہوا۔ کہانیوں میں اپنی کہانی نہ پا کر مایوسی ہوئی، خیر کمرے کا آنیہ، گمشدہ، آگئی کا سفر، سنہری تابوت، منحوس والا اور پراسرار ہوش اچھی تھی۔ جن رانٹرز نے میری ”چچی نکار“ کو پسند کیا ان کا شکر یہ۔ قوس قزح میں سہیل ماہین طے، افشاں رمضان اور عاصمہ رمضان اور غلام نبی قوری کی غزلیں پسند آئیں۔ ایڈیٹر صاحب میں ایک اور کہانی ارسال کر رہی ہوں، پسند تو یقیناً آئے گی۔ اشاعت ڈرا جلدی کیجئے گا۔

☆ انصوری صاحبہ: آپ کی کوئی اور کہانی ہمارے پاس موجود نہیں۔ آپ پلیز! ڈرا جلدی سے نئی کہانی ارسال کر دیں۔ خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے کوڈ نہ بھولنے کے لئے شکر یہ قبول کیجئے۔

دیحان خان میرا ان شاہ، ڈرڈائجسٹ کے پورے اسٹاف کو میرا سلام قبول ہو۔ پہلے میں ڈرڈائجسٹ کا شکر یہ ادا کرنا چاہوں گا کہ میرے خط کو جلدی کی۔ اس کے بعد میں ایڈیٹر صاحب سے کہنا چاہوں گا کہ آپ کے کہنے پر میں نے ڈرڈائجسٹ کو ایک مشکل اسٹوری بھیج دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسے پورا پڑھ کر میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ میری اس کہانی کے بعد میں اپنی سلسلے وار کہانی بھی آپ کو ارسال کر دوں گا۔ جس کا میں نے آپ سے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسے جلد ہی پڑھ لیں گے۔ اس کے بعد میں آتا ہوں۔ کہانیوں کی طرف پہلے میں رولو کا کی بات کروں گا جو دھیرے دھیرے پتھری کی طرف اپنے قدم پر جا رہی ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے بعد میری پسندیدہ کہانی الیاس صاحب کی بلیک ٹائیگر بہت عمدہ اور زبردست کہانی ہے اور تیسرے نمبر پر سنہری تابوت بھی ایک دلچسپ تحریر ہے۔ مشکل اسٹوری میں سب سے پہلے نمبر پر بھیاک بن اجو شاستہرے لکھی تھی واقعی میں سبق آموز کہانی ہے اور انجام بھی ایک حیران کن اور اچھی کہانی تھی اور باقی سب بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ ویسے بھی ڈرڈائجسٹ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آخر میں اس دعا کے ساتھ رخصت ہونا چاہوں گا کہ ڈرڈائجسٹ دن بدن ترقی کرتا رہے۔

☆ ریحان صاحب: آپ کی کہانی مل گئی ہے ابھی پڑھی نہیں لیکن امید ہے کہ اچھی ہوگی۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ چند چھوٹی کہانیاں لکھیں تو زیادہ فائدہ ہوگا۔ قسط وار کہانی لائن میں لگ جائے گی۔ لیکن چھوٹی کہانیاں اکثر شائع ہوتی رہیں گی جس سے دل خوش رہتا ہے۔ امید ہے آپ میری باتوں پر تنبیہ کی سے غور فرمائیں گے۔ اگلے ماہ بھی تمہارے کا انتظار ہے گا۔

پیسر نوید ہاشمی ننڈو جام سے، مہر کی و محترم ایڈیٹر ڈرڈائجسٹ آداب عرض، امید ہے کہ بخیریت ہوں گے، اول اپنا مختصر تعارف کروا دوں گا کہ اس کو عبدالقادر کہتے ہیں اور پیر نوید شاہ ہاشمی کے قلمی نام کے ساتھ اردو اور سندھی ادب سے 25، 26 برس پرانی وابستگی ہے۔ کچھ عرصہ قبل ننڈو جام کے بک اسٹال پر ”ڈرڈائجسٹ“ دیکھا تو ایسا دل میں اترا کہ مستقل قاری بن بیٹھے، چونکہ دینے والی ڈراؤنی، پراسرار کہانیوں کے لئے مخصوص ”ڈرڈائجسٹ“ بلاشبہ اپنی نوعیت کا منفرد اور اچھوتا پڑچہ ہے، انسو تو اس بات کا ہوا کہ اس کی اشاعت کو 14 برس بیت چکے ہیں لیکن ہماری شناسائی اب ہوئی ہے آخر ”دیر آید درست آید“ کے مصداق ”اب قلمی رفاقت نبھانے رہیں گے، فی الوقت چند ایک چھوٹی موٹی قلمی اشیا اور اس تہرہ کے ساتھ آغا کر رہے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ مکمل حوصلہ افزائی کر کے آئندہ کہانیاں ارسال کرنے کے جذبے کو حوصلہ دیں گے۔ کچھ بات ہو جائے شمارہ فروری 2013ء کی جو اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہاتھوں کے کھینچے میں ہے۔ ٹائٹل حسب سابق دل ولادینے والا ہے۔ ”ڈرڈائجسٹ“ کے انوکھے اور دہشت ناک ٹائٹل اسے اسٹارز پر سب سے ممتاز ثابت کرتے رہتے ہیں جس کے لئے آپ سب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جہاں تک ڈرڈائجسٹ کی کہانیوں کا سوال ہے تو یقیناً کریں کہ سب کہانیاں اس قدر مزے دار لگیں کہ نمبر زدے میں اب الجھن ہو رہی ہے، تو ہماری رائے کے مطابق اس مرتبہ طویل کہانی ”واصل جہنم“ اول رہی۔ بہرہ کن، قاتل، میناش، سیاہ بھوت بھی اس شمارہ کی بہترین کہانیاں ثابت ہوئیں اور پوری طرح محفوظ کرنے کا باعث بنیں۔ ان کے علاوہ دیگر کہانیوں میں کلون، لمبے بال، شیطانی کھوپڑی، دل کے رشتے، زندگی، خونی پاؤں، دعا کی طاقت، موت کا پیچھا، جادوگر اور خلا سے واپسی بھی مناسب رہیں۔ بلیک ٹائیگر اور سنہری تابوت کی تو کیا تعریف کی جائے۔ ایم الیاس اور ایم اے راحت جیسے بڑے نام ڈرڈائجسٹ میں شامل ہیں۔ تو یہ بات

ڈائجسٹ کی مقبولیت اور معیار کا بذات خود ایک اور برا ثبوت ہے۔ رولو کا بھی بہت زیادہ قابل تعریف ہے۔ میں شب و روز ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں آئندہ بھی چند اچھی تحریروں کے ساتھ ضرور حاضر خدمت ہوں گا۔

☆ نوید صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موٹ و مکمل، آپ کو ڈرڈائجسٹ اچھی لگا اور اس میں موجود کہانیاں دل کو بھاگیں، اس کے لئے بہت بہت شکر یہ چلے حوصلہ افزائی ہوگی اور اب امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اپنی رائے بھیج کر شکر یہ کا موقع دیتے رہیں گے۔

انس رحمان کورٹ عبدالملک سے، امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور سارے قارئین بھی بخیر و عافیت سے ہوں گے۔ میں عرصہ پانچ سال سے ڈرڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ لیکن آج تک خط لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ آج اس امید پر خط لکھ رہا ہوں کہ میرے خط کو ضرور شامل اشاعت کیا جائے گا۔ اب کچھ بات جنوری کے شمارے کی کی جائے تو ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ڈرڈائجسٹ بے مثال تھا۔ کہانیوں میں اپنی پسندیدہ رولو کا پڑھی۔ سچ بتاؤں ڈرڈائجسٹ میں نے رولو کا کی وجہ سے ہی پڑھنا شروع کیا تھا۔ سنہری تابوت بھی اچھی جارہی ہے۔ باقی کہانیاں بھی زبردست ہوں گی۔ آپ میری ارسال کردہ کہانی کو پڑھئے گا ضرور اگر پسند آئے تو شائع کر دیجئے گا۔ آخر میں ڈرڈائجسٹ کے لئے بہت ہی دعا میں۔

☆ انس صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، چلے حوصلہ افزائی ہوگی اب تو خوش ہیں ناں، کہانی بھیاک ستر بھیجے گا شکر یہ، کہانی لیٹ موصول ہوئی لہذا ابھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو اگلے شمارے میں اصلاح کے بعد ضرور شائع ہوگی۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیج کر ضرور شکر یہ کا موقع دیں گے۔

محمد اسحاق انجم کلنگ پور سے، السلام علیکم! امید ہے آپ باخیریت ہوں گے! شمارہ جنوری ”ڈرڈائجسٹ“ اپنی خوب صورتی کے ساتھ ملا۔ مکمل پڑھ نہیں سکے، ابھی تک اس لئے کچھ لکھنا مناسب نہیں! پھر بھی آپ نے جس خوب صورتی کے ساتھ اور محنت کے ساتھ شائع کیا! اچھا ہے اور کہانیوں کا انتخاب بھی خوب سے خوب تر ہے۔ میری طرف سے تمام لکھنے والوں کو اور آپ سب کو بہت بہت سلام اور نیک تمنا میں۔

☆ اسحاق صاحب: خلوص دل ارسال کرنے کے لئے شکر یہ۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی ڈر کو یاد کرنا بھولیں گے نہیں۔ Thanks

پروفیسر واجد ننگینوی کراچی سے، ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کا شمارہ فروری 2013ء گلابی سرور دیوں کا بیٹا م کے کر ناظرین حاضرین کی خدمت میں ہاتھوں کی زینت بن چکا ہے۔ لا جواب انوکھی کہانیوں غزلیات کے مرتب کے ساتھ حسین و جمیل اور خوفزدہ ناکل کے ساتھ راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر دینے کے ساتھ آپ حضرات کو تکلف اندوز کر رہا ہے میں ادارے کا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ ہر ماہ پابندی سے میری غزل اور رائے کا اظہار شائع کر کے شکر یہ کا موقع عطا فرماتے ہیں۔ اس کے علاوہ لطائف اور دلچسپ تحریریں بھی ہوتی ہیں۔ ڈر کے نکھار میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لئے عوام اور خواص میں مقبول رہتا ہے۔ میری نیک تمنا میں اور دعائیں ڈرڈائجسٹ کے ساتھ ہیں۔

☆ واجد صاحب: آپ کا بہت بہت شکر یہ کہ آپ اپنی مصروفیات میں سے تھوڑا وقت نکال کر ڈرڈائجسٹ کے لئے اپنی کاوشیں بھیج رہے ہیں۔ کوئی اچھی کہانی بھی لکھ بھیجیں۔ امید ہے آپ شکر یہ کا موقع ضرور دیں گے۔ Thanks

محمد نوید انجم سوادہ چکوال سے، آداب!!! بہت عرصے بعد ڈر کے خطوط کی محفل میں شامل ہو رہا ہوں، بس کچھ پریشانی تھیں اب اللہ پاک کے فضل و کرم سے اور آپ کی دعاؤں سے ٹھیک ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ڈرڈائجسٹ کے تمام اراکین خدا کے فضل و کرم سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ ”قرآن کی باتیں“ پڑھیں اور دل میں یہی خیال کیا کہ انسان کو ہر حال میں چاہے خوشی ہو چاہے غمی ہو اللہ پاک کی رضامندی راضی رہنا چاہئے۔ اللہ پاک اپنے بندے کے لئے جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے۔ انسان کو اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنا چاہئے۔ ایک بات آپ کو بتا دوں اتنا لمبا عرصہ غیر حاضری کے باوجود ڈرڈائجسٹ باقاعدگی سے پڑھتا رہا ہوں ہمارا پیارا ڈرائیو سے اچھا جا رہا ہے۔ فروری کا ڈر 26 تاریخ کو خرید اتمام کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں مگر میناش، دعا کی طاقت اور واصل جہنم بہت اچھی لگیں۔ اس کے علاوہ رولو کا بہت اچھی جارہی ہے۔

☆ نوید صاحب: ڈرڈائجسٹ میں ایک مرتبہ پھر خوش آمدید، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اور تمام قارئین پر اپنا فضل و

کرم رکھے اور خوشیوں سے نوازے، امید ہے آپ آئندہ ہر ماہ شکر کے موقع دیتے رہیں گے۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم، امید ہے مزاج گرمی بخیر ہوگا۔ ماہ رواں کا ”ڈرڈا بجٹ“ ہمارے سامنے ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ تمام تسلطے خوب رہے۔ اسٹوریز اور غزلوں کا انتخاب اچھا رہا۔ آرٹیکلز لگانے کا شکر ہے۔ آرٹیکلز آپ کے پاس نہیں۔ پبلز دیکھئے گا۔ مزید میٹرز میں۔ راج ڈلاری، حسین تصور غزل، رحمت بے پایاں (مراسلہ) ارسال خدمت ہے۔ پلیر قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ”ڈرڈا بجٹ“ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ریڈرز کو دعا سلام۔ پلیر اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: آپ ہر ماہ قلمی لگاؤ کا ثبوت دیتے ہیں اس کے لئے دیری ویری تحنیکس، امید ہے قلمی لگاؤ ہمیشہ جاری و ساری رہے گا۔ کہانی شامل اشاعت ہے اور نئی کہانی کا انتظار ہے۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ دار سے، رسالہ جلد ہی مل گیا، حسب معمول دوستوں کے خطوط اور رولو کا سے اور دیگر کہانیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ رسالہ ڈرڈا میں..... مجھ سے پرانے پڑھنے لکھنے والوں کو بخوبی یاد ہوگا ڈرڈا میں کتنے ہی ساتھی آئے کتنے ہی چلے گئے..... کتنے ہی آ رہے ہیں..... کتنے ہی جا رہے ہیں..... مگر دو یادواں ہیں..... مجھ سے پرانے پڑھنے والوں نے فرعون مصریات کے موضوع پر کئی بار ڈرڈا میں پڑھا ہے ایک ہی موضوع کو مختلف رنگ میں فرعون..... می..... تلو پلیر کو ڈرڈا میں لکھ رہے ہیں۔ رولو کا واحد کہانی ہے جو پہلی قسط سے جب جڑی بوٹی کی تلاش میں حکیم صاحب کی ملاقات جنگل میں رولو کا سے ہوتی ہے اور حکیم صاحب رولو کا کو ناشہ کراتے ہیں اور دوستی کا آغاز ہوتا ہے۔ 93 قسط ہر قسط دلچسپی سے بھرپور پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس کہانی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، یعنی سورج کو چراغ دکھانے کے برابر۔ اس طرح اس سے پہلے جادو بھی اچھا تاثر چھوڑ گئی۔ والسلام دعا میں سب کو۔

☆☆ شرف الدین صاحب: آپ کا ڈرڈا بجٹ سے یہ قلمی لگاؤ ہے کہ آپ کو رولو کا کی پہلی قسط بھی یاد ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ذوق نظر والے ہی رولو کا کی اہمیت، دلچسپی اور کہانی کے تانے بانے اور اتار چڑھاؤ کو سمجھتے ہیں۔ آپ کے چاہت و خلوص نامہ کا آئندہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔ شکر ہے۔

محمد ہمایوں پڑھنا نامہ سے، السلام علیکم کے بعد تمام قارئین اور لکھنے والوں کو ادارے کے اسٹاف کو میری طرف سے عید میلاد النبی مبارک ہو، اس دفعہ اپنے گاؤں پڑھنے میں بھی بک اسٹال سے اپنا پسندیدہ ماہنامہ دیکھا تو دل خوش ہوا کہ ہمارے گاؤں کے لوگ بھی ڈرڈا میں دلچسپی لیتے گئے۔ سرورق کی چڑیل، اوہ معاف کیجئے گا حین کو کچھ کے دل میں گلدگدی سی ہوئی اور بے اختیار دل نے کہا۔ کاش آپ ہمارے ہوتے کہانیوں میں سب سے پہلے رولو کا پڑھی اور تب چھوڑی کہ جب رولو کا کو جنوں کے گاؤں میں رو شاہک کے والد کی محفل سے اٹھے کہ اب اگلے ماہ پھر ملیں گے مزاحیہ شعر۔ سن کر حساب بیوی کا چکرا گیا ہوں میں۔ چھتیس سال کا ہو کر شرمیا گیا ہوں میں۔

☆☆ ہمایوں صاحب: جو صلہ اور ہمت سے کام لیں۔ شہیانے کے بجائے رگیدنے والے بنیں۔ خیر خلوص دل سے لکھے خط کے لئے شکر ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خوش کن الفاظ سے نوازیں گے۔

قدیر رانا راولپنڈی سے، السلام علیکم، آپ کی خیریت کا طالب ہوں، غزل کی اشاعت پر تہ دل سے مشکور ہوں، اس بار بھی غزلوں کے ہمراہ شرکت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ تعاون کیا جائے گا۔ ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

قدیر صاحب: ڈرڈا بجٹ سے قلمی لگاؤ کے لئے بہت بہت شکر ہے، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

بشیر احمد بھٹی فوجی ہستی بہاولپور سے، السلام علیکم، فروری 2013ء کا ڈرڈا جب لے کے پہنچا اٹھ کر تو دیکھا کہ پچھلے ماہ بھیجا ہوا تبصرہ گول ہے۔ ٹیک کا نمبر 2 ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب نے پونے تین نمبر جوڑ کر کیا ہے۔ میں بغور کھلی آنکھوں سے خطوط کے صفحات میں اپنا نام ڈھونڈتا رہا مگر بے سود، لگتا ہے محکمہ ڈاک کی اعلیٰ کارکردگی کی بحیثیت چڑھ چکا ہے میرا سابقہ خط ملاں کہ یہاں سے ڈاک بذریعہ خیر لال بوگی میں ڈاک جاتی ہے۔ بوگی کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بھی بند ہوتے ہیں۔ پھر خط کیسے ہوا کی نظر ہو کے کہیں جا کر۔ خیر۔ اب محکمہ ڈاک کی کارکردگی بہتر ہو چکی ہے۔ فروری کے شمارے میں ٹائٹل کے بعد جج نمبر 2 پر

بچوں کے رسالے گلشن کا اشتہار موجود ہے۔ مگر یہ رسالہ بہاولپور میں دستیاب نہیں۔ اس کا حصول ممکن بنائیے۔ پہلی کہانی میناں اور آخری کہانی دامن واصل جنم اس ماہ کی زبردست کہانیاں ہیں۔ مصنفین نے خوب محنت کی ہے۔ رولو کا کی قسط نمبر 93 سے ظاہر ہے۔ یہ کہانی پختی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ تابوت کی قسط 9 اور بلیک ٹائیگر کی قسط 8 دلولہ انگیز ہیں۔ اس ماہ کی کہانیوں میں کلون، لمبے بال، دل کے رشتے، شیطانی کھوپڑی، میر و ن، زندگی، سنہری تابوت قسط نمبر 9، قاتل، سیاہ بھوت، خونی پاؤں، دعا کی طاقت، موت کا پیچھا، جادو گر، خلا سے واپسی، ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک رہی۔ قوس قزح کی غزلیں اچھی ہوتی ہیں۔ بچوں کے ادب پر چند بہترین کہانیاں لکھ رکھی ہیں۔ جو میں ماہنامہ گلشن کو ارسال کرنا چاہتا ہوں۔“

☆☆ بشیر صاحب: آپ بعد شوق گلشن کے لئے کہانیاں ارسال کر دیں۔ ڈرڈا بجٹ سے آپ کا لگاؤ قابل دید ہے اور ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی خط بھیج کر شکر کے موقع ضرور دیں گے۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم، آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں گجھلی دفعہ آپ کو خط تحریر نہ کر سکا بہت افسوس ہوا۔ ماہ جنوری کا پڑچہ بہت خوب صورت تھا۔ سرورق اپنی مثال آپ تھا۔ ماہ جنوری میں خطوط اور غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گزشتہ سال میں جو تعاون میرے ساتھ آپ نے کیا بہت بہت شکر ہے۔ امید کرتا ہوں کہ نئے سال 2013ء میں بھی پہلے کی طرح تعاون کریں گے۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر اچھا لگا ہے آپ کی چاہت اور خلوص قابل دید ہے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل و کرم رکھے، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

احسان سحر میاںوالی سے، السلام علیکم، امید کرتا ہوں آپ اور آپ کا اسٹاف خیریت سے ہوگا؟ ڈرڈا میں بے حد شکر گزار ہوں جس نے مجھے سپورٹ کیا اور اپنے چاہنے والوں کا جن کے وقفے وقفے سے ایس ایم ایس اور کال مجھے موصول ہوتا آ رہا ہے۔ اللہ پاک نے چاہا تو یہ سلسلہ چلا رہے گا۔ اور میں ڈرڈا کا پناہ شریک سزا بنائے رکھوں گا۔

☆☆ احسان صاحب: خط لکھنے کے لئے شکر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دل کو دل سے راحت ہوتی ہے۔ امید ہے آپ اپنا تعاون آئندہ بھی ڈرڈا بجٹ سے جاری رکھیں گے اس کے لئے شکر ہے۔

غلام نبی نوری کھڑیاں خاص سے، سب سے پہلے ڈرڈا بجٹ کے تمام پڑھنے لکھنے، دیکھنے اور ڈرڈا کے تمام اسٹاف کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بہت بہت دعا و سلام، فروری 2013ء کا شمارہ زبردست تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے رولو کا پڑھی، اس میں تھوڑی سی تبدیلی کرنے سے مزہ آ گیا۔ سنہری تابوت موسیقی، بلیک ٹائیگر اچھی تھی۔ زندگی پہلے نمبر پر ہی۔ نمبر 2 پر موت کا پیچھا، نمبر 3 پر دل کے رشتے، نمبر 4 پر میناں نہایت ہی زبردست اور سبق آموز تھی۔ لمبے بال، شیطانی کھوپڑی، قاتل، سیاہ بھوت خلا سے واپسی اور جادو گر زبردست تھیں۔ قوس قزح میں اپنی غزل نہ پا کر دکھ ہوا۔ باقی تمام شاعروں نے اچھا لکھا۔ آخر میں تمام رائٹرز اور اسٹاف کو خلوص بھر اسلام۔

☆☆ غلام نبی صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکر ہے، جناب جب کسی کا خط ہم تک نہیں پہنچتا تو پھر شائع کیسے ہوگا۔ ذرا جلدی کا خیال رکھا کریں۔ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ بذریعہ خط۔ خدا حافظ۔

محسن علی جٹ فرید ناؤں ساہیوال سے، امید ہے ڈرڈا پورا اسٹاف اور قارئین بخیریت ہوں گے۔ جناب آپ نے دلا سا دیا کہانی ضرور شائع ہوگی آپ کی بہت مہربانی۔ قوی امید ہے کہ میری کہانی بے وفا لوگ شائع کر دیں گے۔ شدت سے انتظار رہے گا۔ کہانی کے شائع ہوتے ہی نئی کہانی بہت جلد ارسال کر دوں گا۔ فروری 2013ء کے شمارے کی تو تین کہانی بیٹ تھیں۔ رولو کا فرسٹ، سیکنڈ میناس، تیسری دامن واصل جنم تھی، یہ تینوں کہانیاں سبق آموز تھیں، باقی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ میری دعا ہے کہ ڈرڈا بجٹ دن و رات چوگتی ترقی کرے۔

☆☆ محسن صاحب: آپ گھبراہٹ میں نہیں اپنے وقت پر آپ کی کہانی ضرور شائع ہوگی۔ کہانی زیادہ اصلاح طلب ہے اور جو کہانی زیادہ اصلاح طلب ہوتی ہے وہ اتنا کا شکار ہو جاتی ہے۔ نیز آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

☆☆

پاگل بیتی

عمران قریشی - کوئٹہ

صبح ہی صبح ایک نوجوان نے بانسری میں ایک عجیب دھن چھیڑی اس دھن کو سن کر قصبے کے سارے چوہے اپنے اپنے بلوں سے نکل کر نوجوان کے گرد جمع ہو گئے تو نوجوان ایک سمت کو چل پڑا، چوہے نوجوان کے پیچھے پیچھے تھے اور پھر.....

دل و دماغ پر خوف و ہراس کی چادر ڈالتی ایک ناقابل فراموش جگر کو پاش پاش کرتی کہانی

سے نہایت معصوم اور نفیس انسان دکھائی دیتا تھا۔ سر سے گنجنا اور فریبی مالک جسم کا مالک تھا۔ آنکھوں پر نفیس شیشوں والی عینک کی بدولت دکان کے مالک کے بجائے کسی یونیورسٹی کا پروفیسر دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اس کی پاگل خانے میں موجودگی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لیکن اس کی زبانی مجھے جس حیرت انگیز کہانی کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ نہایت اچھوتی اور رو گئے کھڑے کر دیئے والی تھیں۔ اس آپ بیتی کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہوئے مجھے دو مہینے سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا۔ تو اب آپ بیتی کی جانب آئیے۔ جسے میں نے کہانی کی صورت دے دی ہے۔

اس کی حیرت انگیز آپ بیتی کی ابتداء اس وقت ہوئی جب اس نے شیل ٹاؤن میں چلتی ہوئی دکان نہایت سستے داموں خریدی۔ کرسس کی آمد آمد تھی۔ لوگ کھلونوں اور پھولوں کی دکان پر ٹوٹ پڑ رہے تھے۔ ڈوٹی نے دکان خریدنے کے فوراً بعد کرسس ٹری آرڈر پر ہوا کر دکان کے فرنٹ پر بنے ہوئے برآمدے میں رکھوا دیئے۔ شیل ٹاؤن کے مختصر افراد کا کرسس ٹری پر ہجوم لگ گیا۔ وہ ٹری کی خریداری کے ساتھ کھلونوں اور پھولوں کی خریداری بھی کر رہے تھے۔ لیکن شام پانچ

میری کتاب پاگل خانہ کامیابی کے ریکارڈ توڑ رہی تھی۔ فلم کے ڈائریکٹر پروڈیوسر میری منت ساجت کر رہے تھے کہ وہ اس کتاب پر فلم بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے تحریر کے حقوق فروخت کرنے کے لئے بات چیت پر آمادہ ہیں۔ لیکن مجھے فلم لائن سے کسی بھی قسم کی دلچسپی نہیں رہی۔ اس لئے میں نے صاف انکار کر دیا۔ اب میرے ایڈیٹر کا بھی یہی تقاضا تھا کہ پاگلوں پر مزید کوئی تحریر ارسال کروں۔ تاکہ اس پر کام کیا جاسکے۔ ان دنوں میری کتاب ”پاگل خانہ“ کے اعزاز میں پاگل خانے والوں کی جانب سے خصوصی تقریب کا انعقاد ہوا۔ اور مہمان خصوصی میں تھا۔

یہاں یہ بھی بتانا چلوں کہ میں ان چند ہی دنوں میں اچھا خاصا کھانا پیتا شہری بن چکا تھا۔ سفری سٹیز میں والی نوکری کو خیر باد کہنے کے بعد میں نے اپنی تمام تر توجہ کا مرکز کہانیوں کی اشاعت کو ہی بنالیا تھا۔ بہر حال تقریب کے دوران میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی۔ جو کھلونوں کی دکان کا مالک تھا۔ اس کی دکان شہر سے کچھ دور واقع ایک غیر معروف ٹاؤن میں تھی۔ ٹاؤن کا نام شیل ٹاؤن تھا۔ اور آبادی تقریباً تین ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اس آدمی کا نام ڈوٹی تھا۔ شکل و صورت

بجے کے فوراً بعد شیل ٹاؤن کے بازار کی دکانیں بند ہونے لگیں۔ لوگ خوفزدہ چہرہ لئے گھروں کی جانب جانے لگے۔ اور بازار میں لیکھت ویرانی پھیلنے لگی۔

ڈوٹی نے حیرت بھری نگاہوں سے بازار کی جانب دیکھا۔ جہاں ویرانگی کا یہ عالم تھا کہ انسان تو انسان جانور بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس نے کانٹھے اچکائے اور دکان میں داخل ہو کر کیش چیک کرنے لگا۔ اس کی پہلے دن کی سیل حیرت انگیز طور پر قابل رشک تھی۔ نہ جانے دکان کا پہلا مالک اسے سستے داموں کیوں فروخت کر گیا تھا۔ یہ تو ایک منافع بخش کاروبار تھا۔ رقم کو مختصر کیش باکس میں رکھنے کے بعد اس نے باکس کو تالا لگایا اور پوری دکان میں طائرانہ نگاہ ڈالی۔ شیفٹ میں رنگ برنگے کھلونے سجے ہوئے تھے۔ درمیان کے حصے میں بڑے بڑے جانوروں کے بھس بھسے لاشے رکھے تھے۔ پرندوں کے لاشے بھی وہاں الیتادہ کئے گئے تھے۔ ان سب کے علاوہ درمیان کی جگہ میں ایک بوڑھے آدمی اور بوڑھی عورت کے کپڑوں سے بنے ہوئے بت بھی کھڑے کئے گئے تھے۔ یہ سناٹا کلاز کے جسمے تھے۔ سرخ و سفید رنگ میں لمبوس خوب صورت بوڑھا جوڑا..... بوڑھے فرشتے کی کمر پر سرخ تھیلا لدا ہوا تھا۔ جس میں کھلونے بھرے ہوئے تھے۔ عورت کے کپڑے وجود میں لکڑی کی لاشی نمایاں تھی۔ جس پر عقاب کی تصویر کھدی ہوئی تھی۔

ڈوٹی کی محدود معلومات کے مطابق سناٹا کلاز جو کہ ایک فرشتے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ عورت کا بت اس نے بھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن یہاں تھا۔ کرسس کی آمد آمد پراتی جلدی بازار بند ہوجانے کی وجہ بھی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ بہر کیف اس نے ابھی ہوئی نگاہوں سے دکان کا جائزہ لیا۔ پھر لائٹ بند کرنے کے لئے بٹن کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دکان کا شیشے کا دروازہ کھلا اور پولیس کا ایک سپاہی اندر داخل ہوا۔ ڈوٹی نے تیزی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ تب وہ بولا۔ ”میرے خیال میں تم شیل ٹاؤن میں نو وارد

ہو۔“ تھی پانچ بجنے کے بعد بھی دکان کھولے بیٹھے ہو۔ لیکن تمہارا یہاں مزید بیٹھنا فضول ہے۔ اب یہاں کوئی بھی کسٹمر نہیں آنے والا۔“

”کیوں؟“ ڈوٹی نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کچھ عرصہ سے شیل ٹاؤن پر اسرار واقعات کی زد میں ہے۔ کبھی بند بازار میں سے درد بھری چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور کبھی جلی ہوئی سرخ شدہ لاشیں دریافت ہوتی ہیں۔ کچھ دن پہلے چار سے زیادہ لکڑی کے گھر آگ لگنے کی بدولت جل کر جھسم ہو گئے۔ فائر بریگیڈ والوں نے آگ بجھانے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن حیرت انگیز طور پر آگ بجھنے کے بجائے مزید بڑھتی چلی گئی۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن گھر کے رہائشی مالی طور پر تقریباً دیوالیہ ہو گئے۔ اب مزید دونوں سے ٹاؤن کے بازار میں ریچھ نما مخلوق کو گھومتے پھرتے دیکھا گیا ہے۔ اس مخلوق نے کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچایا۔ لیکن خوف و ہراس پھیلانے کا باعث ضرور بنی ہے۔

ایک مزید حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس مخلوق کی توجہ کا مرکز تمہاری حال ہی میں خریدی ہوئی دکان رہی ہے۔ اس لئے دکان کو بند کر دو۔ اور فوراً سے پشتر گھر کی جانب روانہ ہو جاؤ۔“ پولیس والے نے غلات میں تفصیلات بتائیں اور جواب سنے بغیر دکان کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ڈوٹی اس کے لب و لہجے میں جیسے ہوئے خوف و ہراس کو محسوس کر چکا تھا۔ معاملے کی گھنٹی کا اندازہ اسے پولیس والے کے خوفزدہ ہونے سے بخوبی ہو گیا۔ اس نے لائٹ آف کی اور دکان کا شٹر نیچے کرنے کے بعد تیز تیز قدموں کے ساتھ بازار سے ماسخہ رہائشی علاقے کی جانب چل دیا۔ جہاں اس کا دو کسروں پر مشتمل کرائے کا مکان موجود تھا۔

شیل ٹاؤن کا پر اسرار قصبہ سنسان و ویران دکھائی دے رہا تھا۔ سورج مغرب کی جانب جھٹکا چلا جا رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر درختوں پر پرندے بھی

نہایت خاموشی اور اداسی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ ڈوٹی خوفزدہ قدموں کے ساتھ تقریباً بھاگنے لگا۔ اس نے دل میں پکارتیں کر لیا تھا کہ آئندہ پانچ بجے سے پہلے ہی دکان بند کر کے گھر چلا آئے گا۔ ٹاؤن کی ویرانی اور اداسی اسے پریشان کئے دے رہی تھی۔

”خوف و ہراس“

ڈوٹی کا گھر دو کسروں پر مشتمل ٹاؤن کے تقریباً درمیان میں بنے جدید اور خوب صورت گھروں پر مشتمل آبادی کے اندر واقع تھا۔ گھر کے سامنے مختصر لان بنا تھا۔ جسے باڑھ کے ذریعے بند کر دیا گیا تھا۔ باڑھ کے آگے برآمدہ اور برآمدے کے آگے دو کمرے..... اس وقت تمام گھر اور ان کے سامنے لان سنسان دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی خوب صورت پینٹنگ کو سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ ڈوٹی نے غلات میں دروازہ کھولا اور گھر میں داخل ہونے کے بعد دروازے کو جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا۔ پھر طویل سانس لیتے ہوئے اس نے لائٹ آن کی۔ آتش دان کو سلگایا اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کافی کا پیالہ تھاے ریڈیو کے پاس آ بیٹھا اور خبریں سننے لگا۔

رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ کافی پینے کے بعد اس نے ریڈیو کی آواز اونچی کی اور کچن میں صس کر چکن برگر تیار کرنے لگا۔ تب اچانک ہی اس کے حساس کانوں نے شیل ٹاؤن کا نام سنا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اناؤنسر کہہ رہی تھی۔ ”شیل ٹاؤن خوف و ہراس کی لپیٹ میں ہے۔ پاگل خانے کو لگنے والی آگ کے مہینہ پورا ہو جانے کے باوجود بھی شیل ٹاؤن کی مختصر آبادی میں ہونے والے حادثات میں کمی واقع نہیں ہو پائی۔ خوف و ہراس کی بدولت ٹاؤن کے افراد سرشام کاروبار زندگی ترک کرنے کے بعد گھروں کا رخ کرتے ہیں اور کسی بھی نئے حادثے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ رکھتے ہیں۔ تاوقت حال حکومت معاملے کی چھان بین کے علاوہ کوئی بھی مثبت قدم نہیں اٹھا پائی۔ قصبے والوں کے بقول ان واقعات کا آغاز پاگل خانے میں لگنے والی

آگ کے بعد ہوا۔ جس میں وقت کے ساتھ کی کے بجائے شدت نمایاں ہونے لگی۔ حکومت سے اپیل ہے کہ ٹاؤن کے دیگر لوگ ہوتے حالات کی جانب مکمل توجہ دی جائے۔“

ڈوٹی نے ریڈیو کو جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا۔ پھر برگر کھائے بغیر میٹنگ روم سے ملحقہ سونے کے کمرے کی جانب چل دیا۔ دروازے کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد اس نے لائٹ بند کئے بغیر لحاف کو سر تک اوڑھا۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ دماغ پر خوف کی لہر مسلط تھی۔ سونا اس کے اختیار سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ خوف کی بدولت اسے اپنے جسم کے روکنے کھڑے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے کے باہر کوئی دے قدموں چل رہا ہو۔ پھر چلتے قدموں کی دھمک اس کے کمرے کے سامنے آ کر رک گئی۔ اس نے دل میں سوچا۔ شاید اب دروازے کے باہر کھڑا ہونے والا عفریت تالے کے سوراخ سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔

اچانک ہی ماحول ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سے گونج اٹھا۔ ڈوٹی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے لحاف کو مزید اوپر کھینچ لیا۔ گھنٹی متواتر بجتی چلی جا رہی تھی۔ ڈوٹی نے سوچا۔ ”خوف دور کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ وہ فون پر بات چیت کر کے منتشر دماغ کو سکجا کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور نہیں ہو سکتا۔“ اس نے لحاف میں سے سر باہر نکال کر کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر بستر سے نیچے اتر کر دروازے کی جانب چل دیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ میٹنگ روم کی لائٹ آن تھی۔ اور وہاں حالات معمول کے مطابق تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی متواتر بج رہی تھی۔ ڈوٹی نے آگے بڑھ کر ریسور اٹھالیا۔ دوسری جانب خاموشی طاری رہی۔

”ہیلو.....“ ڈوٹی کپکپاتے ہوئے لہجے میں

بولاً۔ اب کی دفعہ دوسری جانب ہلکی سرگوشی کی آواز ابھری۔ پھر جھٹکے کے ساتھ فون بند کر دیا گیا۔ ڈوٹی ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ شدت کے ساتھ اس بات کا خواہاں تھا کہ کوئی اس کے ساتھ بات چیت کرے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ اس نے مایوسی بھرے انداز میں ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ ٹیلی فون سیٹ کے ساتھ سی ایل آئی نصب تھی۔ جس پر فون کرنے والے کا نمبر نمایاں ہو جاتا تھا۔ لاشعوری طور پر ڈوٹی کی نگاہیں سی ایل آئی سیٹ کی اسکرین پر پڑیں۔ وہاں موجود نمبر حیرت انگیز طور پر اس کی اپنی دکان کا تھا۔ ڈوٹی نے آنکھوں کو اچھی طرح مسلا۔ پھر دوبارہ نمبروں کا جائزہ لیا۔ وہ حرف بہ حرف اس کی دکان کے نمبر تھے۔ لیکن سوچنے کی بات تھی کہ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔

جہاں تک اسے یاد تھا۔ وہ دکان کو تالا لگا کر آیا تھا۔ اور اس کی اطلاع کے مطابق دکان کی چابی بھی اس کے علاوہ کسی کے پاس موجود نہیں تھی۔ لیکن فون کال کے مطابق دکان تا صرف کھلی ہوئی تھی بلکہ دکان میں کچھ افراد بھی موجود تھے۔

ڈوٹی کے چہرے پر فکر انگیز لکیر یوں کا جال بکھر نہ لگا۔ دکان میں رقم کے علاوہ قیمتی سامان بھی موجود تھا۔ اگر مکان میں ڈاکا پڑ جاتا۔ تب وہ دیوالیہ ہو کر رہ جاتا۔ خوف و ہراس کی وہ لہر جو کچھ دیر پہلے اس کے دل و دماغ کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی۔ یکدم غائب ہوئی چلی گئی اور اس جگہ پریشانی اور لا چاری نے لے لی۔ پریشانی دکان میں کسی کی موجودگی سے تعلق رکھتی تھی اور لا چاری اس بات کی تھی کہ چندوش حالات کی بدولت وہ گھر سے باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ ڈوٹی نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھاما اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

اچانک مکان کے دروازے کی کھنٹی بجنے لگی۔ ڈوٹی نے چونک کر دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی جانب دیکھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے باہر بھلا کون ہو سکتا تھا؟ رات کے اس پہر ٹاؤن والوں میں سے کوئی بھی باہر نکلنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ شاید کوئی بھولا

بھٹکا ہوگا۔ لیکن شام کو پولیس والے کے تیور کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسا سوچنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے چلاتے ہوئے پوچھا۔

”باہر کون ہے؟“

”دروازہ کھولنے میں چوکیدار ہوں۔“ کرخت آواز میں جواب موصول ہوا۔ ڈوٹی نے اطمینان بھرا طویل سانس لیا اور صوفے سے اٹھ کر دروازے کی جانب چل دیا۔ دروازہ کھولنے پر اس نے جس عجیب و غریب اور مضحکہ خیز شخص کو سامنے کھڑے پایا۔ وہ کسی بھی لحاظ سے چوکیدار دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بال بکھرے ہوئے..... چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر گول شیشوں والا چشمہ..... ناک بہہ ہوئی کی جانب آ رہی تھی۔ جسے وہ وقتاً فوقتاً زبان کی مدد سے چاٹ رہا تھا۔ وہ شدید سردی کے باوجود صرف پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ مجموعی طور پر چوکیدار کے بجائے کسی سرکس کا جوکر دکھائی دیتا تھا۔ ڈوٹی نے استغماہیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

تب وہ دوبارہ کرخت لہجے میں بولا۔

”جناب..... اس وقت آپ کو پریشان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ابھی کچھ دن قبل میں نے پیچھے نما جانور کو اس رہائشی کالونی کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن اس گلی تک پہنچنے کے بعد وہ یکدم نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ آپ کو بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ محتاط رہیے گا۔ حالات یقیناً بہتر نہیں ہیں۔“ بات ختم کرتے ہی وہ قدموں پر دوسری جانب گھوما اور مکان کے مخالف جانب چل دیا۔ ڈوٹی کو کچھ دیر قبل کمرے میں ابھرتے قدموں کی آہٹ یاد آئی۔ اس نے چلا کر چوکیدار کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ چوکیدار نے سپاٹ نگاہوں کے ساتھ ڈوٹی کی جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں کسی بھی قسم کے تاثرات موجود نہیں تھے۔

ڈوٹی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ابھی کچھ دیر قبل مجھے میری دکان سے فون آیا ہے۔ میں نے فون اٹھایا۔ تب کسی نے بات چیت کئے بغیر فون بند کر دیا۔ تم

یقین جانو..... شام کو دکان بند کرنے سے پہلے وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ بند دکان جس میں کوئی موجود نہیں ہو وہاں سے فون کیا جاسکے۔ میرے اندازے کے مطابق دکان میں چور گھس گئے ہیں۔ غلطی سے انہوں نے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کر دیا۔ یوں مجھے پتا چل گیا۔“ ڈوٹی تفصیل بتانے لگا۔

”اب میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ہمراہ دکان کی جانب چلو۔ جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں تمہاری اس خدمت کا معاوضہ علیحدہ دوں گا۔“ چوکیدار نے کوئی بھی جواب دیے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈوٹی کا مقصد صرف گھر سے دور رہنا تھا۔ اس لئے اس نے جلدی سے گھر میں داخل ہو کر لباس تبدیل کیا اور چوکیدار کے ہمراہ دکان کی جانب چل دیا۔ راستے میں خاموش طاری رہی۔ ٹاؤن کی گلیاں اندھیرے میں ڈوٹی ہوئی تھیں۔ انسانوں کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔ دکان تک پہنچنے میں انہیں تقریباً دس منٹ لگ گئے۔ دکان کا شراٹھا ہوا تھا اور شیشے کا دروازہ چوہٹ کھلا تھا۔ وہاں گہما گہمی کا یہ عالم تھا کہ ایک گاہک اندر جا رہا تھا اور دوسرا باہر آ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کھلونوں سے بھرے ہوئے شاپ تھامے ہوئے تھے۔ ڈوٹی کی آنکھیں حیرت کے مارے تقریباً پھٹنے لگیں۔ اس نے چلاتے ہوئے اپنے پیچھے موجود چوکیدار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”انہیں گرفتار کرلو۔ یہ سب چور ہیں۔ میری دکان کا سامان چرا کر لے جا رہے ہیں۔ اسے اپنے پیچھے جواب سنائی نہیں دیا۔ ڈوٹی نے ہڑ بڑا کر پیچھے دیکھا۔ لیکن وہاں چوکیدار کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔

معاملہ ڈوٹی کے اختیار سے باہر ہو گیا۔ اور وہ چیختے چلاتے دکان کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ تب بے خیالی میں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے سڑک پر جا گرا۔ اس کے سر کا پچھلا حصہ پوری طاقت کے ساتھ سڑک سے ٹکرایا۔ اسے رات کے وقت سورج طلوع ہوتا دکھائی

دیا۔ پھر چاروں جانب اندھیرا پھیلتا چلا گیا۔

سانتا کلاز کا پراسرار مجسمہ

صبح منہ اندھیرے ڈوٹی کی آنکھ کھلی۔ اسے اپنے سر میں شدید دھماکے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ارد گرد اب ویرانی پھیل چکی ہوئی تھی۔ اس نے ہڑ بڑا کر دکان کی جانب دیکھا۔ شہر بند تھا۔ اور دکان کو تالا لگا ہوا تھا۔ ڈوٹی نے سر کو ہلاتے ہوئے سوچا۔ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا۔ لیکن فوراً ہی اسے اپنے خیال کو مسترد کرنا پڑا۔ اس کی سڑک پر موجودگی اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ وہ رات کو یقیناً یہاں تک آیا تھا۔ سر پر موجود گومڑ بھی اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ بدحواسی کے عالم میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ سڑک پر آگرا۔ جس کے بعد اسے ہوش و حواس کی دنیا کو ترک کرنا پڑا۔

بہر حال وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے گہرا پڑتا گھر کی جانب چل دیا۔ دکان سے کچھ ہٹ کر اور رہائشی علاقے کے شروع میں اس نے تین چار پولیس والوں کو قصبے کے کچھ افراد کے ہمراہ کھڑے ہوئے دیکھا۔ ڈوٹی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ معاملے کے متعلق معلوم کرنے کے لئے ان سے بات چیت کرتا۔ اس لئے کئی کترا گھر کی جانب جانے والی گلی میں مڑ گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے گرم پانی میں نمک شامل کیا۔ اور غسل کرنے کے بعد ناشتہ تیار کرنے لگا۔ ریڈیو آن تھا۔ لیکن اس پر خبروں کا سلسلہ شروع ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد ڈوٹی نے کپڑے تبدیل کئے۔ اس کی حالت کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ آرام کرنا ممکن نہیں تھا۔ دکان کو شروع کے مراحل میں بند کر دینا اچھا نہیں تھا۔ اس لئے وہ خبریں سننے کے بعد دکان کی جانب چل دیا۔ موسم ابر آلود تھا۔ اور خیر بستہ ہوائیں شیل ٹاؤن کو گھیرے میں لئے ہوئے تھیں۔ ڈوٹی نے دکان میں داخل ہوتے ہی گیس کا ہیڑ آں کیا۔ اور کیش باکس کو چیک کرنے لگا۔ وہاں پچھلے دن والی رقم کے علاوہ مزید رقم

بھی موجود تھی۔ یعنی رات کے وقت مزید خریداری ہوئی تھی۔ اور یہ خریداری اس کی عدم موجودگی کے دوران پراسرار گاہکوں کے ذریعے ہوئی تھی۔

اس نے پریشان نگاہوں سے دکان میں طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ دکان میں بہت سے کھلونے کم تھے۔ یقیناً وہی خریدے گئے تھے۔ تمام کھلونوں پر پراسرار پرنٹ تھے۔ اس نے حساب لگایا۔ گزشتہ رات کی سیل کھلونوں کی فروخت کے مطابق تھی۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور سوچنے لگا۔ مقتل دکان کو پراسرار طریقے سے کھولنے والے وہ پراسرار لوگ کون ہو سکتے تھے؟ جو اس کی دکان کو نقصان پہنچانے بغیر کھلونوں کی خریداری کے بعد دکان مقتل کر کے وہاں سے خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

اچانک ڈونی کی نگاہ سامنے موجود سانٹا کلاز کے مجسمے پر پڑی۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ لیکن سانٹا کلاز اور اس کے ساتھ کھڑی بوڑھی عورت کے مجسمے کے پاؤں میں پہنے ہوئے جوتوں پر خشک مٹی لگی ہوئی تھی۔

ڈونی کو اچھی طرح یاد تھا کہ پچھلی رات ایسا نہیں تھا۔ ان دونوں مجسموں کے پاؤں میں موجود جوتے صاف سترے تھے۔ یقیناً رات کو خریداری کرنے والے گاہک کپڑوں سے بے مجسموں کو اپنے ہمراہ لے کر باہر گئے ہوں گے۔ جوتوں پر لگی ہوئی مٹی کی گرد اچھی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ گاہکوں کے آنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ ڈونی نے دونوں مجسموں کے پاؤں سے جوتوں کو اتارا اور انہیں اچھی طرح جھاڑنے کے بعد دوبارہ پہنانے لگا۔

ابھی وہ جوتے مکمل طور پر پہنانے نہیں پایا تھا کہ دکان کا دروازہ کھلا اور پولیس کے دو سپاہی اندر داخل ہوئے۔ ڈونی مجسموں کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پولیس والوں نے ڈونی کے سر پر پکے کا جائزہ لیا۔ پھر ایک سپاہی بولا۔

”گزشتہ رات تمہاری دکان کے قریب شیل ٹاؤن کے ایک رہائشی کا قتل ہوا ہے۔ اسے اس کی لاش

اس کے گھر کے قریب سڑک پر پڑی ہوئی ملی ہے۔ گھر والوں کا کہنا ہے کہ رات کے تین بجے دروازہ کھٹکا۔ دروازہ کھولنے پر انہوں نے جس شخص کو سامنے کھڑے ہوئے پایا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ رہائشی علاقے کے مکانوں کی چوکیداری کرتا ہے۔ اور کچھ بات چیت کے لئے گھر کے سربراہ کو باہر لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر وہ سانٹا کلاز کے لباس میں لباس تھا۔ اس لئے گھر کا سربراہ اس کے ہمراہ باہر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ واپس نہیں آ سکا۔

صبح میں نے اپنے اسٹنٹ کے ہمراہ جب ٹاؤن کا راولڈ لگایا۔ تب اس آدمی کی لاش کو سڑک کے کنارے پڑے ہوئے پایا۔ اس کے سر کو ڈنڈا مار کر بھاڑ دیا گیا تھا۔ میں گاڑی لانے کے لئے واپس پولیس اسٹیشن کی جانب بھاگا۔ تب تمہیں میں نے دکان کی میز جیوں کے پاس بے ہوش پڑے ہوئے پایا۔ گاڑی لانا ضروری تھا۔ اس لئے میں تمہیں نظر انداز کر کے پولیس اسٹیشن چلا گیا۔ گاڑی کے ہمراہ جب واپس آیا۔ تب میں نے تمہیں غائب پایا۔ بہر حال دکان کھلنے پر ہم نے دوبارہ تفتیش کا آغاز کرنے کی ٹھانی اور پولیس اسٹیشن چلے آئے۔ اب تم ہمیں بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔“

بات کرنے کے دوران اس کی نگاہ دکان کا جائزہ لینے میں مصروف تھی بلکہ اطراف کا جائزہ لینے کے بعد سانٹا کلاز میں اور اس کے ساتھ کھڑی بوڑھی عورت کے مجسمے پر جم گئی تھی۔ ڈونی اس کی نگاہوں میں پوشیدہ خیالات کو کسی حد تک جان گیا تھا۔ کچھ بھی چھپانا اس کے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے حرف بہ حرف گزشتہ رات بیتنے والے تمام واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے۔

دونوں پولیس والے نہایت محویت کے عالم میں اس کی بیان کردہ تفصیلات کو سنستے رہے۔ پھر پہلا پولیس والا بولا۔

”میرا نام سارجنٹ انتھونی ہے۔ میں تمہاری بیان کردہ کہانی کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن کیا تم

مجھے بتانا پسند کرو گے کہ سانٹا کلاز کا یہ مجسمہ تمہارا خود تیار کردہ ہے۔ یا پھر پہلے سے یہاں نصب تھا۔ سانٹا کلاز کا یہ مجسمہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یاد رہے گزشتہ رات والے قتل کے دوران قاتل نے سانٹا کلاز کا روپ دھارن کیا تھا۔“

ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”جب میں نے دکان خریدی۔ تب یہ تمام مجسمے پہلے ہی سے یہاں نصب تھے۔ مجھے کسی قسم کا سامان خریدنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ سوائے کسٹمرز کے۔۔۔۔۔ جن کی خریداری دونوں پہلے کی تھی۔“

سارجنٹ انتھونی نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔ پھر پوچھا۔ ”تمہاری بیان کردہ کہانی پراسرار اور ناقابل یقین ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس میں رتی برابر بھی جھوٹ نہیں۔ اپنی تیس سالہ ملازمت کے دوران اب میں سامنے کھڑے شخص کی صورت دیکھ کر اس کے دل کا حال معلوم کرنے کی صلاحیت بخوبی رکھتا ہوں۔ تمہاری بیان کردہ کہانی یقیناً سچ ہے۔ یا پھر دماغ میں موجود خوف کی لہر کی بدولت تمہیں حقیقت کی صورت میں دکھائی دی ہے۔ جو بھی ہے تمہاری دکان کی نگرانی ضروری ہے۔ اس لئے میں دو بندوں کو مکان کے باہر تعینات کر دیتا ہوں۔ یقیناً تمہیں اعتراض نہیں ہوگا۔“

ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں پولیس والوں نے سانٹا کلاز کے مجسمے کا تفصیلی جائزہ لیا اور دکان کی مختصر تلاشی لینے کے بعد باہر نکل گئے۔

”پراسرار انسانوں کی آمد“

اس دن کی مصروفیات کچھ خاص نہیں رہیں گاہکوں کی تعداد کم تھی۔ بچے کھلونوں کی خریداری کے لئے آتے جاتے رہے۔ ڈونی کا دماغ بھی موجودہ صورت حال کی بدولت الجھا رہا۔ کام میں توجہ نہ ہونے کے برابر ہی۔ لیکن تمام دن کی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہوا کہ اسے کچھ دن دکان کے اندر ہی سونا چاہئے۔ دکان کی چھت پر کمرہ موجود تھا۔ لیکن یہاں ہاتھ روم یا جکن کی سہولت موجود نہیں تھی۔ یہ

کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے گھر جا کر ضروریات زندگی سے فارغ ہونے کے بعد کھانے پینے کے سامان کے ہمراہ واپس دکان میں آ سکتا تھا۔ اسے بمشکل آدھے گھنٹے سے زیادہ کا عرصہ نہیں لگتا۔

سرشام اس نے دکان بند کی اور تیز قدموں کے ساتھ گھر کی جانب چل دیا۔ اس کی دکان پر متعین دونوں پولیس والے پانچ بجے کے بعد اچانک ہی غائب ہو گئے تھے۔ ڈونی نے گھر میں داخل ہو کر کافی اور سینڈویچ تیار کئے۔ پھر ہاتھ روم وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد تیز قدموں کے ساتھ دوبارہ دکان کی جانب چل دیا۔ ٹاؤن سنسان ہو چکا تھا۔ ڈونی آتے ہوئے اپنے ہمراہ ریڈیو بھی لیتا آیا تھا۔ اس نے دکان کے شیشے کے دروازے کو اندر سے لاک کیا۔ پھر ریڈیو آن کر کے خبروں کا پچھل لگا دیا اور خود کھانا کھانے لگا۔ مختصر خبروں کے بعد ٹاؤن سرنے شیل ٹاؤن کی موجودہ صورت حال پر تبصرہ کرنے کے بعد پولیس والوں کا بیان پیش کیا۔ جس کے مطابق ”آج کی تمام رات پولیس سیکورٹی مضبوط رکھنے کا اعلان کیا گیا تھا اور ٹاؤن کے افراد سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ کسی بھی صورت میں گھروں سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کریں۔ امیر جنسی کی صورت میں مختلف بتائے جانے والے نمبروں پر ڈائل کرنے کی صورت میں پولیس ان کے بتائے ہوئے ایڈریس پر جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کرے گی۔“

خبریں ختم ہونے کے بعد ڈونی نے ریڈیو کو بند کر دیا اور خود اپنا بستر اٹھائے دکان کی اوپری منزل پر بنے ہوئے کمرے کی جانب چل دیا۔ اس نے بستر بچھایا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔

شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ نیند اس کی نگاہوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے رہ کر پولیس کی ناقص کارکردگی پر غصہ آ رہا تھا۔ ٹاؤن کا بازار اور رہائشی علاقہ سنسان پڑا تھا۔ پولیس کے گشت کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔ ریڈیو پر بڑی بڑی باتیں کی جارہی تھیں۔ ورنہ عملی اقدام نہ ہونے کے برابر تھا۔ ڈونی نے

گزشتہ رات کی طرح لائٹ بند نہیں کی تھی۔ لحاف منہ تک اوڑھ کر وہ خاموشی کے ساتھ لیٹ کر واقعات کے متعلق سوچتا رہا اور رات کے دو بج گئے۔ لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ دکان کے اوپر سے اس مختصر کمرے کی اکلوتی کھڑکی بازار کی جانب کھلی تھی۔ جب ڈوئی لیٹے لیٹے اکتا گیا۔ تب اٹھ کر کھڑکی کی جانب چل دیا۔ اس نے کھڑکی کھولی۔ اور اسٹریٹ کی روشنی میں بازار کی دکانوں پر تفصیلی نگاہ دوڑائی۔ شہر بند تھے اور دور دور تک بازار سنسان دکھائی دے رہا تھا۔ ڈوئی نے سوچا کہ وہ سڑک سے اوپر دکان کی دوسری منزل پر کتنا محفوظ ہے۔ کھڑکی کھول کر باہر جھانک سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ سڑک کے درمیان میں کھڑا ہو جائے۔ تب اس کے وجود کے ساتھ بازار میں گھومنے پھرنے والا قاتل کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس کی سوچ دھری کی دھری رہ گئی۔ جب اس نے چار آدمیوں کو سامنے کی گلی سے نکل کر اپنی دکان کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہرے کھر کی بدولت غیر واضح دکھائی دیتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے سڑک پار کرنے لگے۔ انداز ایسا تھا۔ جیسے اسکول کی چھٹی کے بعد بچے سڑک پار کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

بہر حال سڑک عبور کرنے کے بعد انہوں نے ڈوئی کی دکان کا رخ کیا۔ ڈوئی کو دکان کا نچلا حصہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے جسم کو کھڑکی کے راستے آدھے سے زیادہ باہر نکالا اور نیچے جھانکا۔ دکان کا مزید کچھ حصہ دکھائی دینے لگا۔ وہاں لوگوں کا جھوم موجود تھا۔ وہ دکان میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ڈوئی کو اپنے جسم کے روٹنے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سخت سردی کے باوجود بھی اس کا جسم پسینے سے جھینکنے لگا اور اس نے جھکے کے ساتھ کھڑکی کو بند کر دیا۔ پھر ہانپتا ہوا اپنے بستر پر آ بیٹھا۔ وہ سوچنے لگا۔ ان پر اسرار لوگوں کا اس کی دکان کے ساتھ نہ جانے کیا تعلق ہے۔ وہ روزانہ رات کو وہاں آ کر خریداری

کرتے ہیں اور رقم کو کیش باکس میں رکھ جاتے ہیں۔ اگر وہ چاہتے تب رقم کیش باکس میں رکھے بغیر کھلونے خاموشی کے ساتھ ہمراہ لے جاسکتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی ایمانداری کی انتہا تھی کہ وہ کھلونوں پر موجود رقم پڑھنے کے بعد اتنی ہی رقم کیش باکس میں رکھ کر کھلونے ہمراہ لے جاتے تھے۔ یعنی ان کی نیت بری نہیں تھی۔ ڈوئی کو اپنے جسم میں موجود خوف کی لہر کم ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ معاملے کے متعلق معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ نیچے دکان میں جا کر..... یقیناً وہ اسے نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔ لیکن اگر وہ سیڑھیوں کے پاس کھڑا ہو کر اپنی موجودگی کو پوشیدہ رکھتے ہوئے ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا۔ تب یقیناً ان کے ارادے کے متعلق آگاہی حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے لحاف ایک جانب رکھا اور دیوار کے ساتھ رکھی پردہ لٹکانے والی فالتو پڑی لوہے کی راڈ کو اٹھایا۔ اور دروازہ کھول کر دے قدموں نیچے دکان کی جانب سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا۔

اسے مختلف لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت اہم موضوع زیر بحث بنا ہو۔ آخری سیڑھی کے پاس پہنچ کر اس نے احتیاط کے ساتھ سر آگے بڑھاتے ہوئے دکان کے اندر جھانکا۔ وہاں پردہ کے قریب لوگ موجود تھے۔ ان میں زیادہ تر کے چہرے مسخ تھے اور جسم پر آگ سے جھلنے کے نشانات موجود تھے۔ ان میں زیادہ تر زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے جبکہ ایک نوجوان جوڑا ان سے کچھ ہٹ کر کاؤنٹر پر ایسے براجمان تھا کہ لڑکی کا سر لڑکے کے کاندھے پر ٹکا ہوا تھا۔ لڑکی زار و قطار رو رہی تھی۔ اور نوجوان اسے چپ کروانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔

ڈوئی نے زمین پر بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیا۔ ان میں مرد عورتیں بچے بوڑھے سب شامل تھے۔ اچانک نوجوان لڑکے نے لڑکی کے جسم کو ایک جانب ہٹاتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب دیکھا اور اونچی آواز میں بولا۔

”ڈوئی تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیڑھیوں سے اتر کر سامنے آ جاؤ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔“

سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہوئے ڈوئی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے اوپری کمرے کی جانب بھاگنے کے متعلق سوچا۔ لیکن فوراً ہی خیال کو مسترد کر دیا۔ کمرے میں گھس کر بھلاہو کیونکر ان سے چھپ سکتا تھا۔ وہ آسانی دروازے کو توڑ کر اسے گرفتار کر سکتے تھے۔ بہتر یہی اسی میں تھی کہ وہ جیسا کہہ رہے تھے۔ خاموشی کے ساتھ ویسا ہی کرتا جائے۔

ڈوئی نے حلق میں آتے ہوئے تھوک کو نگلا اور کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر دکان کے درمیان میں آ کھڑا ہوا۔ نوجوان لڑکا کاؤنٹر سے نیچے اتر آیا۔ زمین پر بیٹھے ہوئے افراد نے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ بے جان تراشے ہوئے بتوں کے جیسے ہوں۔ جن میں سے جان نکال لی گئی ہو۔ لڑکی اپنے چہرے پر موجود آنسوؤں کے ریلے کو صاف کرنے میں مصروف تھی۔ ڈوئی کمرے کے درمیان میں آ کھڑا ہوا۔ نوجوان نے تشکر بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ڈوئی تمہاری دکان استعمال کرنے کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ لیکن مخدوش حالات کی بدولت مجبوراً ہمیں ایسا کرنا پڑا۔ میرا نام بل شیٹ ہے اور یہ میری بیوی این ہے۔ اگر اعتراض نہ ہو تو ہمارے ہمراہ بیٹھ کر ہمارے موجودہ مسئلے کا حل تلاش کرنے میں ہماری مدد کر سکتے ہو۔ ہم تمہارے شکر گزار ہوں گے۔“

ڈوئی نے اثبات میں سر ہلایا اور قریب ہی موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔ لڑکا جس کا نام بل تھا۔ وہ دوبارہ کاؤنٹر پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے جلتے ہوئے چہرے پر کھٹکی کے تاثرات نہیں تھے بلکہ مصومیت کا رجحان تھا۔ ڈوئی کو اپنے دل میں اٹھتا ہوا خوف کم ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے انٹیمین کا طویل سانس لیا۔ پھر بل سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے یہ جان کر الجھن محسوس ہو رہی ہے کہ دکان کے باہر لگے تالے کو تم نے کیسے کھولا بلکہ آج تو دکان اندر سے لاک تھی۔ پھر بھی تمہاری موجودگی اس بات کا اظہار کر رہی ہے کہ تم نے دروازے کو پر اسرار طریقے سے کھولا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے تمہاری یہاں موجودگی کی وجہ بھی سمجھ نہیں آ رہی۔“

بل نے کچھ دیر خاموش ہو کر سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔ ”تالا کھولنا کسی انسان کے لئے مشکل ہوگا۔ لیکن رو میں اس سے بالاتر ہیں۔“

ڈوئی کو اپنے جسم کے روٹنے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے پھریری لی۔ پھر کرسی پر پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ بل بولے چلا جا رہا تھا۔ ”ہمیں اس دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً ایک مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ لیکن ہم آج بھی در بدر ہیں۔ ہمیں کھون ہے۔ اپنے بچے کی..... شاید تم ہماری مدد کر سکو۔ ہمیں تم سے کوئی غمی غرض نہیں ہے۔ اس لئے کہ تم شیل ٹاؤن کے رہا نہیں ہو۔ اگر ہو تو تب یقیناً جانو کہ ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑتے۔“

ڈوئی نے بے چین لہجے میں بات درمیان میں کاٹ دی۔ اور پھر پوچھا۔ ”تم مجھے مسئلہ بتاؤ۔ ہو سکتا ہے۔ میں اسے سمجھانے کا باعث بن سکوں۔ اگر ایسا نہ بھی ہو سکا۔ تب بھی کوشش ضرور کروں گا۔“

بل کاؤنٹر سے نیچے اتر آیا۔ اس نے کاؤنٹر کے دوسری جانب موجود کرسی کو کھینچا اور ڈوئی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی این خاموشی کے ساتھ کاؤنٹر پر بیٹھی تھی۔

بل نے ڈوئی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہتر یہی اسی میں ہے کہ میں تمہیں اپنی آپ بیتی تفصیل کے ساتھ سنا دوں، مسئلے کے متعلق جانکاری کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔“ ڈوئی نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بل مکمل ہوا۔

”پاگل بیتی“

”یہ آج سے تقریباً سو مہینے پہلے کی بات ہے۔“

یاشاید اس سے کچھ کم..... مجھے صحیح طرح یاد نہیں ہے۔ لیکن ہم شیل ٹاؤن کے پاگل خانے میں زیر علاج تھے۔ پاگل خانے کے سربراہ کا نام ہنری لسن تھا۔ وہ نرم خو اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ شیل ٹاؤن پاگل خانے کے تمام پاگل اسے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ تھا بھی اسی قابل..... میں نے اسے کبھی بھی کرخت لہجے میں بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ آپ بیتی کی شروعات تب ہوئی۔ جب میری شادی این کے ساتھ ہونے لے پائی۔ میں اور این ایک دوسرے سے بے تحاشا محبت کرتے تھے۔ ہمارا علاج بھی تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ پاگل خانے سے فارغ ہونے میں صرف دو مہینے باقی رہ گئے تھے۔ سر ہنری لسن میرا امتحان لینے کے لئے مجھے ٹاؤن کے بازار میں بھیجا کرتے تھے۔ تاکہ میں سودا سلف کی خریداری کر کے انہیں اس بات کا یقین دلا سکوں کہ میرا علاج بخیر و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ میں اس امتحان میں پورا اترنے کے لئے نہایت زور و شور سے کوششوں میں مصروف تھا۔ لیکن پھر نہ جانے کیسے تمام حالات مختلف رخ دھارنے لگے۔ ہوا کچھ یوں..... کہ شادی سے پہلے جب میں سودا سلف کی خریداری کے لئے پاگل خانے سے باہر ٹاؤن کے مختصر بازار کا رخ کرتا تھا۔ تب این ہمیشہ میرے انتظار میں بیٹھی ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے درخواست کرتی تھی کہ بازار سے واپسی کے دوران میں اس کے لئے چاکلیٹ۔ چپس اور گلاب کے پھول لے کر آؤں۔ اسے پھول پسند تھے۔ میں ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ میں سودا سلف بعد میں خریدتا تھا۔ لیکن این کی فرمائش کردہ چیزیں پہلے اکٹھی کرتا تھا۔

پاگل خانے کے تمام ڈاکٹر نرسیں اور مزید اسٹاف ہماری محبت کے متعلق بخوبی جان چکے تھے۔ ہماری محبت کو مد نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹروں کی میٹنگ بیٹھی۔ جس میں فیصلہ ہوا کہ ہمارے سرپرست اعلیٰ سے اجازت لے کر شادی کر دی جائے۔ ہو سکتا ہے اس تجربے کے مثبت اثرات نمایاں ہوں۔ یوں ہماری

شادی ہوئی۔ اپنی شادی کا دن میں رفتی دنیا تک بھلا نہیں پاؤں گا۔ شادی کے بعد بھی ہماری محبت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر آنے والے دن کے ساتھ محبت بڑھتی چلی گئی۔ مجھے وہ دن نہیں بھولتا۔ جب پھر ڈے کے کسی تہوار کے دوران پاگل خانے میں پاگلوں کے علاوہ صرف سر ہنری لسن اور نوکر یا نرسیں موجود تھیں۔ تب پاگلوں کے لگا تار اسرار کے بعد سر ہنری ہمیں کہانی سنانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ رات کا وقت تھا اور خوشگوار بہار کے دن تھے۔

سر ہنری نے ہمیں اس رات جو کہانی سنا کی۔ اس کا نام بانسری والا تھا۔ اور کہانی کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

یاد رہے اس کہانی کا اس آپ بیتی کے ساتھ گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ اس لئے سنانا ضروری ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک گاؤں میں چوہوں کی تعداد یقیناً بڑھنے لگی۔ جب یہ تعداد خطرناک حدود سے تجاوز کر جاتی ہے۔ تب وہ ایک ایسے بانسری والے کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ جس کی بانسری کی دھن میں جادو جیسی تاثیر ہوتی ہے۔ بانسری والا گاؤں والوں کو چوہے کی خطرناک بڑھنے والی تعداد سے نجات دلانے کے لئے رقم کا مطالبہ کرتا ہے۔ گاؤں والے اترار میں سر ہلاتے ہوئے اسے یقین دلاتے ہیں کہ کام مکمل ہو جانے کے فوراً بعد وہ معاوضہ اسے دے دیں گے۔ بانسری والا دوسرے دن صبح سویرے بانسری کی دلفریب دھن چھیڑتا ہے۔ تب تمام گاؤں کے چوہے بے خود ہو کر اس کے پیچھے پیچھے گاؤں سے باہر کا رخ کرتے ہیں اور پہاڑوں میں گم ہونے کے بعد واپسی کا راستہ بھلا دیتے ہیں۔

گاؤں والے سکون کا سانس لیتے ہیں۔ لیکن حسب وعدہ بانسری والے کو معاوضہ دینے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ بے چارہ بانسری والا روتا دھوتا گاؤں سے کچھ دور جنگل میں گم ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسرے دن وہ صبح سویرے نمودار ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں بانسری موجود ہوتی ہے۔ وہ بانسری کو اپنے

ہونٹوں کے ساتھ لگاتا ہے اور ایک ایسی دھن کا آغاز کرتا ہے۔ جسے سن کر گاؤں کے تمام بچے اچھلتے کودتے اس کے ہمراہ پہاڑوں کی جانب چل نکلتے ہیں۔ بانسری والا بچوں کو غار میں بند کر دیتا ہے۔ پھر گاؤں والوں سے اپنے معاوضے کا تقاضا کرتا ہے اور معاوضہ ملنے پر وہ بچوں کو رہا کر دیتا ہے۔

یہاں پہنچ کر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ہماری دروہری کہانی کا آغاز اس کہانی کے اختتام کے بعد ہوتا ہے۔ کہانی سننے کے بعد جب میں نے اور این نے کمرے کا رخ کیا۔ تب این سوچوں میں گم تھی۔ وہ مجھ سے بات چیت نہیں کر رہی تھی۔ ایسا ہماری مختصر ازدواجی زندگی کے دوران پہلی دفعہ ہوا تھا۔ میں نے اسے کئی دفعہ اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ تب وہ خاموش ہی رہی۔ تنگ آ کر میں نے اپنا رخ مخالف جانب کیا۔ اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ تب وہ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اٹھ کر آتش دان کے اوپر لگے فریم کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ میں اس کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ فریم میں ایسی تصویر موجود تھی۔ جس میں چار ننھے سنے بچے تو لے میں لپٹے ہاتھ پاؤں ہلانے میں مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ تصویر کچھ عرصہ پیشتر این نے مجھ سے فرمائش کر کے منگوائی تھی۔ اور میں نے اسے آتش دان کے اوپر لگایا تھا۔ وہ کچھ دیر تصویر کو محویت کے عالم میں دیکھتی رہی۔ پھر ایک بچے کے چہرے پر اٹکی رکھ کر آہستگی کے ساتھ ہٹکا م ہوئی۔

”بل ڈیز..... مجھے ایسا بچہ چاہئے۔ کیا تم مجھے لا دو گے۔ دیکھو انکار نہیں کرنا۔ میں بہت بے چین ہوں۔ مجھے بچے اچھے لگتے ہیں۔“

میں مسکراتے ہوئے ہمراہ تصویر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ میری موجودگی سے بے خبر محویت کے عالم میں بولے چلی جا رہی تھی۔

”تم نے ہمیشہ میری خواہشات کا احترام کیا ہے۔ میں نے تم سے جو بھی مانگا۔ تم نے مہیا کرنے کی کوشش کی۔ آج آخری دفعہ مانگ رہی ہوں۔ اس کے

بعد پھر کبھی نہیں مانگوں گی۔ مجھے ایسا بچہ چاہئے۔“ میں نے بغور بچے کی تصویر کی جانب دیکھا۔ وہ ایک دودھ پیٹے صحت مند بچے کی تصویر تھی۔ میں نے نہایت اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر جتنی لہجے میں بولا۔

”کل صبح یہ بچہ تمہارے پاس موجود ہو گا۔“ اس نے بے ساختہ گھومتے ہوئے مجھ سے لپٹ کر اپنا سر میرے سینے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ڈیز! مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی۔“

”بچے کا انخواہ“ دوسرے دن صبح سویرے میں انکل ٹام کے اسٹور کے سامنے کھڑا تھا۔ انکل ٹام کے اسٹور میں دودھ، دہی، انڈے، مکھن، ڈبل روٹی اور غرض ناشتے میں استعمال کی جانے والی تمام اشیاء خورد و نوش دستیاب تھیں۔ اس لئے صبح سویرے ان کے اسٹور پر بے تحاشا رش پایا جاتا تھا۔ میں رش لگنے کے انتظار میں تھا۔ مجھے خریداری کی ضرورت نہیں تھی۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ انکل ٹام کی رہائش اسٹور کے پچھواڑے میں تھی اور راستہ کاؤنٹر کے پیچھے سے ہو کر نکلتا تھا۔ انکل ٹام کا دودھ پیتا بچہ اکثر صبح کے وقت گہری نیند سو یا رہتا تھا۔ اور ان اوقات میں مسز ٹام انکل ٹام کے ساتھ اسٹور میں ہاتھ بٹاتی دکھائی دیتی تھیں۔ یعنی میرے خیال کے مطابق اس وقت جو نیئر ٹام کمرے میں تنہا ہوتا تھا۔ میں رش کے دوران با آسانی بچے کو گھر سے اٹھا سکتا تھا۔ اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے۔ میرے ہاتھوں میں بانس کی بنی ہوئی بڑی باسکٹ موجود تھی۔ سوا سات بجے کے قریب گاہکوں کا رش شروع ہوا۔ اور ساڑھے سات بجے تک رش نے شدت اختیار کر لی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے ٹوکری کو احتیاط کے ساتھ ہاتھوں میں تھاما اور اسٹور کے شیشے کے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ کھلنے پر مترنم گھنٹیوں کی آواز سے ماحول گونج اٹھا۔ مسز ٹام نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ میں

نے گڈ مارنگ کہہ کر انہیں مخاطب کیا۔ انکل ٹام نے مسکراتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ پھر انتظار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے گاہکوں کے ساتھ لین دین کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سز نام بھی جلدی جلدی ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ میں نے چورنگاہوں سے گاہکوں کی جانب دیکھا۔ ان میں سے کوئی بھی میری جانب متوجہ نہیں تھا۔ میں دے قدموں کے ساتھ کاؤنٹر کے آخری سرے کی جانب چل دیا۔ یہاں چپس کے کارشن، بیسز کے ٹین، ڈبل روٹی کے پیگ موجود تھے۔ میں ان کی آڑ لیتا ہوا کاؤنٹر کے چھلی جانب نظر آتے ہوئے رہا کسٹروں کے دروازے میں گھس گیا۔ یقیناً مجھے ایسا کرتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ شور مچا دیتا۔ سامنے مختصر گیلری بنی ہوئی تھی۔ جس میں آنے والے سارے دو کمر کے دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ سیدھے ہاتھ والا دروازہ بیڈروم کا تھا جبکہ اٹلے ہاتھ کی جانب والا دروازہ سیننگ روم کا تھا۔

میں نے بیڈ روم والا دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ بچہ لکڑی کے پالنے میں نہایت گہری نیند سویا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر نہایت احتیاط کے ساتھ بچے کو کیبل کے ہمراہ اٹھایا اور باسکٹ میں ڈال کر ڈھکنا بند کر کے مختصر کنڈی لگادی۔ پھر دے قدموں کے ساتھ راہداری سے ہوتا ہوا اسٹور کے دروازے سے باہر نکل کر کاؤنٹر کے سامنے گاہکوں کے رش میں شامل ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر میں دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا۔ تب انکل ٹام کی نگاہوں کا مرکز بن سکتا تھا۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے والی مترنم گھنٹی میری پوشیدگی کا راز فاش کر دیتی۔ وہاں گاہکوں کے درمیان میں زیادہ دیر کھڑا رہنا بھی میرے لئے خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ ابھی میں سوچ و بچار میں مصروف ہی تھا کہ ماحول دروازہ کھلنے کی مترنم گھنٹیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ ایک گاہک اپنے دو عدد بچوں کے ہمراہ اسٹور میں داخل ہو رہا تھا۔ انکل ٹام نے گاہک کی جانب دیکھا۔ پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر

دوبارہ کام میں مصروف ہو گئے۔

میں نے موقع غنیمت جانا۔ اور تیزی کے ساتھ کھلے دروازے سے باہر نکل آیا۔ مجھے اپنے پیچھے شیشے کے دروازے کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اطمینان کا طویل سانس لیا اور باسکٹ کے ہمراہ پاگل خانے کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ پاگل خانے کے مین دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد میں نے رہائشی کمروں کا رخ کیا۔ پاگل خانے کے بہت سے اسٹاف سے میرا سامنا ہوا۔ لیکن انہوں نے بات چیت نہیں کی۔ کیونکہ وہ مجھے پاگل خانے سے باہر آتے جاتے دیکھنے کے عادی تھے۔ میں نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد این سے مخاطب ہوتے ہوئے پر جوش لہجے میں کہا۔

”ڈیز میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ یہ دیکھو تمہاری خواہش کو پورا کرنے کے لئے میں تمہارا بچہ ہمراہ لے آیا ہوں۔“

این نے بے تابانہ قدموں کے ساتھ آگے بڑھ کر ٹوکری کے اندر جھانکا۔ پھر خوشی سے چلاتے ہوئے بولی۔

”نکل ڈیز..... میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر بھول نہیں پاؤں گی۔ تم نے مجھے ماں بنا کر مجھ پر احسان ہی تو کیا ہے۔ لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ ہم اسے لوگوں کی نظروں سے چھپا کر بھلا کہاں رکھیں گے۔ اگر انہیں اس ننھے فرشتے کے متعلق بھوک بھی پڑ گئی۔ تب وہ اسے یقیناً ہم دونوں سے جدا کرنے کی کوشش کریں گے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اگر ٹاؤن والوں کے علاوہ پاگل خانے والوں کو بھی بچے کی موجودگی کی بھوک پڑ جاتی۔ تب وہ یقیناً بچے کو ہم سے چھیننے کی کوشش کرتے۔ میں نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد چٹکی بجاتے ہوئے این سے مخاطب ہو کر کہا۔

”پاگل خانے کا تہہ خانہ بچے کی پوشیدگی کے

لئے مناسب رہے گا۔ وہاں کوئی آتا جاتا نہیں ہے۔“

این انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”لیکن وہاں گبری کا معقول انتظام نہیں ہے۔ بچے کو سر دی لگ سکتی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم صدیوں سے بند پڑے اس آتش دان کی موجودگی سے بے خبر ہو۔ جو کھا کھاڑے کے سامان کے پیچھے پوشیدہ ہے۔ لکڑیاں بھی پاگل خانے کے اسٹور میں بکثرت پڑی ہیں۔ ہم ان کے ذریعے تہہ خانے کو گرم رکھ سکتے ہیں۔ اب ہمیں دو باتیں ملحوظ نظر رکھنی ہیں۔ پہلی یہ کہ بچے کی بھوک کا مداوا کیونکر کیا جاسکے اور دوسری یہ کہ تہہ خانے کی صفائی کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر تمہارے پاس کچھ رقم موجود ہو۔ تب مجھے دوتا کہ میں سر ہنری کے اٹھنے سے پہلے دودھ والی بوتل اور دودھ خرید کر لاسکوں۔“

این نے انکار میں سر ہلایا۔ پھر پریشان لہجے میں بولی۔ ”میرے پاس تو بچوں کی کوڑی بھی موجود نہیں ہے۔ لیکن میں سر ہنری کے کمرے کے خفیہ دروازے سے آگاہی رکھتی ہوں۔ جہاں وہ رقم سنبھال کر رکھتے ہیں اور وہ اسے تالا بھی نہیں لگاتے۔“

میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ”تب پھر تم رقم کا بندوبست کرو۔ تاکہ میں باہر کے کام جلد از جلد نمٹا سکوں۔“ این نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے باسکٹ میں سوتے ہوئے بچے کی جانب دیکھا۔ وہ نہایت معصوم شکل بنائے گہری نیند سویا ہوا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد این دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ تو اس کے ہاتھوں میں رقم موجود تھی۔ میں نے رقم لے کر جیب میں رکھی۔ پھر این سے پوچھا۔

”کسی کو خبر تو نہیں ہوئی۔“

این نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”سر ہنری سوتے ہوئے ہیں۔ کمرہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر نہایت آسانی کے ساتھ رقم حاصل کی۔ اور واپس چلی آئی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب تم پاگل خانے والوں کے اٹھنے سے پہلے تہہ خانے کو صاف کر کے اس قابل بنادو کہ وہاں ہمارا ننھا آرام و سکون کے ساتھ رہ سکے۔ میں دودھ والی بوتل اور دودھ لے کر ابھی واپس آتا ہوں۔“ این نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ خطرناک پاگلوں کی رہائش کا انتظام مختلف تھا۔ اس پاگل خانے میں علیحدہ کمرے کی سہولت بھی صرف مجھے اور این کو اس لئے حاصل تھی کہ ہماری شادی کو صرف تین ہی دن گزرے تھے۔ علاوہ ازیں علیحدہ کمرے کی سہولت نادر تھی۔ میں نے پاگل خانے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا جب میں انکل ٹام کے جزل اسٹور کے پاس پہنچا۔ تب میں نے وہاں پولیس والوں کو موجود پایا۔ تمام ٹاؤن جزل اسٹور کے ارد گرد جمع تھا۔ شاید تفتیش کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ میں نے کئی کترائی اور ساتھ والی گلی میں گھٹا چلا گیا۔ یہاں قریب ایک اور بڑا اسٹور بھی موجود تھا۔ میں نے وہاں سے دودھ کی بوتل اور دودھ خریدا۔ پھر خاموشی کے ساتھ پاگل خانے چلا آیا۔ این تہہ خانے کو صاف کرنے میں مصروف تھی۔ میں نے کام میں اس کا ہاتھ بنایا۔ جو نیز نام اٹھ چکا تھا۔ لیکن چیخنے چلانے کے بجائے حیرت بھری نظروں سے تہہ خانے کے اجنبی ماحول کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے این سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”تم دودھ گرم کرو۔ جو نیز نام کو روٹا نہیں چاہئے۔ ورنہ تہہ خانے سے باہر اسٹاف کو خبر ہو جائے گی کہ ہنر یہاں بچے کو چھپائے ہوئے ہیں۔ تب وہ ہمارے لئے درد سہی کا باعث بن سکتے ہیں۔“ این نے اثبات میں سر ہلایا اور میرے حکم کی تعمیل کے لئے پاگل خانے کے باورچی خانے کی جانب چل دی۔ تہہ خانہ صاف ہو چکا تھا۔ میں نے آتش دان میں لکڑیاں اکٹھی کر کے رکھیں۔ اور ان پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگادی۔

ماحول یک لخت گرم ہونے لگا۔ تھوڑی دیر میں این دودھ گرم کر کے بوتل کے ہمراہ تہ خانے میں لے آئی۔ جوئیز نام بھوک سے ہلک رہا تھا۔ دودھ پیتے ہی اچھلنے کودنے لگا۔ اور ابھی ہم اسے گود میں اٹھانے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ اس نے اپنے کپڑوں کو گلیا کر دیا۔ میں نے تھمبی نگاہوں سے این کی جانب دیکھا۔ تب وہ پر جوش لہجے میں بولی۔

”ہمارے کمرے میں میرے دو فالٹو کپڑوں کے جوڑے موجود ہیں۔ میں انہیں کاٹ کر تہ خانے میں لے آئی ہوں۔ اس کے کپڑوں کا اس سے بہتر انتظام مزید نہیں ہو سکتا ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ کچھ ہی دیر میں کپڑے کاٹ کر لے آئی۔ ہم نے جوئیز نام کے کپڑے تبدیل کئے اور اس کے ہمراہ کھیلنے لگے۔ نام ایک صحت مند خوب صورت اور ہنس کھ بچہ تھا۔ وہ چنچنے چلانے یا پھر رونے کے بجائے ہمارے ہمراہ خوشی کھیلتا رہا۔ اس نے رونے کی کوشش نہیں کی۔ این کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ ناشتہ کرنا بھی بھول چکی تھی۔ میرا دماغ مختلف سوچوں کے گھیرے میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے اوپر اپنے کمرے کا رخ کر لینا چاہئے۔ میری عدم موجودگی شک و شبہات کا باعث بن سکتی تھی۔ این اگر بچے کے ہمراہ تہ خانے میں بھی رہتی۔ تب مضائقہ نہیں تھا۔ میں حالات کو سنبھال سکتا تھا۔ اس لئے میں نے این کو تہ خانے سے باہر نہ نکلنے کی تلقین کی اور خود دروازے کو بند کر کے کمرے کی جانب چل دیا۔ وہاں حالات نارمل تھے۔ میں نے غسل کیا۔ اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھ کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔

”پولیس کی آمد“

مجھے سوچتے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں گزر پائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ تب سامنے جوزف کو کھڑے ہوئے پایا۔ جوزف پاگل خانے کا سینئر ورکر تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ نیچے ہال کمرے میں سرہنری ناشتے کی میز میرے اور این کے

منتظر تھے۔ ہماری شادی کے بعد تین دن مجھے اور این کو ناشتہ ڈانگ روم میں پاگل خانے کے ڈاکٹروں اور اسٹاف کے ہمراہ دیا جا رہا تھا۔ ورنہ پاگل خانے میں موجود مزید پاگلوں کو یہ سہولت دستیاب نہیں تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ پاگل خانے کا زیادہ تر اسٹاف جھٹی پر گیا تھا۔ گئے جنے لوگ باقی تھے۔ جو اپنے معمول کے کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت ناشتے کی میز پر سوائے سرہنری کے علاوہ مزید کوئی ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ میں نے سرہنری کو سلام کرنے کے بعد کرسی کھسکائی اور ان کے قریب بیٹھ گیا۔ انہوں نے تھمبی نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”این دکھائی نہیں دے رہی۔ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

میں نے پہلے سے گھڑا ہوا جھوٹا دہرا دیا۔ ”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ رات کے کھانے کے بعد سے جوگی اور موٹن کا رجحان ہوا۔ تو ابھی تک جاری و ساری ہے۔“ سرہنری کے ماتھے پر فکر انگیز لکیروں کا جال پھیلنے لگا۔ اور وہ پریشان کن لہجے میں بولے۔

”کچھ دوا وغیرہ کا انتظام کیا۔ اگر نہیں تو میں دیئے دیتا ہوں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور دوسرا جھوٹا نہایت بے باکی کے ساتھ بول دیا۔ ”کمرے میں ٹیلیٹ موجود تھی۔ میں نے اسے دے دی ہے۔ اس سے افادہ بھی ہوا ہے۔ لیکن مٹلی کی بدولت اسے بھوک نہیں لگ رہی۔ اس لئے ناشتہ ہلکا پھلکا بعد میں کرے گی۔“ سرہنری نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی کے ساتھ ناشتہ کرنے لگی۔ میں نے بھی چائے کا پیالہ اپنے سامنے رکھا اور توس پر مکھن لگا کر آلیٹ کے ہمراہ کھانے لگا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے سرہنری چوکتے ہوئے بولے۔

”آج ٹاؤن میں عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔ بقول جوزف کے..... نام میلسن کے گھر سے اس کے دودھ پیتے بچے کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ نجانے وہ کون مردود

ہے جسے دودھ پیتے بچے میں دلچسپی محسوس ہوئی۔“ میں نے مکھن اور انڈا بھرے نوالے کے اوپر چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔ پھر چہرے پر مصوبیت کے تاثرات نمایاں کرتے ہوئے کہا۔

”بیچارے انکل نام..... میں ہمیشہ ان کی دکان سے سودا سلف لاتا تھا۔ جوئیز نام کو میں نے بھی دیکھا تھا۔ بہت خوب صورت اور صحت مند بچہ تھا۔ کیا اس کی گمشدگی کے بارے میں کچھ پتا چلا۔“ سرہنری نے آلیٹ کا ٹکڑا کاٹنے میں پھنسانے کے بعد منہ میں رکھا اور چائے کے گھونٹ کے ساتھ نکلنے کے بعد جواب دیا۔ ”پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ لیکن تاحال کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آ سکا۔“ مختلف بات چیت کے بعد موضوع تبدیل ہو گیا۔ میں نے ناشتہ مکمل کیا۔ سرہنری نے مجھے این کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور میں اٹھ کر کچن کی جانب چل دیا۔ میں نے جوزف کو کہہ کر این کے لئے مختصر ناشتہ ہمراہ لیا اور تہ خانے میں آ گیا۔ این نے ناشتہ کیا۔ اس کے بعد باقی کا آدھا دن ہم دونوں بچے کے ہمراہ کھیلتے رہے۔

شام کو پولیس پاگل خانے میں موجود تھی۔ اور سارجنٹ اخٹونی مجھے گھورے چلا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں جوئیز نام کی تصویر تھی اور چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ سرہنری بھی اس کے ہمراہ تھے۔ وہ کرخٹ لہجے میں بولا۔

”اسے پیچاتے ہو؟“ اس نے تصویر کو میرے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے اقرار میں سر ہلادیا۔

”کون ہے یہ.....؟“ اس نے حیرت بھرے لہجے میں مجھے دیکھتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

”انکل نام کا لڑکا..... جوئیز نام.....“ میں نے گھبرائے بغیر سیاٹ لہجے میں جواب دیا۔ کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہنے کے بعد وہ دوبارہ ہلکا ہوا۔

”جوئیز نام اس وقت کہاں ہے؟ کیا تم اس کے

متعلق کچھ بتا سکتے ہو؟“ میں نے دوبارہ اثبات میں سر ہلادیا۔ اس نے دوبارہ حیرت بھری نظروں سے میری جانب دیکھا اور بولا۔

”کیا تم واقعی بتا سکتے ہو کہ یہ اس وقت کہاں ہے؟“ اس دفعہ میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

”تم مجھے اتنی حیرت کے ساتھ کیوں دیکھ رہے ہو۔ میں یقیناً بتا سکتا ہوں کہ لڑکا اس وقت کہاں ہے۔“ ”تب پھر وقت ضائع کئے بغیر جلدی بتاؤ۔ اس کے ماں باپ بہت پریشان ہیں۔“ سارجنٹ نے پوچھا۔

”کیا مطلب پریشان ہیں۔“ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال کے مطابق جوئیز نام کو انکل نام کے گھر میں ہی ہونا چاہئے۔ وہ اگر ان کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ تب اس کی موجودگی کے لئے اس سے بہتر مزید جگہ نہیں ہونی چاہئے۔“ سارجنٹ اخٹونی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا۔ پھر لفظوں کو چپاتے ہوئے بولا۔

”تم آج صبح انکل نام کے جزل اسٹور میں کیا کرنے گئے تھے۔ بہت سے ٹاؤن والے تمہاری وہاں موجودگی کے عینی گواہ ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق بچے کی گمشدگی سے کچھ پہلے کہیں نہایت مختصر وقت کے لئے اسٹور میں دیکھا گیا تھا۔ فوراً سے پیشتر اپنی وہاں موجودگی کی وجہ بیان کرو۔“ میں دوبارہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

”کسی جزل اسٹور پر میری موجودگی کا مقصد اس کے علاوہ مزید کیا ہو سکتا ہے کہ میں سودا سلف لینے کی نیت سے ہی گیا ہوں گا۔“

”لیکن تم نے سودا سلف نہیں خریدا۔“ سارجنٹ اخٹونی پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ میں نے مطمئن لہجے میں سوچا سمجھا جواب نہایت مصوبیت کے ساتھ دہرا دیا۔

”جب جب میں پیسے ہی موجود نہیں ہوں گے۔ تب خریداری بھلا کیونکر ہو سکتی ہے۔“ سرہنری کی نگاہوں میں شک و شبہات کی پرچھائیاں رقص کرتی

دکھائی دینے لگیں۔ ظاہر ہے وہ اس بات سے بخوبی آگاہی رکھتے تھے کہ مجھے آج کے دن سودا سلف لانے کے لئے پاگل خانے سے باہر نہیں بھیجا گیا تھا۔ پھر بھلا اکل نام کی دکان پر میری موجودگی کیا معنی رکھتی تھی۔

”دراصل بات کچھ یوں ہے۔“ میں معاملے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ”سرہنری اس بات سے واقف ہیں کہ میری بیوی این کی طبیعت کل رات سے بہت خراب ہے۔ اسے تنگی اور موثن کی بیماری لاحق ہے۔ صبح پاگل خانے میں ابھی کوئی بھی سوکراٹھ نہیں پایا تھا کہ میں نے باہر کارخ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اکل نام کی دکان میں مختصر میڈسین بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ لیکن دکان پر پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ میں رقم ہمراہ لانا بھول گیا ہوں۔ اس لئے بغیر خریداری کے واپسی چلا آیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ کچھ ادویات کمرے میں موجود تھیں۔ اس لئے مجھے دوبارہ دکان پر نہیں جانا پڑا۔“

سارجنٹ اتھونی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”لیکن مجھے یہ اطلاعات بھی ملی ہیں کہ اس کے بعد تمہیں بازار میں دوبارہ دیکھا گیا۔ تم نے اس دفعہ جون کے جنرل اسٹور کارخ کیا اور وہاں سے دودھ خریدا۔ یہ ایک غیر فطری بات تھی کہ تم نے دوبارہ نام کی دکان کا رخ کرنے کے بجائے ایک مخالف دکان کی طرف جانا بہتر جانا۔ معلومات کرنے پر مجھے یہ بھی پتا چلا کہ یہ وہی وقت تھا۔ جب نام کی دکان میں تفتیش کا عمل شروع کیا گیا تھا۔“

میرے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو فوراً سنبھال لیا اور مکمل خود اعتمادی کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کی۔

”میں نے ہمیشہ خریداری کے لئے اکل نام کی دکان کا ہی انتخاب کیا ہے۔ لیکن دودھ لانے کے لئے جب میں نے ان کی دکان کا رخ کیا۔ تب شاید ان کی دکان پر تفتیش شروع ہونے کی بدولت رش کچھ زیادہ تھا۔ این کی ناساز طبیعت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے میں نے اکل جون کی دکان پر جانے کو مناسب جانا۔“

سارجنٹ نے بات درمیان میں کاٹ دی۔ اور پوچھا۔ ”لیکن صبح تمہیں دودھ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”این کے لئے.....“ میں نے بے ساختہ جواب دیا۔ ”میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس کی طبیعت کل سے ناساز ہے۔“ سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد دوبارہ ہمکلام ہوا۔ ”تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ لوگوں کی انفارمیشن کے بعد جب میں نے معلومات کا سلسلہ شروع کیا۔ تب پوچھ گچھ کرتا ہوا جون کی دکان تک جا پہنچا۔ جون نے مختصر بات چیت کے بعد اس بات کا اعتراف کیا کہ تم کچھ دیر پہلے اس کے اسٹور پر آئے تھے۔ مزید استفسار پر اس نے بتایا کہ تم نے دودھ کے علاوہ شیشے کی بوتل اور پیل کی خریداری بھی کی تھی۔ تمہارے بیان کے مطابق دودھ تمہاری بیمار بیوی این کے لئے تھا۔ لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ دودھ کی بوتل بھلا تم نے کس کے لئے خریدی تھی۔ کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے۔“

مجھے اپنے سر پر پہاڑوں کا محسوس ہوا۔ دودھ این کے لئے لانا ممکن تھا۔ لیکن شیشے کی بچوں والی بوتل میرے پاس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے آخری کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے دودھ کے علاوہ اکل جون کی دکان سے بوتل نہیں خریدی۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔“

اتھونی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اسے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ لیکن تمہیں جھوٹ بولنے سے فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ تم نے بچے کو پاگل خانے میں چھپا رکھا ہے۔ اب جی جی بتاؤ کہ بچہ کہاں ہے؟“

”میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ بچہ پاگل خانے میں نہیں ہے۔ اگر تمہیں یقین نہیں آتا۔ تب تم اسے پاگل خانے میں تلاش کر سکتے ہو۔“

سارجنٹ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں ایسا ضرور کروں گا۔“ اس نے خاموش بیٹھے سرہنری کی

جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔“ انہوں نے جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر ہلکا کر تلاشی لینے کی اجازت دے دی۔

تلاش کا کام ہمارے کمرے سے شروع کیا گیا۔ این کمرے میں موجود تھی۔ شاید وہ تہہ خانے سے نکل کر ہماری مختصر بات چیت سن چکی تھی۔ کیونکہ اس کے چہرے پر ابھرنے کے تاثرات نہیں تھے۔ میں نے اسے حالات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ”سارجنٹ اتھونی جو نیز نام کی تلاش میں پاگل خانے کی تلاش لینا چاہتے ہیں۔ انہیں کچھ غلط فہمی لاحق ہو چکی ہے۔ اس لئے میرے مطمئن کرنے کے باوجود وہ ضد پراڑے ہوئے ہیں کہ پاگل خانے کی تلاش لئے بغیر وہ یہاں سے باہر نہیں جائیں گے۔“ این کے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات ابھرنے لگے۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولی۔ سارجنٹ اتھونی نے اپنے ماتحتوں کو تلاش کا حکم دیا اور پاگل خانے میں پھیلنے چلے گئے۔ سارجنٹ ہمارے کمرے میں چلا آیا۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد تمام پاگل خانے کی تلاشی لی جا چکی تھی۔ لیکن بچے کا وہاں نام و نشان بھی موجود نہیں تھا۔ سارجنٹ نے حیران ہو کر سرہنری کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہاں چھپنے کی مزید جگہ موجود ہے۔ مثلاً تہہ خانے یا پھر کوئی خفیہ کمرہ وغیرہ۔“

سرہنری نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”تہہ خانہ موجود ہے۔ لیکن وہاں پر کاٹھ کباڑ کے علاوہ اور کچھ موجود نہیں ہے۔“

سارجنٹ پر جوش لہجے میں بولا۔ ”تب پھر ہمیں تہہ خانے تک لے چلے۔ ہم اسے چیک کرنا چاہتے ہیں۔ یقیناً تہہ خانے میں ہی چھپایا گیا ہوگا۔“

”میرے ساتھ آئیے۔ میں آپ کو تہہ خانے میں لے جاتا ہوں۔“ سرہنری نے جواب دیا اور پچکن کے پاس واقع اسٹور روم کے اندر بنی تہہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب چل دیے۔ میں اور این بھی پریشان چہرہ لئے ان

کے ہمراہ تھے۔ سیڑھیاں اتر کر جب ہم سب تہہ خانے میں داخل ہوئے تب سرہنری کے علاوہ سارجنٹ کی آنکھوں میں بھی ابھرنے کے تاثرات دکھائی دینے لگے۔ صاف تہہ خانہ جس میں سلگتا ہوا آتش دان اس بات کا مظہر تھا کہ وہ کسی کی رہائش کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ سرہنری کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے صاف کس نے کیا؟“

سارجنٹ اتھونی نے یکدم پوچھا۔ ”کیا آج سے پہلے یہ ایسا نہیں تھا۔“

”سرہنری نے انکار میں سر ہلایا۔ سارجنٹ کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔ پھر اس نے اپنے ماتحت کو اشارہ کیا۔ اور وہ تہہ خانے کی تلاشی لینے لگا۔ میں نے کن آنکھوں کے ساتھ این کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات تھے۔ جیسے سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہو۔ اس کے علاوہ وہ مکمل طور پر خاموش رہی۔ تہہ خانے کی مکمل تلاشی لی گئی۔ لیکن وہاں سے کسی بھی قسم کا سراغ نہیں مل سکا۔ یقیناً یہ سب این کی کارستانی رہی ہوگی۔ اس نے چھپ کر میری اور سارجنٹ کی بات چیت سننے کے بعد بچے کے علاوہ اس کے کپڑے اور بوتل بھی چھپا دی تھی۔ میں نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ سارجنٹ اتھونی کی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”ابھی سکون کا سانس مت لو۔ آگے بہت سے مرحلے باقی ہیں۔ تہہ خانے کی صفائی۔ آتش دان کی تیش اور تمہارے بچے کی بوتل کی خریداری اس بات کا اظہار کر رہی ہے کہ یہاں کوئی رہائش پذیر تھا۔ تہہ خانے کے استعمال کا مقصد صرف یہی ہو سکتا ہے کہ پاگل خانے والوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث رہتا۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔ لیکن جلد مکمل ثبوت کے ساتھ واپس آؤں گا۔“ اس نے پاؤں پٹختے اور تہہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب چل دیا۔

”بچے کی موت“

سارجنٹ کے جانے کے بعد سرہنری نے ہم دونوں سے مختصر پوچھ گچھ کی۔ ان کی آنکھوں میں شک و شبہات کی پرچھائیاں موجود تھیں۔ یقیناً وہ یہ جان کر مایوسی محسوس کر رہے تھے کہ ان کا شادی والا تجربہ ناکام رہا تھا۔ بہر کیف انہوں نے زیادہ بات چیت کرنا مناسب نہیں جانا اور خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے این کا ہاتھ تھاما۔ اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کمرے کے دروازے کو کئی لگانے کے فوراً بعد میں نے این کی جانب دیکھتے ہوئے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

”بچہ کہاں ہے؟ یقیناً اسے تم نے چھپا دیا ہوگا تاکہ ہم دونوں گرفتار نہ کر لئے جائیں۔“

این نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ”میں نے تمہاری اور سارجنٹ کی باتیں سن لی تھیں۔ میں نے بچے کو اس کے کپڑوں کے ہمراہ چھپا دیا۔ اور تم میری عقل کی داد دو گے کہ اتنے پولیس والے سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود بھی اسے تلاش نہیں کر پائے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے داد دینے کے بعد بچے کی پوشیدگی والی جگہ کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے فخریہ لگا ہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کپڑوں کے اس ٹرنک کی جانب اشارہ کیا۔ جس میں ہمارے کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا پولیس کے سپاہی نے اسے بھی کھول کر دیکھا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اپنے جسم کے روٹ گئے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اگر بچہ ٹرنک میں مقفل تھا۔ تب پھر پون گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزرنے کے بعد نہ جانے اب تک زندہ ہو گا یا نہیں.....؟

میں نے دوبارہ این کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم سچ کہہ رہی ہو۔ اور بچہ ٹرنک کے اندر ہی موجود ہے۔“

”ہاں.....“ اس نے کند ذہن بچے کی مانند

اقرار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ یقیناً ٹرنک کے اندر ہی موجود ہے۔ میرے خیال کے مطابق اس سے بہتر اور کوئی جگہ پاگل خانے میں دستیاب ہو ہی نہیں سکتی تھی۔“

میں نے سر کو جھٹک کر دماغ میں اٹھتے ہوئے بگولوں کو منتشر کرنے کی کوشش کی اور پھر آگے بڑھ کر کپڑوں کے ٹرنک کے ڈھکنے کو جھٹکے کے ساتھ کھول دیا۔ مختصر ٹرنک نمائی اور پر تک کپڑوں سے بھری ہوئی تھی اور وہاں بچہ موجود نہیں تھا۔ میں نے اپنے پیچھے کھڑی این کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

تب وہ دوبارہ معصومیت بھرے لہجے میں بولی۔ ”بچہ کپڑوں کے نیچے پوشیدہ ہے۔ اگر اسے اوپر ہی لٹا دیتی۔ تو اب تک پولیس والوں کے ہتھے ہم چڑھ چکے ہوتے۔“

میں نے زچ ہو کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اتنے کپڑوں کے نیچے بچہ کے زندہ رہنے کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہی رہ جاتے تھے۔ پھر بھی امید پر دنیا قائم ہے کے مترادف میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ کپڑے ہٹانے شروع کر دیئے۔ میں جس کپڑے کے جوڑے کو بھی اپنی جگہ سے ہٹاتا تھا۔ وہ دوبارہ وہیں آگرتا تھا۔ جھنجھلا کر میں نے کپڑوں کو پھینکنا شروع کر دیا۔ این مجھے ایسا کرتے دیکھ کر قبضہ لگا کر ہنس پڑی۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھا۔ اس نے بمشکل اپنی ہنسی کو روکا۔ اور مجھے ہاتھوں کے پاس سے تھام کر ٹرنک کے پاس سے ہٹایا۔ اور ٹرنک کے تقریباً اندر گھس کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ سردیوں کے کپڑے کچھ نہ کچھ تو یقیناً وزن رکھتے ہی ہیں۔ اسے کچھ وقت پیش آ رہی تھی۔ لیکن پھر اچانک ہی اس کا متحرک جسم ایکلخت سا کرت ہو گیا۔ شاید وہ اپنے مخصوص مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ پھر جب وہ باہر آئی۔ تب مجھے اپنا سانس حلق میں پھنستا محسوس ہوا۔ وہ بچے کو پاؤں کے پاس سے تھامے ہوئے تھی اور اس کی لاش این کے ہاتھ میں ایسے لٹکی ہوئی تھی۔ جیسے

مردہ مرغی کی کھال کو اتار کر سوپ والی ریڑھی پر لٹکادیا جاتا ہے۔

این نے قہقہہ لگاتے ہوئے اسے سیدھا کیا۔ پھر سینے کے ساتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”اسے سردی لگ گئی ہے۔ اس لئے خاموشی کے ساتھ ٹرک میں لیٹا ہوا تھا۔ ورنہ یہ چپ بیٹھنے والے کہاں ہیں۔“

میں نے افسردہ نگاہوں سے جونیر نام کی لاش کی جانب دیکھا۔ پھر این کو مخاطب کرتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ مر چکا ہے۔ تم بہت بڑے گناہ کی مرتکب ہو چکی ہو۔ ہمیں اسے ٹرک میں بند نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

این نے بچے کی لاش کو ہاتھوں میں بھینچے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر میں ایسا نہ کرتی۔ تب پولیس والے اسے مجھ سے جھین لیتے۔ میں اسے اپنے آپ سے جدا نہیں ہونے دینا چاہتی۔“

”لیکن یہ مر چکا ہے۔“ میں نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ ”اب تم اسے مزید پاس نہیں رکھ سکتی ہو۔“

”ایسا ممکن نہیں ہے۔“ این غراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”مرنے یا زندہ ہونے سے مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس کی جدائی میں برداشت نہیں کروں گی۔“

میں نے دوبارہ پریشان نگاہوں سے این کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر مستحکم تاثرات دیکھ کر میں معاملے کی گھمبیر تا کے متعلق بخوبی جان سکتا تھا۔ یعنی اگر میں اس سے بچے کو چھیننے کی کوشش کرتا۔ تب وہ انتہائی اقدام اٹھانے سے گریز نہ کرتی۔ اور میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے خاموش ہو گیا۔ وہ رات تک بچے کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی۔ رات کا کھانا میں نے اسے زبردستی کھلایا۔ کھانے کے بعد جب وہ مختصر وقت کے لئے ٹوائٹ لگ گئی۔ تب میں نے بچے کی لاش کو اٹھا کر تہہ خانے میں موجود لکڑیوں کے ڈھیر میں چھپا دیا۔ پھر

مختصر کپڑوں کے ڈھیر کے ساتھ ایک مصنوعی گڑیا کا بے ڈھنگا وجود بنا کر اسے کپڑوں میں لپیٹ کر بستر پر رکھ دیا۔ این نے ہاتھ روم سے باہر نکلتے ہی پہلی نگاہ بچے کے بے ڈھنگے وجود پر ڈالی۔ اس کے دماغ نے فوراً تبدیلی کو محسوس کر لیا۔ لیکن میں نے معاملے کو سنبھالتے ہوئے اسے سمجھایا کہ جونیر نام کو ٹرک میں سردی لگ کر بخار چڑھ گیا ہے۔ اس لئے میں نے اسے کپڑوں کے اندر اچھی طرح پیک کر دیا ہے۔ تاکہ اسے مزید سردی نہ لگ سکے۔ بہتری اسی میں ہے کہ اب اسے دوبارہ کپڑوں سے باہر نہ نکالا جائے۔ این نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ پھر کپڑوں پر مشتمل بے ڈھنگے وجود کو اٹھا کر سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اور کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد دوبارہ بولی۔

”جونیر نام کا وزن بہت کم ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں شاید ایسا بخاری وجہ سے ہوا ہے۔ ہمیں اسے دودھ پلا دینا چاہئے۔ کہیں اس کی طبیعت مزید خراب نہ ہو جائے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہارا خیال نہایت عقلمندانہ ہے۔ لیکن تمہارے ہاتھ روم جانے کے بعد میں بچے کو دودھ پلا چکا ہوں۔ اب اسے صرف گہری نیند کی ضرورت ہے۔ تم اسے ہلائے بغیر بستر پر لٹا دو۔ تاکہ یہ پرسکون نیند سو سکے۔“

این نے اثبات میں سر ہلایا اور کپڑوں کے بے ڈھنگے وجود کو احتیاط کے ساتھ بستر کے کنارے پر لٹا کر اس کے ہمراہ بستر پر لیٹ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر لائٹ آف کر دی۔ پھر این کے ہمراہ بستر کے دوسری جانب لیٹ گیا۔ اور اس کے سونے کا انتظار کرنے لگا۔

”پاگل خانے میں آگ“ رات کے بارہ بجے کرہ این کے خراٹوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ کیمبل کو ایک جانب ہٹایا۔ اور بستر سے نیچے اتر آیا۔ میں نے کپڑے تبدیل کئے۔ جو تے پہنے پھر نیچے تہہ خانے میں

بچے کی لاش اور کھدائی کے اوزار اٹھائے۔ اور نہایت خاموشی کے ساتھ پاگل خانے کی دیوار کو پھاند کر باہر نکل آیا۔ پاگل خانے کے گیٹ کو نہایت طاقتور تالے سے مقفل کر دیا جاتا ہے۔ یہ تالابج کے قریب کھولا جاتا ہے۔ پاگل خانے سے کچھ دور شیل ٹاؤن کا سرسبز و شاداب قبرستان واقع ہے۔ میں نے بچے کی لاش کو ایک جانب رکھا۔ اور زمین کھودنے لگا۔ مٹی ہموار اور نرم مٹی۔ اس لئے قبر آسانی کے ساتھ کھدی چلی گئی۔ قبر تیار کرنے کے بعد جب میں نے بچے کی لاش کو اندر ڈال کر اسے ہموار کیا۔ تب شیل ٹاؤن کی جانب سے لوگوں کے چنچنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ہڑبوا کر اوزار اٹھائے۔ اور یہ سوچتے ہوئے ٹاؤن کی جانب بھاگ کھڑا ہوا کہ شاید پاگل خانے والوں کو میرے باہر نکلنے کی اطلاع مل گئی ہے اور مجھے ڈھونڈنے کے لئے ٹاؤن کا رخ کر چکے ہیں۔ لیکن ٹاؤن میں پہنچ کر مجھے مختلف صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

لوگ جوق در جوق پاگل خانے کی جانب منہ اٹھائے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ میں نے پاگل خانے والی سمت نگاہ دوڑائی۔ وہاں آگ کے شعلے اٹھتے دکھائی دیئے۔ میرے ہاتھوں سے اوزار چھوٹ کر نیچے گر گئے اور میں بھی سر پٹ پاگل خانے کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ عمارت کے قریب پہنچنے پر میں نے شعلوں کو آسان سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ آگ باہر کے تمام راستوں کو کور کر چکی تھی۔ اس لئے اندر جانا ممکن نہیں تھا۔ لوگ باہر کھڑے تماشا دیکھنے میں مصروف تھے۔ لیکن عملی قدم اٹھانے کی ہمت کسی میں بھی موجود نہیں تھی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر پاگل خانے کی دوسری منزل کی جانب دیکھا۔ وہاں تمام پاگل اور اسٹاف کے ہمراہ این بھی حیران و پریشان کھڑی نیچے کی جانب دیکھ کر مدد کے لئے چیخ رہی تھی۔ میں نے چلاتے ہوئے ٹاؤن والوں کو پانی لانے کے لئے کہا۔ لیکن وہ ہونفوں کی طرح میری جانب دیکھتے رہے۔ پھر ایک آدمی نے چلاتے ہوئے بتایا کہ فائز بریگیڈ والوں کو فون کیا جا چکا ہے۔ لیکن ان

کے آنے میں کچھ وقت لگے گا۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے ٹاؤن کے رہائشیوں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اگر فائز بریگیڈ والے صبح آئے تب کیا تم انہیں یوں جل کر مر جانے دو گے۔“ انہوں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”اگر ایسا ہوا۔ تب مزید کچھ سوچنا پڑے گا۔ لیکن اس وقت ہم ان پاگلوں کے لئے خود کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔“ میں نے غصے کی شدت پر قابو پاتے ہوئے اس کے چہرے پر مکار سید کر دیا۔ وہ پیچھے کھڑے تماشا بینوں کے درمیان جا گرا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر پاگل خانے کے چلتے ہوئے دروازے میں سے اندر چھلانگ لگا دی۔ مجھے اپنے پیچھے لوگوں کے چنچنے چلانے اور رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ لیکن میں نے توجہ نہیں دی بلکہ اندھا دھند دوسری منزل پر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بھاگتا چلا گیا۔ وہاں ہر جانب آگ کی پٹیلیں اٹھتی دکھائی دے رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں میرے جسم کو آگ نے گھیرے میں لے لیا اور آگ اور دھوئیں کی بدولت بے دم ہو کر زمین پر گر جاتا چلا گیا۔ آگ میں گھٹا تماقت بھی اور فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس بات کی سمجھ مجھے اس وقت آئی جب وقت گزر چکا تھا۔“

بل اچانک خاموش ہو گیا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پاگل خانے میں آگ کس نے لگائی تھی؟“ نبل نے جواب دیا۔ ”این نے..... اس نے مجھے جونیر نام کی لاش کے ہمراہ پاگل خانے کی دیوار کو پھلانگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میرے پیچھے وہ دیوار تو پھلانگ نہیں سکی۔ غصے کی شدت پر قابو نہ پاتے ہوئے اس نے تمام پاگل خانے کی دیواروں پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ اس انتقامی کارروائی کے نتیجے میں میرے ہمراہ تقریباً تمام پاگل خانے کے عملے اور پاگلوں کی موت واقع ہوئی۔ یہ سب پاگلوں کی روجوں

ہیں۔“ اس نے بت بنے بیٹھے لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور انہیں صدمہ نہ صرف اس بات کا ہے کہ حادثے والی رات ان کی مدد کے لئے ٹاؤن کے کسی بھی فرد نے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صبح تک پاگل خانے کی عمارت کو جلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ لیکن انہوں نے فائر بریگیڈ کے عملے کے انتظار کے علاوہ کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ صبح فائر بریگیڈ کی آمد کے بعد آگ کو بجھایا گیا۔ پھر جلی ہوئی لاشوں کو باہر نکال کر قریبی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ لیکن ہماری روچیں بھٹکتی رہیں۔“

”مسئلے پر مسئلہ“

”میں نے این کے ہمراہ تمام روحوں کو اکٹھا کیا۔ پھر انہیں ٹاؤن والوں کی غداری سے آگاہ کرنے کے بعد انتقام لینے کی نصیحت کی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ہم ہوا پر مشتمل روحوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ کسی ٹھوس اجسام سے ٹکر لینے کے لئے ہمیں کسی ایسے جسم کی ضرورت تھی جو بلا چوں و چرا کئے بغیر ہمارا حکم ماننے کو تیار ہو جاتا۔ ایسا ہونا بظاہر ممکن نہیں تھا۔ لیکن کافی دنوں کی عرق ریزی کے بعد میں نے اس کا حل بھی تلاش کر لیا۔ کھلونوں کی اس دکان میں جانوروں کے مجسموں کے علاوہ انسانوں کے مجسمے بھی دستیاب تھے۔ ہم رات کو دکان کے اندر داخل ہوتے پھر مجسموں میں گھسنے کے بعد باہر نکلتے اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کر دیتے۔“

ڈونی میں نے بات درمیان میں کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ”بل تمہارے کہنے کے مطابق تم کسی بھی ٹھوس اجسام سے ٹکر نہیں لے سکتے ہو۔ پھر بھلا تم نے گزشتہ رات میری دکان کا تالا کیسے کھولا۔“

پری بعد سے کہ اسے بچہ چاہئے۔ جیتا جاگتا۔ ہنستا کھلتا بچہ تم بتاؤ کہ میں اسے بچہ کہاں سے لا کر دوں۔“

ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔ ”واقعی مسئلہ گھمبیر ہے۔ این بعد ہے کہ اسے گوشت پوست سے مزین بچہ چاہئے۔ لیکن خود وہ ہوا پر مشتمل روح ہے۔ بالفرض محال اگر اسے ایسا کوئی لاوارث بچہ مہیا کر بھی دیا جائے۔ تب یقیناً وہ اسے تھانے کے لئے کسی سخت قسم کے کھلونے کا سہارا لیتی۔ جس کے ہاتھ پاؤں نہایت سخت اور صبر دے ہوتے۔ ایسی صورت میں بچہ اس کے سخت و کرخت وجود کو بھلا کیسے برداشت کرتا۔ پھر بھلا اس بات کی بھی کیا گارنٹی ہو سکتی تھی کہ کوئی اپنا بچہ اسے ہمیشہ کے لئے دے دیتا۔“

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور مسئلے کے حل کے متعلق سوچنے لگا۔ بل نے مسکرائی نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ اور بولا۔

”صبح ہونے والی ہے۔ ہمارے واپس جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ کل رات کو دوبارہ آئیں گے۔ تم مسئلے کا حل سوچ کر رکھنا۔ بصورت دیگر ہم مزید کچھ کارروائی کریں گے۔“

مشتمل وجود سے عاری ہوتی چلی گئی۔ ڈونی نے طویل سانس لیا۔ اور اوپر اپنے رہائشی کمرے کی جانب چل دیا۔ ان کے مسئلے کا حل فی الوقت ڈونی کے دماغ میں موجود نہیں تھا۔ لیکن اسے امید تھی کہ تھوڑی دیر کی سوچ و بچار کے بعد وہ حل تلاش کر ہی لے گا۔

تمام رات جاگتے رہنے کی وجہ سے اسے اپنا سر درد کی بدولت چھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس لئے بستر پر لیٹنے ہی وہ گہری نیند سو گیا۔ صبح ساڑھے بارہ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ کوئی دکان کے شتر پر دستک دے رہا تھا۔ ڈونی نے مکمل ایک جانب پھینکا اور نیچے دکان کی جانب چل دیا۔ شتر کو زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑی کو کھولا اور جھٹکے کے ساتھ شتر کو اوپر کر دیا۔ سامنے سارجنٹ انھونی اپنے ماتحتوں کے ہمراہ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات تھے۔

ڈونی کو دیکھتے ہی اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

”خیریت تو ہے لگتا ہے کہ تم نے رات دکان کے اندر ہی گزار دی ہے۔“

ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور بولا۔ ”وجہ صرف یہ ہے کہ میں پچھلی رات کو مکان میں داخل ہونے والے اشخاص کو رکنے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔“

”تب پھر تم نے ایسا کیا کیا؟“ سارجنٹ انھونی نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور انہیں دکان کے اندر آنے کے لئے کہتے ہوئے خود دکان سے ملحقہ اسٹور روم کی جانب چل دیا۔ یہاں الیکٹرک بیڑ موجود تھا۔ اس نے جلدی جلدی تین کپ کافی تیار کی۔ اور انہیں ہاتھوں میں تھامے دوبارہ دکان میں آ گیا۔ سارجنٹ انھونی تنقیدی نگاہوں سے دکان کا جائزہ لے رہا تھا۔ ڈونی نے کپ اس کے اور اس کے ماتحت کے سامنے رکھے۔ پھر خود اپنا کپ تھامے کرسی پر بیٹھ گیا۔ سارجنٹ نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ تب ڈونی بولا۔ ”شاید تم ان

باتوں پر یقین نہیں کرو گے۔ جو میں بیان کرنے لگا ہوں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ میری ملاقات گزشتہ رات کچھ روحوں کے ساتھ ہوئی ہے اور ان روحوں کا تعلق شیل ٹاؤن کے پاگل خانے سے ہے۔“ پھر اس نے تمام واقعات لفظ بہ لفظ سارجنٹ انھونی کے سامنے دہرا دیئے۔

وہ حیرت بھرے چہرے کے ساتھ خاموشی کے ساتھ کہانی سن رہا۔ پھر طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔ ان پاگلوں کی موت بہت درد ناک طریقے سے وقوع پذیر ہوئی تھی۔ ٹاؤن کے کسی بھی فرد نے انہیں بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سب حل کر بھسم ہو گئے تھے۔ اب اگر وہ انتقام لے رہے ہیں۔ تب انہیں ایسا کرنے سے منع کرنا میرے اختیار سے باہر ہے۔“

”لیکن ہمیں ایسا کرنا ہوگا۔“ ڈونی نے اپنے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ وہ ٹاؤن کے تمام افراد کو نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کرنے کے بعد بچوں کو اغوا کر کے لے جائیں گے۔“ سارجنٹ انھونی نے اثبات میں سر ہلایا اور اذیت بھرے لہجے میں بولا۔

”آج صبح تمہاری دکان بند ہونے کی اطلاع مجھے ملی۔ تب میں نے یہی سمجھا کہ واردات ہو گئی ہے کیونکہ باقی ٹاؤن میں حالات بہتر ہی رہے تھے۔ اب اگر تمہارے کہنے کے مطابق معاملہ روحوں کا ہے۔ تب بھلا میں اور تم کیا کر سکتے ہیں۔“

ڈونی بولا۔ ”میرے دماغ میں ایک ایسی تدبیر موجود ہے۔ جس پر عمل کر کے ہم ان روحوں کے شر سے ٹاؤن والوں کو نجات دلوا سکتے ہیں۔ صرف ایک بچے کی قربانی دینی ہوگی۔“

سارجنٹ چوکتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ٹاؤن کے کسی گھرانے کو اپنے بچے کی قربانی دینی ہوگی۔ یہ ناممکن ہے۔ ایسا کوئی بھی نہیں کرے گا۔ ہمیں مزید کوئی حل سوچنا ہوگا۔“

”اس مسئلے کا حل اس کے علاوہ مزید کوئی نہیں

Dar Digest **40** March 2013

شاید تمہارے دکان خریدنے سے پہلے بھی جانوروں کے بھس بھسوں میں گھس کر انہیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔“ ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب وہ پریشان لہجے میں بولا۔ ”لیکن آج تو انہوں نے حد ہی کر دی۔ پندرہ بچوں کو اغوا کر لیا۔ ابھی تک اغوا کی خبر ٹاؤن سے باہر نہیں چلائی۔ اگر چلی گئی تب ہماری بہت بدنامی ہوگی۔“

ڈونی نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اسے روجوں کے ساتھ گزشتہ رات والی میٹنگ کے متعلق بتایا اور اسے سمجھایا کہ وہ ایک کہانی کو اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس کے مطابق ہیر و ہارسری بجا کر بچوں کو ہمراہ لے کر جنگل میں غائب ہو جاتا ہے اور بعد میں معاوضے کا تقاضا کرنے کے بعد بچوں کو رہا کر دیتا ہے۔ ڈونی نے اسے دلا سہ دیتے ہوئے کہا کہ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ دنوں میں پاگلوں کا تقاضا سامنے آنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ بچے جنگل میں کہاں موجود ہیں۔

سارجنٹ انھونی بولا۔ ”پاگلوں کے تقاضے کے متعلق ہم سب بخوبی آگاہی رکھتے ہیں اور تقاضے کی فراہمی ہمارے اختیار سے باہر بھی ہے۔ پھر بھلا وقت کیوں ضائع کریں۔ ہمیں بچوں کی تلاش میں جنگل کا رخ کر دینا چاہئے۔ نجانے سرور رات کے دوران وہ پاگل روجیں انہیں کہاں چھپاتی پھر رہی ہوں گی۔“

ڈونی نے گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”پانچ بجنے والے ہیں۔ روجوں کے باہر نکلنے کا وقت قریب ہے۔ کیا ایسے اوقات میں تم جنگل کی جانب جانے کی جسارت کرو گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ایسے اوقات میں وہ تمہیں نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کریں گی۔ علاوہ ازیں میرا مزید مشورہ یہ ہے کہ تم بچوں کے ماں باپ کے ہمراہ آج رات میری دکان میں بسر کرو۔ اگر وہ رات کو دکان میں آتی ہیں۔ تب ہم باقی کا معاملہ گفت و شنید کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“

سارجنٹ انھونی نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے میں بچوں کے ماں باپ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تمہاری دکان کے اوپر کمرے میں اتنی جگہ موجود ہے۔ جہاں وہ سب سما سکیں۔“

ڈونی انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”کمرے میں اتنی جگہ موجود نہیں ہے۔ اس لئے بچوں کے والدین میں سے صرف مردوں کا انتخاب کیا جائے گا۔ میرے خیال میں کمرے میں پندرہ بیس افراد چھن چھن کر رات اطمینان کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔ دکان میں رات گزارنے میں یہ قیاحت پائی جاتی ہے کہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں نہ جانے روجیں دکان کا رخ کرتی بھی ہیں یا نہیں۔“ سارجنٹ انھونی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور دکان سے باہر کی جانب چل دیا۔

”عملی فیصلہ“

تھوڑی دیر بعد بچوں کے باپ سارجنٹ کے ہمراہ دکان میں موجود تھے۔ دکان کے شیشے کے دروازوں کو بند کر دیا گیا۔ لیکن شرعی نہیں کیا گیا اور ایسا روجوں کو ورغلانے کے لئے کیا گیا تھا۔ تاکہ وہ دکان میں آنے کی کوشش کریں۔ ڈونی نے دکان کے درمیان میں سے تمام پرندوں کے جسموں کو ہٹا کر جگہ کو وسیع کرنے کی کوشش کی۔ درمیان والی جگہ پر اسٹور روم میں موجود چند کرسیاں رکھ کر کالج کی کسی کلاس کی شکل دے دی گئی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ان کرسیوں پر بچوں کے والدین کو بیٹھا کر فیصلی گفت و شنید کے ذریعے معاملے کو حل کرنے کی کوشش کی جاسکے۔ دکان میں بیس کا بیٹر لگانے کے بعد ڈونی نے اوپر اپنے رہائشی کمرے کا رخ کیا۔ بچوں کے والدین کے چہرے پر خوف و پریشانی کے تاثرات تھے۔ کسی روح کے ساتھ بات چیت کرنے کا یہ ان کا پہلا اور شاید آخری اتفاق تھا۔ ڈونی نے انہیں دلا سہ دیا اور بتایا کہ وہ روجیں نہایت بے ضرر اور معصوم ہیں۔ دماغی طور پر پاگل ہونے کی بدولت کچھ بے وقوف ضرور ہیں لیکن ان کا وجود نقصان پہنچانے کا

باعث نہیں بن سکتا۔ سارجنٹ انھونی نے طنزیہ انداز میں سر ہلایا اور بولا۔

”بالکل..... ان کے ہوا پر مشتمل وجود نقصان پہنچانے کے قابل نہیں ہیں۔ ٹاؤن میں اتنے دنوں سے جوئل و غارت ہو رہی ہے۔ وہ سب تو اتفاقاً یہ ہے۔ اس میں ان روجوں کا تھ نہیں ہے۔“

ڈونی عصبی لہجے میں بولا۔ ”عمل کا رد عمل ہوتا ہے۔ وہ بھی رد عمل تھا۔ یا پھر کچھ غلط فہمیاں تھیں، میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مہربانی کر کے تم معاملے کو بگاڑنے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ حالات مزید خراب ہو سکتے ہیں۔“

سارجنٹ نے کاندھے اچکائے اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ ڈونی نے بھی کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ کر انتظار کرنے کو بہتر جانا۔ انتظامات مکمل تھے۔ اب صرف روجوں کا انتظار ہی باقی تھا۔

رات کے بارہ بجے ڈونی کو نیچے دکان سے سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ یقیناً دکان میں آچکے تھے۔ ڈونی نے سارجنٹ اور بچے کے والدین کو ان کی آمد کے متعلق بتایا اور محتاط قدموں کے ساتھ نیچے میز ہیوں کی جانب چل دیا۔ دکان میں ٹیلی اور این کی روح تک کے علاوہ مزید روجیں موجود نہیں تھیں۔ ڈونی کو دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر ٹل بولا۔

”یہ کیا ماجرا ہے؟ تم نے دکان کی میٹنگ کیوں چیلنج کر دی۔ ہمیں اسے فروخت کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔“

ڈونی بولا۔ ”ایسی بات نہیں ہے۔ اوپر والے کمرے میں ان بچوں کے باپ موجود ہیں۔ جنہیں تم اغوا کر کے لے جا چکے ہو۔ وہ تم سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ یا اگر یوں کہہ دو..... تو زیادہ بہتر ہوگا کہ میں نے اس تمام میٹنگ کا اہتمام اس لئے کیا ہے تاکہ مل کر بات چیت کے ذریعے معاملے کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔“

”کیا ایسا ممکن ہے؟“ ٹل کی روح بولی۔ ”کیا

وہ این کو جیتا جا سکتا ہے؟“ اگر ایسا کر سکتے ہیں تب ہم بھی معاملے کو رفاغ دفاع کرنے کی کوشش کریں گے۔“

ڈونی بولا۔ ”میں تمہیں یقین تو نہیں دلا سکتا۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ معاملے کو احسن طریقے کے ساتھ اختتام پر پہنچانے کی کوشش ضرور کرو گے۔ باقی خود کا منظور.....“

”ٹل نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے ہم تم پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تم ٹاؤن سے باہر کے رہنے والے ہو۔ اگر ٹاؤن کے ہوتے۔ تب ہم تم پر بھی اعتماد نہیں کرتے۔“ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ”مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہاں ہمارے خلاف مقدمے بازی کا آغاز ہونے والا ہے۔ اگر بات ایسی ہی ہے تب ہم تمہیں جج کی کرسی پر بیٹھا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ ہمیں اپنے تحفظ کا احساس ہو سکے۔“

ڈونی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”واقعی اگر مقدمے کا سامنا پیش کیا جائے۔ تب معاملہ بہت دلچسپ صورت اختیار کرے گا۔ اور مجھے اپنی زندگی کے دوران جج کی کرسی پر بیٹھنا بھی نصیب ہو جائے گا۔“ پھر ڈونی نے آگے بڑھ کر ایک کرسی اٹھائی اور اسے باقی کرسیوں کے سامنے کاؤنٹر کے پاس رکھ دیا اور فخر کے ساتھ بولا۔ ”یہ جج کی کرسی ہے۔“ پھر اس نے دوسری کرسی اپنی کرسی کے داہنے جانب رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ سارجنٹ انھونی یعنی ہونے والے مجرم کے وکیل کی کرسی ہے۔ جبکہ بائیں جانب تم اور تمہاری بیوی این بیٹھو گے۔ کیا خیال ہے۔“ ٹل نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈونی مقدمے کے باقی افراد کو بلانے کے لئے اوپر کمرے کی جانب چل دیا۔ کمرے میں سارجنٹ انھونی اور بچوں کے والدین اس کے منتظر تھے۔ ڈونی نے انہیں دلا سہ دیا۔ پھر اپنے ہمراہ نیچے آ کر مقدمے کی روداد میں حصہ لینے کی پیشکش کی۔ سارجنٹ نے منہ بناتے ہوئے ڈونی کی جانب دیکھا اور طویل سانس

لیتے ہوئے کہا۔

”یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔ اب مجھے سارجنٹ انٹونی کو پاگلوں کی روجوں کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ٹاؤن والوں کے حق میں وکالت کرنی ہوگی۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ اتنے تردد کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایک دفعہ ان پاگلوں کو میرے سامنے کھڑا کر دو۔ پھر دیکھو میں انہیں کیسے سیدھا کرتا ہوں۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر پانچ منٹ میں انسانوں کے بچے نہ بن گئے۔ تب میرا نام بدل کر انٹونی کے بجائے مارکونی رکھ دینا۔“

ڈونی نے حیرت بھری نگاہوں سے سارجنٹ انٹونی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”سارجنٹ تم شاید بھول رہے ہو کہ ان پاگلوں کی روجیں گوشت پوست کے اجسام کے ساتھ قطع تعلق کر چکی ہیں۔ اب وہ ہوا پر مشتمل روجیں ہیں۔ جن پر تشدد نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کر سکتے ہو۔ تب وہ نیچے موجود ہیں۔ تم بخوشی کر لو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ جہاں تک میرے مشورے کا تعلق ہے تو وہ یہی ہے کہ خاموشی کے ساتھ اور صلح و صفائی سے اسے حل کرنے کی کوشش کرو۔ چننا چلانا۔ مارنا دھاڑنا۔۔۔۔۔ کسی انسان کے معاملے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ روجوں کے معاملے میں نہیں۔ اور روجیں بھی پاگلوں کی روجیں۔۔۔۔۔ جنہیں عام حالات میں سمجھنا ہی ممکن نہیں۔۔۔۔۔ یہاں تو معاملہ عام حالات سے تجاوز کر چکا ہے۔“ ڈونی لمحہ بھر کے لئے سانس لینے کے لئے رکا۔ پھر دوبارہ بولا۔ ”اب اگر نیچے آنا چاہتے ہو۔ تب خاموشی کے ساتھ آ جاؤ۔ نہیں آنا چاہتے تب ہمیں بیٹھے رہو۔ میری جانب سے کسی پر بھی زور زبردستی نہیں ہے۔“ اس نے بات ختم کی اور نیچے دکان کی جانب چل دیا۔

نیل اور این کی روجیں کرسیوں پر براجمان تھیں۔ ڈونی کوئی بھی بات کہنے بغیر درمیان والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میز پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر ایک ایک کر کے بچوں کے والدین خوفزدہ چہرہ لئے نمودار ہونے لگے۔ ان کی نگاہوں کا مرکز نیل

اور این کی روجیں تھیں۔ شاید عام حالات میں وہ کبھی ان روجوں کا سامنا کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ لیکن آج تو بات ان کے بچوں کے ساتھ منسلک تھی۔ اس کے علاوہ ڈونی کا وہ بھی ان کے لئے تسکین کا باعث بن رہا تھا۔ جوج کی کرسی پر مکمل وقار کے ساتھ براجمان تھا۔ سب سے آخر میں سارجنٹ انٹونی میز چھوئے سے کود دکان میں داخل ہوا۔ اس نے بھی حیرت بھری نگاہوں سے نیل اور این کی روجوں کی جانب دیکھا پھر مزید بات کہنے بغیر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ڈونی نے تفصیلی نگاہوں سے دکان میں بیٹھے تمام افراد کا جائزہ لیا۔ پھر گھبر لہجے میں بولا۔

”مقدمے کی روداد“

”مجھے شیل ٹاؤن آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا اور آج یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے کہ میں وقتی طور پر ہی سہی۔ لیکن یہاں پر وقوع پذیر ہونے والے پیچیدہ کیس کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ آپ سب یقین چاہیے کہ مجھے ایسا کرنے کا رتی برابر بھی شوق نہیں۔ لیکن نیل اور این کی روجوں کی بدولت ایسا کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔ وہ اس کیس کے لئے کسی ایسے افراد کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جس کا تعلق شیل ٹاؤن سے کسی بھی صورت میں بھی نہیں ہو رہا ہو۔ ایسا شخص میرے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے میرے ساتھ بات چیت کر کے مجھے معاملے میں مداخلت کرنے کی درخواست کی۔ جسے میں نے صرف انسانیت کے ناطے مجبور ہو کر قبول کر لیا۔ ورنہ میرا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اب ہم کیس کی جانب آتے ہیں۔

میرے دونوں مظلوم ساتھیوں نیل اور این کے دلوں میں ٹاؤن والوں کے خلاف چند غلط فہمیاں موجود ہیں۔ جنہیں میں معاملے کے شروع میں ہی رفاغیہ دفاع کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ آج سے ایک ماہ قبل شیل ٹاؤن کے پاگل خانے میں آگ لگ گئی تھی۔ جس میں بہت سے پاگلوں کے علاوہ نیل اور این

کی موت بھی واقع ہوئی تھی۔ لیکن ٹاؤن کے کسی بھی فرد نے آگے بڑھ کر ان لاچار پاگلوں کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ وہ پہلی غلط فہمی تھی۔ جس کی بنا پر نیل اور این کے دلوں میں نفرت کا جوالہ مکھی پھٹنے لگا۔ اور اس نفرت کی بناء پر ان روجوں نے پندرہ کے قریب انسانوں کی جان لے لی۔ سارجنٹ انٹونی کیا تم اپنا موقف پیش کرنے کی کوشش کرو گے کہ ایسا کیوں کیا۔ یاد رہے۔ موقف ایسا ہونا چاہئے جو نیل اور این جیسی معصوم روجوں کے دلوں میں موجود غلط فہمی کو ختم کر سکے۔“ سارجنٹ انٹونی نے اثبات میں سر ہلایا۔

پھر اپنی کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”شیل ٹاؤن کے پاگل خانے میں جب آگ لگی۔ تب میں وہاں موجود تھا۔ آگ نے اتنی شدت کے ساتھ خطرناک صورت اختیار کی کہ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے آگ جان بوجھ کر اور مٹی کا تیل چھڑک کر لگائی گئی ہو۔ تمام پاگل آگ سے گھبرا کر دوسری منزل پر چڑھ دوڑے۔ ہمارے پاس آگ پر قابو پانے کے لئے مناسب سامان موجود نہیں تھا۔ اس لئے ہم نے قریبی شہر کے فائر بریگیڈ کے عملے کو فون کیا۔ انہیں ٹاؤن تک پہنچنے میں دیر لگی اور یوں عمارت جل کر خاکستر ہو گئی۔ ہم باہر کھڑے ان مظلوم افراد کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکے۔“ سارجنٹ خاموش ہو گیا۔

ڈونی نے تقریبی نگاہوں سے نیل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”نیل ڈیر۔۔۔۔۔ تمہارا اس کیس کے متعلق کیا موقف ہے۔ اگر بتانا چاہتے ہو۔ تب کرسی سے کھڑے ہو کر بتا سکتے ہو۔“

نیل طویل سانس لیتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ پھر نہایت رنجیدہ چہرہ بناتے ہوئے بولا۔ ”ہم اس بات سے بخوبی آگاہی رکھتے ہیں کہ فائر بریگیڈ کی سہولت ٹاؤن میں موجود نہیں ہے۔ لیکن اگر ٹاؤن کے افراد آگ کو بجھانا چاہتے۔ تب یقیناً ایسا کر سکتے تھے۔

ٹاؤن میں پانی کی کمی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اگر وہ دروازے کو توڑ کر پاگل خانے میں داخل ہونے کی کوشش کرتے۔ تب بھی اندر ٹھس کر بہت سے افراد کی جان بچا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ صرف یہ سوچ کر۔۔۔۔۔ کہ مرنے والے پاگل ہیں اور انہیں بچانے کے لئے آگ میں کودنا حماقت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ اس لئے انہوں نے مرنے کے لئے بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔“ نیل خاموش ہو گیا۔

ڈونی نے اس دفعہ سارجنٹ انٹونی کی جانب سنجیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے جواب دینے کی پیشکش کی۔ سارجنٹ بھی سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”ایسا سوچنا بھی تمہاری بے وقوفی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ ہم نے اندر داخل ہونے کی کوشش صرف اس لئے نہیں کی کہ اندر سب پاگل تھے۔ اگر تم بات کو ایسا رخ دینا چاہتے ہو۔ تب مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم نے آگ میں کود کر پاگل خانے کی دوسری منزل پر جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صرف اپنی بیوی کو بچانے کے لئے۔۔۔۔۔ کیا تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔۔۔۔۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکا۔۔۔۔۔ اور بدلے میں تم کو اپنی جان سے ہاتھ دھوئے پڑے۔ وہی پانی سے آگ بجھانے کی بات۔۔۔۔۔ تو اس کا جواب میں پہلے بھی دے چکا ہوں کہ پاگل خانے میں آگ سوچ سمجھ کر اور جان بوجھ کر لگائی گئی تھی جس کی بدولت آگ نے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ شدت اختیار کی اور کچھ ہی دیر میں پاگل خانے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں اس بات کی حقیقت سے بھی آگاہی رکھتا ہوں کہ ایسا کس نے کیا۔ مجھ سے زیادہ اس حقیقت کے بہت سے پوشیدہ معاملوں کے متعلق تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ لیکن یہاں میں صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ ایسا تمہاری بیوی نے اسے انتقامی جذبے کی تسکین کے لئے کیا تھا۔ جس کی پاداش کے لئے بہت سے بے گناہ پاگلوں کو موت کو مجبوراً گلے لگانا پڑا۔ اگر میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ تو کیا تم میرے اس سوال کا جواب دینا چاہو گے کہ تمہاری بیوی نے ایسا کیوں

”کیا؟“

بل غصیلہ لہجے میں بولا۔ ”صرف ایک بچے کے وجود کے حصول کے لئے..... اس تمام معاملے کے پیچھے ایک مانتا کی دلگداز کہانی کے علاوہ مزید اور کچھ بھی نہیں پایا جاتا۔ زندگی تو ختم ہو ہی گئی ہے۔ اس لئے اب جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگلے نام کے بچے کو میں نے ہی اغوا کیا تھا۔ لیکن این کے معصوم فطرت یا پھر پاگل بچے کی بدولت بچہ مر گیا۔ این اس کے مردہ وجود سے دور نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے چپ کر بچے کے وجود کو قبرستان میں لے جا کر دفن کیا۔ لیکن مانتا کی ماری این کو خبر ہو گئی۔ اور اس نے میری غیر موجودگی میں انتقامی جذبے کے تحت پاگل خانے کو آگ لگا دی۔ میں ڈوئی کو پہلے بتا چکا ہوں کہ این کو جیتا جاگتا بچہ چاہئے۔ میں اسے ہر طرح بھلانے پھلانے کی کوشش کر چکا ہوں۔ لیکن مقصد میں کامیاب نہیں ہو پایا۔ اس لئے میں نے تم سے رجوع کیا کہ شاید تم کوئی حل تلاش کر سکو۔ لیکن تم نے بھی معاملے کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور ہم نے کافی سوچ بچار کے بعد انتہائی اقدام اٹھانے کی کوشش کر ڈالی۔“

ڈوئی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور سارجنٹ انھونی کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن وہ انتہائی اقدام بچوں کے اغوا سے متعلق ہے۔ بل کیا تم بتا سکتے ہو کہ بچے اس وقت کہاں ہیں؟“

بل نے اثبات میں سر ہلایا اور جواب دیا۔ ”ٹاؤن سے ہٹ کر جنگلوں کے درمیان پوشیدہ ایک غار میں بچے محفوظ ہیں۔ میں نے اور این نے سردی کا اطمینان بخش انتظام آگ کی صورت میں کیا ہے۔ یقیناً تمہارے دماغوں میں یہ سوال گردش کر رہا ہوگا کہ ہوا پر مشتمل روجوں نے آگ کیونکر روشن کر لی تو اس کا جواب یوں ہے کہ یہ کام ہمارے کہنے کے مطابق بچوں نے خود کیا ہے۔ وہ سب وہاں نہایت اطمینان و سکون سے ہیں۔ ہماری ساتھی روجیں ان کی حفاظت کے لئے غار کے ارد گرد موجود ہیں۔“ ڈوئی نے بچوں

کے والدین کی جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ میں سے کوئی ان سے سوال پوچھنا چاہتا ہے۔ تو پوچھ سکتا ہے۔“ کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ سب خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

پھر ایک آدمی ہمت کر کے کھڑا ہوا۔ اور ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”جناب ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہمارے بچے خوش و خرم جنگل کی غار میں محفوظ ہیں۔ لیکن یہ جان کر افسوس محسوس ہوا کہ اب ہمیں ان سے ملنے کے لئے موضوع اوقات کا انتظار کرنا ہوگا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ ایسی کون سی شرائط ہیں جن پر پورا اترنے کے بعد ہم اپنے بچوں کے حصول کو ممکن بنا سکیں گے۔“

بل نہایت افسردہ لہجے میں بولا۔ ”میں پہلے کئی دفعہ بتا چکا ہوں کہ ہمیں صرف ایک جیتے جاگتے بچے کا حصول چاہئے۔ آپ یقین چاہیے کہ آپ سب کو پریشان کر کے مجھے اور این کو قطعاً خوش محسوس نہیں ہو رہی۔ لیکن میں کیا کروں اپنی بیوی کی محبت کے لئے ہر جائز و ناجائز قدم اٹھانے کے لئے مجبور ہوں۔ اتنا وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ شرائط پوری کرنے کے بعد دوبارہ ٹاؤن کارخ نہیں کروں گا۔“

کمرے میں دوبارہ خاموشی طاری ہو گئی۔ ہر بندہ سوچ و بچار میں گم تھا۔ روجوں کی عجیب و غریب شرائط پر پورا اترنا ان میں سے کسی کے بھی اختیار میں نہیں تھا اور شرط کو پورا کئے بغیر انہیں بچوں کا واپس ملنا بھی ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سب اپنے دماغوں کو ایک عجیب گمن پتھر میں مبتلا محسوس کر رہے تھے۔ پھر اس خاموشی کو ٹاؤن کے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے کھڑے ہوتے ہوئے توڑا۔ وہ کھٹکھٹا کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کی شرائط پر پورا اترنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی میں کوشش کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میرے محدود دماغ کے مطابق اس کے علاوہ مسئلے کا حریز حل دستیاب

نہیں ہو سکتا کہ تمام ٹاؤن میں سے کوئی ایسا گھر نہ قربانی دینے کے لئے تیار ہو سکے۔ جس کے گھر میں دودھ پیتے بچے کے علاوہ مزید بچوں کی زیادہ تعداد موجود ہو۔ اور وہ اپنا دودھ پیتا بچہ این کے سپرد کر کے روجوں کی شرائط پر پورا اترنے کے بعد ٹاؤن والوں کے بچوں کی بازیابی کا باعث بن سکے۔“

ڈوئی نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر سامنے بیٹھے ہوئے چندہ کے قریب ٹاؤن کے افراد کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہاں کوئی ایسا شخص موجود ہے جو قربانی دینے کے لئے بچوں کی رہائی کا باعث بن سکے؟“ کمرے کے ماحول میں دوبارہ گھمبیر خاموشی طاری ہوتی چلی گئی۔ اس دفعہ سارجنٹ انھونی سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”یہ ایک ناممکن بات ہے۔ کوئی بھی ماں اپنے دودھ پیتے بچے کو اپنے وجود سے جدا نہیں کر سکتی۔ اگر اس بات کا یقین بھی دلا یا جائے کہ بچے کی نگہداشت اور مستقبل پر کسی بھی قسم کی آنچ نہیں آنے پائے گی۔ تب بھی کوئی ماں ایسا قدم اٹھانے سے پہلے سوچے بغیر انکار کر دے گی۔ یہاں تو معاملہ ہی مختلف ہے۔ نگہداشت اور رہنے کا کام ایک ایسی سوچ کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ جو ٹھوس اجسام کو چھونے کے بھی قابل نہیں ہے۔ یقیناً بچہ کچھ ہی دنوں میں موت کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

ڈوئی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”میرے خیال کے مطابق این سے بہتر ماں اور کوئی بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔ رہی ہوا پر مشتمل روح ہونے کی بات..... تو وہ ٹھوس اجسام بخوبی اختیار کر سکتی ہے۔ اور ٹھوس جسم میں منتقل ہونے کے بعد بچے کی بہترین پرورش کر سکتی ہے۔“

سارجنٹ انھونی نے طنزیہ نگاہوں سے ڈوئی کی جانب دیکھا۔ پھر گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

”فرض کرو۔ اگر تمہاری دودھ پیتی اولاد ہو۔ تو کیا تم قربانی کی بھیجٹ چڑھانے کے لئے اسے این کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہو گے۔“

”شاید.....“ ڈوئی نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔ ”اگر مجھ پر ایسا وقت آتا۔ تو میں اتنے لوگوں کی خوشی کی خاطر قربانی دینے کے لئے بخوشی اختیار ہو جاتا۔“

سارجنٹ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”اگر تمہاری اولاد ہوتی۔ تب تم یقیناً انکار کر دیتے۔ چونکہ نہیں ہے اس لئے تم ہیرو بننے کے لئے ایسا کہہ رہے ہو۔ بہر کیف تم ٹاؤن کے باقی افراد سے بھی مسئلے کے حل کے لئے بات چیت کر سکتے ہو۔ مجھے مکمل یقین ہے کہ کوئی بھی ماں اپنے دودھ پیتے نخت جگر کو روجوں کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگی۔“

بل اور این کو اپنی شرائط کے متعلق سوچ و بچار کرنی چاہئے۔ یہ ناممکن بات ہے۔“ ڈوئی نے طویل سانس لیتے ہوئے بل اور این کی جانب دیکھا۔ پھر مت بھرے لہجے میں بولا۔

”کیا ایسا ممکن ہے کہ تم دونوں اپنی شرط میں رد و بدل کر دو۔ تم ٹاؤن کے کسی بھی گھر میں موجود دودھ پیتے بچے کی جانب اشارہ کر دو۔ ہم ان گھر والوں سے اجازت لے کر تمہیں بچے کے پاس آنے کی اجازت دلوادیں گے۔ تم دن کے کسی بھی پہر وہاں آ کر بچے کے ساتھ اپنا دل بہلا سکو گے۔ میرے دماغ میں اس مسئلے کا اس سے بہتر مزید حل موجود نہیں ہے۔“

این نے انکار میں سر ہلانا شروع کر دیا۔ پھر استہزاء سے لہجے میں بولا۔

”ایسا ممکن نہیں ہے بچہ بلا غیر و شرکت چاہئے۔ میں اس معاملے میں کسی دوسرے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ تمہیں مزید کچھ سوچنا ہوگا۔“

ڈوئی نے ہار مانتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”آخری حل“ کمرے کے ماحول میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر ڈوئی گلے کو کھٹکھٹاتے ہوئے بولا۔

”میرے دماغ میں مزید اور آخری حل موجود ہے۔ اگر قابل قبول نہیں ہوا۔ تب شاید میں ہار مان لوں

گا۔“ بچوں کے والدین سارجنٹ انٹونی اور دونوں روٹیں بے چین نگاہوں سے ڈوئی کی جانب دیکھنے لگیں۔ ڈوئی مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہمیں کسی ایسی موت کا انتظار کرنا ہوگا۔ جس میں مرنے والا دودھ پیتا پچتا ہو اور اس کی موت قدرتی طور پر واقع ہوئی ہو۔ یاد رہے ہمیں صرف ایک نسخہ منے اور مردہ وجود کی ضرورت ہے تاکہ اس کے جسم میں کوئی بھی روح گھس کر اسے جیتے جاتے بچے کی صورت مہیا کر سکے۔ صرف تھوڑے سے انتظار کی ضرورت ہے۔ اگر ہم سب مل کر این کی روح سے درخواست کریں۔ تب شاید وہ ہمیں اتنی مہلت دے کہ ہم پراسان کرے۔ اور ہمیں کچھ وقت دے کر شرط پوری کرنے کے لئے انتظام کرنے کا موقع دے۔“ سارجنٹ انٹونی اچانک ہی چنگی بجاتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ پھر پر جوش لہجے میں بولا۔ ”انتظار کی مہلت مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری قسمت ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ ٹاؤن میں کل ہی ایک دودھ پیتے بچے کی موت واقع ہوئی ہے۔ میرے خیال میں سر دی کی بدولت لاش ابھی گلی نہیں ہوگی۔ ہم با آسانی قبر کھود کر لاش کو حاصل کر سکتے ہیں۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ ڈوئی مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”ہم ابھی قبرستان کا رخ کرتے ہیں تاکہ لاش کو خراب ہونے سے پہلے وہاں سے نکال کر دکان میں لایا جاسکے۔ لیکن اس سے پہلے میں بل سے پوچھنا چاہوں گا کہ کیا ایسا ممکن ہے۔ گزشتہ روز میں نے یہاں دکان میں موجود روحوں کے نجوم میں چند ایسے بچوں کی روٹیں بھی دیکھی تھیں۔ ان میں سے کوئی لاوارث بچے کی روح ہمارے حاصل کردہ مردہ وجود میں گھسنے کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یوں ہمارا مسئلہ حل طلب صورت اختیار کر سکتا ہے۔“ ٹل نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

”ایسی لاوارث بچے کی روح ہمارے درمیان موجود ہے اور میرے خیال میں وہ با آسانی مردہ بچے

کے وجود میں بھی گھس سکتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ بچے کے جسم کو مکمل تازہ ہونا چاہئے۔“

ڈوئی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”پھر ہمیں جتنی جلدی ممکن ہو۔ قبرستان کا رخ کرنا چاہئے۔ میرے خیال میں بچے کی لاش کو چھوٹے تابوت میں بند کر کے دفنایا گیا ہوگا۔ اگر ایسا ہوا۔ تب یقیناً بچے کی لاش اچھی حالت میں دستیاب ہو جائے گی۔“

سارجنٹ بولا۔ ”وہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ انہوں نے بچے کو چھوٹے تابوت میں بند کر کے دفنایا تھا۔ پھر بھی ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے اور جلد از جلد لاش کو نکال کر دکان میں لے آنا چاہئے۔“ ڈوئی نے اثبات میں سر ہلایا اور سارجنٹ انٹونی بچوں کے والدین کے ہمراہ دکان سے باہر نکل کر قبرستان کی جانب چل دیا۔

”لاش کا حصول“

اس رات مطلوبہ بچے کی لاش دستیاب نہ ہو سکی۔ جس بچے کی لاش قبر کھود کر باہر نکالی گئی۔ اس کی لاش کے کچھ حصے گلے سڑنے لگے تھے۔ اس لئے اسے تابوت میں ڈال کر دوبارہ دفن کر دیا گیا۔ لیکن پھر دوسرے دن شام کے وقت ایک ایسے بچے کی لاش دستیاب ہوئی گئی۔ جو ناقص صحت مند تھا بلکہ لاوارث ہونے کے علاوہ اس کی لاش تازہ بھی تھی۔ ڈوئی کی دکان میں ایک دفعہ پھر سارجنٹ انٹونی اور بچوں کے والدین کو بلایا گیا۔ این اور ٹل کی روح کے علاوہ وہاں ایک ایسے بچے کی روح بھی موجود تھی۔ جس کی عمر کم و بیش چھ سات سال کے قریب تھی۔ ٹل کے کہنے کے مطابق مطلوبہ بچے کی لاش کو ایک بڑی میز کے اوپر رکھ دیا گیا۔ اب ٹل اور چھ سالہ بچے کی روح کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ مذاکرات کا یہ سلسلہ سرگوشیوں پر مشتمل تھا۔ اس لئے دکان میں موجود باقی افراد کچھ بھی سننے یا سمجھنے نہیں پائے۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ٹل بچے کو

دودھ پیتے بچے کے مردہ جسم میں گھسنے کی ترغیب دے رہا ہوگا۔ گفت و شنید کا یہ سلسلہ تقریباً پانچ منٹ تک مسلسل تواتر کے ساتھ جاری رہا۔ پھر ٹل کی روح نے اثبات میں سر ہلانا شروع کر دیا۔

ٹل نے ڈوئی کی جانب دیکھتے ہوئے خوشخبری سنائی۔ اور پیشوں کے آگے بھی پردے سرکادیے جائیں۔“

ڈوئی نے لائٹ آف کر دی جبکہ سارجنٹ نے پیشوں کے آگے پردے سرکادیے۔ دکان میں ملگجھا اندھیرا پھیلنا چلا گیا۔ اب وہاں موجود تمام افراد بلکہ سالیوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ٹل دوبارہ بچے کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔ پھر اس نے بچے کی روح کو اٹھا کر میز کے اوپر بیٹھا دیا۔ وہاں مردہ بچے کی لاش موجود تھی۔ بچے کی روح نہایت آہستگی کے ساتھ مرے ہوئے بچے کی لاش کے اوپر لیٹ گئی اور حیرت انگیز طور پر اپنے جسم کو کم کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دودھ پیتے بچے کی جسامت اختیار کر چکی تھی۔

اس کے فوراً بعد دکان کا ماحول نسخے منے بچے کے رونے کی آواز سے گونج اٹھا۔ این کی روح بے اختیار آگے بڑھی اور اس نے بچے کو اٹھا کر گلے سے لگانے کی کوشش کی۔ لیکن مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ صرف ہوا میں ہاتھ ہلا کر رہ گئی۔

ڈوئی نے آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹ آن کر دی۔ ماحول یکدم روشن ہوا اور وہاں موجود تمام افراد کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب دیکھنے کے قابل ہوئیں۔ تب انہوں نے حیرت انگیز منظر دیکھا۔ دکان کے درمیان سانتا کلازا اور بوڑھی عورت کا مجسمہ موجود تھا۔ بوڑھی عورت میز پر لیٹے ہوئے بچے کو سینے سے لگائے چوم رہی تھی۔ منظر رفت آ میز تھا۔ بہت سے ٹاؤن والوں کی آنکھیں آنسوؤں کی بدولت جھلملائے لگیں اور وہ رومال سے آنکھیں پونچھنے لگے۔

ڈوئی نے طویل سانس لیتے ہوئے سارجنٹ کی

جانب دیکھا۔ پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آخر کار ہم مقصد میں کامیاب ہو ہی گئے۔ میرے خیال میں کل صبح ٹاؤن والوں کے بچے بھی ٹاؤن واپس پہنچ جائیں گے۔ پھر ٹاؤن والوں کی کرسی کی خوشیاں دوبالا ہو جائیں گی۔“

سارجنٹ بولا۔ ”تم ٹل سے بات چیت مکمل کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بچوں کو واپس کرنے سے مکر جائے۔ اگر ایسا ہو گیا۔ تب ہمارے لئے مزید مشکل پیدا ہو جائے گی۔“

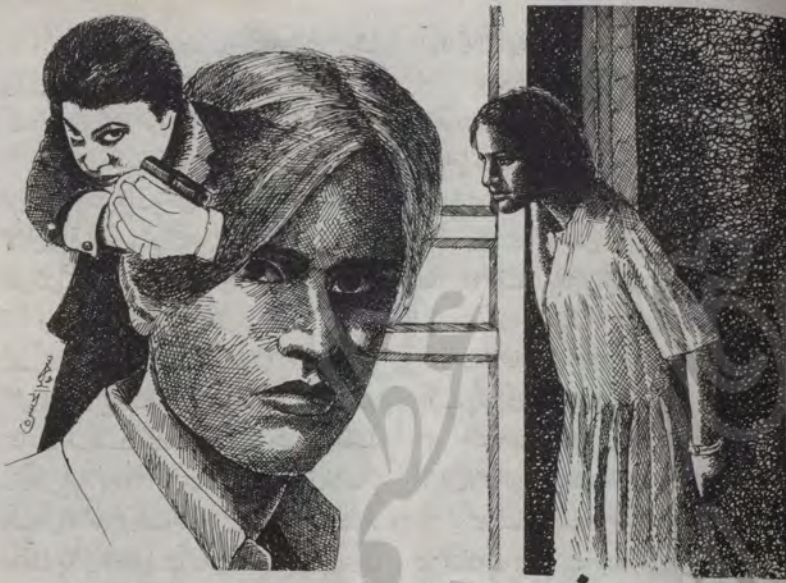
ڈوئی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور این کے پاس کھڑے خوشی سے معمور چہرہ لئے ٹل کی جانب چل دیا۔ ٹل نے اسے اپنی جانب آتے دیکھا۔ تب بولا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم بچوں کے لئے پریشان ہو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری ساتھی روٹیں بچوں کے ہمراہ ٹاؤن میں داخل ہونے والی ہیں۔ آج ٹاؤن والے دوبارہ کرسیاں منائیں گے۔ جس میں ہم بھی شرکت کریں گے۔“ ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہو پائی تھی کہ باہر بازار بچوں کے شور اور پٹاخوں سے گونج اٹھا۔

ٹاؤن کے لوگوں اور سارجنٹ انٹونی نے گھبرا کر باہر کی جانب دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن دروازوں اور کھڑکیوں پر لگے پردوں کی بدولت باہر نہیں دیکھ سکے۔

ٹل نے ہاتھوں میں موجود پتول کا رخ دکان کی چھت کی جانب کر کے ٹریگر کو دبا دیا۔ دھماکے کے ساتھ رنگ برنگے شعلے دکان کے اندر پھیلنے چلے گئے۔ اس نے پٹی کرسی کا نعرہ لگایا اور کمر پر لا دے ہوئے سرخ رنگ کے تھیلے کو اٹھائے دکان کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ٹاؤن کے لوگ جوق در جوق بازار کا رخ کر رہے تھے۔ ایسا تقریباً ڈیڑھ مہینے کے بعد ہو رہا تھا کہ لوگ رات ہونے کے باوجود گھروں سے باہر نکل کر بازاروں کا رخ کرنے کی جستجو میں تھے۔ ٹل سانتا کلازا



فرار

ناصر محمود فرار۔ فیصل آباد

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر سو مسلط تھا کار کے انجن کی آواز قریب آتی جارہی تھی مگر ابھی تک کار کی روشنیاں نظر نہیں آ رہی تھیں کہ اچانک روشنیاں نظر آتے ہی گولیوں کی تڑتڑاھٹ سے پورا علاقہ گونج اٹھا اور پھر اچانک ایک ہولناک منظر سامنے آیا۔

مغرب کی فضاؤں میں جنم لینے والی ایک تیراگیز حیرت انگیز لرزہ براندام کرتی کہانی

میں نغمے گنٹاری تھی۔

میں نے ڈیش بورڈ میں لگی روشن گھڑی کی طرف دیکھا تو پتہ چلا کہ رات کے سوا گیارہ بج رہے تھے۔ میں اس وقت سنانا آلتا کے دامن کے قریب پہنچ چکا تھا جب کار کے ریڈیو پر بچتی موسیقی یکبارگی غیر متوقع طور پر ختم گئی اور نیوز کاسٹر کی آواز ابھری۔ اس وقت میری نظر سب سے سڑک پر پڑی سفید لکیر پر گاڑی کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں جمی ہوئی تھی میں نے ریڈیو کی طرف دیکھے بغیر ایک ہاتھ بڑھا کر ریڈیو کی آواز بند کر دی۔

میں گزشتہ دو گھنٹے سے سڑکوں پر کار کو آوارہ دوڑا رہا تھا۔ اب میں پہاڑی علاقے سے تقریباً نکل آیا تھا اور نیچے وادی میں مجھے چھوٹے سے قصبہ سنانا آلتا کی روشنیاں بھی نظر آنا شروع ہو گئی تھیں۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ سیاہ سیدان کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی ایسی حسین کی طرح بل کھاتی، بھراتی، چمکتی سڑک کے بل یہاں آ کر ٹکٹل گئے تھے اور وہ اب بالکل سیدھی ہو چکی تھی۔ میرے پاؤں کا دباؤ ایک سیلیٹر پر بڑھتا جا رہا تھا۔ بے ہوشی سرسراتی ہوا میرے کانوں

کے وجود میں کمر پر موجود کھلونے سے لدے ہوئے تھیلے کے ساتھ بچوں میں کھلونے تقسیم کر رہا تھا۔ کچھ منچلوں نے آتش بازی کے سامان سے بھرے ہوئے تھیلے بچوں کو تھمانے شروع کر دیئے اور پھر آسمان رنگ برنگی روشنیوں سے منور ہونے لگا۔ اس تمام ہجوم کے درمیان میں بچے کو اپنے سینے کے ساتھ لگائے نہایت خوش و شادمان کی۔

ڈونی سارجنٹ کے ہمراہ دکان کے برآمدے میں کھڑا لوگوں کے ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پر سوچ کی لکیریں نمودار تھیں۔ سارجنٹ انھونی کی نگاہوں میں خوشی و اطمینان کا تاثر تھا۔ ڈونی خوابیدہ لہجے میں سارجنٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”کیا ہم نے ایسا کر کے صحیح کیا ہے؟ مجھے نہیں لگتا کہ ہمارا خدا ہم سے خوش ہوگا۔ ہم نے مکمل خود غرضی کے ساتھ صورت حال کو اپنے حق میں ڈھالنے کے لئے نہایت چالاکی سے کام لیا ہے۔ لیکن کسی اور کی زندگی کا خیال نہیں کیا۔“

سارجنٹ بولا۔ ”میری رائے تم سے مختلف ہے۔ بہت سے لوگوں کی خوشیوں کے لئے اگر کسی ایک ننھے ننھے وجود کے جسم کی قربانی دے دی جائے۔ تب میرے خیال میں خدا ہم سے ناراض نہیں ہو سکتا۔ اور پھر ہم نے ایسا اپنی غرض کے لئے نہیں کیا بلکہ دوسروں کی خوشیوں کے لئے کیا ہے۔ اگر نہ کرتے تو بچوں کی دستیابی کے علاوہ قتل و غارت کا نہ رکھنے والا سلسلہ چلتا رہتا۔ جس میں ایسے کئی اور بچے قربانی کی جھینٹ چڑھ جاتے۔“

ڈونی سر دھڑک کر بولا۔ ”لیکن ہم نے جس ننھے ننھے وجود کو قربانی کی جھینٹ چڑھانے کے لئے استعمال کیا ہے۔ وہ لاوارث اور یتیم وجود تھا۔ وہ تو ہماری ہمدردیوں اور حسن سلوک کا حقدار تھا۔ لیکن ہم نے اسے اپنی خود غرضی کے لئے استعمال کیا۔“

”جیسا تم سوچ رہے ہو۔ ایسا نہیں ہے۔“

سارجنٹ جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیا بل کی



اس کو دیکھنا ممکن نہ تھا۔

کار کا انجن اور روشنیاں بند کر دیں اور نیچے اتر آیا۔
باہر قدرے ٹھنڈک تھی۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی اور آسمان
پر پورا چاند چمک رہا تھا مگر اس وقت وہ کالے بادلوں کے
ایک بڑے سے ٹکڑے کے پیچھے چھپ رہا تھا۔

کار سے اتر کر میں سڑک پر آیا، اس کو پار کیا
اور دوسری طرف آ گیا۔ اس طرف کھلے میدان میں کہیں
کہیں چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں ان کے پیچھے ایک
خطرناک ڈھلوان تھی جو تقریباً پینتالیس درجے کے
زاویے پر نیچے کی طرف جاری تھی۔

میں میدان کے سرے پر اتر کر گیا۔ سڑک کا
موڑ اس ڈھلوان کے ساتھ ساتھ گھوم رہا تھا۔

میرے اندازے اور اطلاع کے مطابق وہاں نیچے
میرین کو موجود ہونا چاہئے تھا۔ وہ وہاں درختوں کے چھنڈ
میں چھپی ہو سکتی تھی۔

میں نے میدان کو پار کیا، تیزی سے چلتے ہوئے
میری نظریں زمین پر جمی ہوئی تھیں، میں نے ڈھلوان
پر اترنا شروع کر دیا۔ میرا دل میرے سینے میں اچھل رہا تھا۔
میں کافی دن بعد میرین سے ملنے والا تھا۔

میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا نیچے اتر رہا تھا
مگر اس سے پہلے کہ میں ڈھلوان کے نیچے پہنچتا، میں پھسل
کر گر پڑا۔ خوش قسمتی سے کوئی چوٹ نہ لگی کیونکہ وہاں زمین
نرم تھی۔ میں کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی جیب کو ٹوٹل
کر پستول کی موجودگی کا یقین کیا اور مطمئن ہو گیا۔

سڑک اوپر سے گھوم کر ڈھلوان کے ساتھ ساتھ
نیچے آ گئی تھی۔ اس وقت یہ سڑک دور دور تک خالی نظر آ رہی
تھی۔ یقیناً میرین کی کار وہاں سڑک کے کنارے درختوں
کے چھنڈ میں تھی۔

میں چند قدم دبے پاؤں چل کر درختوں کے چھنڈ
کے قریب آ گیا وہاں سے مجھے ایک کار نظر آ رہی تھی۔ میں
نے دور سے کار کے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ کار کے
اندر ڈرائیورنگ سیٹ پر ایک سایہ نظر آیا۔ مگر اندھیرے
اور فاصلے کے باعث کہنا مشکل تھا کہ وہ میرین تھی یا کوئی

”کئی آدمیوں کے قاتل اور مفروضہ قیدی فریک
وارز کی تلاش پوری ریاست میں جاری ہے۔ پولیس اس
کے پیچھے ہے۔“ اناؤنسر کہہ رہا تھا۔

”وارز جس پر بینک ڈکیتی کا الزام ہے آج سہ پہر
اس نے کولن میں ایک پولیس افسر کو گولی ماری اور چوری کی
گاڑی میں فرار ہو گیا۔ یہ افسر اسے ایک جیل سے دوسری
جیل میں منتقل کر رہے تھے۔ پولیس کا خیال ہے کہ وہ سائنٹا
آلٹا کی طرف جانے گا جہاں اس کی بیوی رہائش پذیر
ہے۔ کیونکہ پولیس کی اطلاع کے مطابق مسز وارز جس کا
اصل نام ”میرین“ ہے اپنے گھر سے غائب ہو چکی ہے
۔ غائب ہونے سے پہلے اس نے اپنے بینک کے کھاتے
سے تقریباً چار ہزار ڈالر نکلائے تھے۔ یہ تقریباً وہی وقت تھا
جب اس کا شوہر فریک وارز پولیس کی حراست سے فرار
ہوا تھا۔ پولیس کا خیال ہے کہ اس کا کسی طرح اپنی بیوی
سے رابطہ تھا اور وہ اس کے فرار سے آگاہ تھی۔ وارز سچ ہے
اور وہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ سائنٹا آلٹا کے رہائشیوں
کو شورش دیا جاتا ہے کہ۔۔۔“

باقی اعلان پر میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ میرے
ہاتھ اسٹیرنگ ڈیل پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے مگر میں
اپنے کوٹ کی جیب میں پستول کا بوجھ پوری طرح محسوس
کر رہا تھا۔

”سائنٹا آلٹا“ کی حدود میں داخل ہوتے ہی میں
نے اپنی کار کی رفتار دھبی کر دی۔ اس وقت میں دریا کے
کنارے صنعتی علاقے سے گزر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں
تھبے کو جانے والی سڑک پر آ گیا جو ایک طرف کو پہاڑوں
کے دامن میں سے گزرتی تھی۔

میں اس سڑک پر تقریباً سات میل تک چلتا چل
گیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے ایک اور چھوٹی ذیلی سڑک ایک
طرف کھڑتی دکھائی دی۔ میں نے کار کو اس سڑک پر
موڑ دیا۔ اس ٹکڑے سڑک پر تقریباً ایک میل آگے جا کر سڑک
اک دم مڑ گئی تھی یہ ایک خطرناک موڑ تھا میں نے اس سے
پہلے ہی سیڈان کو ایک طرف روک لیا اور وہاں ایک طرف
گئے درختوں کے بیچ اس طرح چھپادی کہ بادی انظر میں

اور۔۔۔

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس
کار کی طرف آگے بڑھنے لگا۔ میرا ایک ہاتھ محتاط انداز میں
جیب میں موجود پستول پر تھا۔

وہاں درختوں کے بیچ گھسی جھاڑیاں تھیں میں ان
کے اندر دیک گیا۔ کار مجھ سے تقریباً پندرہ فٹ دور تھی۔
اب میں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا کہ کار کے اندر میرین ہی
تھی۔ وہ ڈرائیورنگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔

میں چند لمحے خاموشی سے جھاڑیوں میں دیکھا رہا۔
چاروں طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور مجھے صرف
چینگیروں کے گانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد میں نے دھیرے سے اپنا سر اٹھایا اور ہلکی
آواز میں سرگوشی کے انداز میں میرین کو پکارا۔ اس نے
شاید میری آواز سن لی نہیں کیونکہ اس کی طرف سے کوئی جواب
نہ ملتا ہی اس نے کوئی حرکت کی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے
دوبارہ پکارا اس دفعہ میری آواز قدرے اونچی تھی۔ آواز سننے
ہی اس نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور بے تابانی سے
اپنے پاس دیکھا وہ میری آواز پہچانتی تھی۔

”ڈارلنگ!۔۔۔ اوه میرے خدا!۔۔۔ میں سمجھی تم
نہیں آؤ گے۔“ وہ بے تابانی سے بولی۔ اس کے انداز میں
گھبراہٹ صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

”کیا تم تنہا ہو۔۔۔؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔
میں نے جواب میں اس کے سر کو اثبات میں ہلٹے
دیکھا۔ سر ہلانے کے سبب اس کے سنہری بال اک
انداز دلربائی سے ہلے۔

”ہاں۔۔۔ میں بہت خوف زدہ ہوں۔ یہاں
صرف تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ تھوڑی دیر بعد اس کے
ہونٹوں سے سرگوشی برآمد ہوئی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اب
میں آ گیا ہوں۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔“ میں نے
اسے تسلی دی۔

”مگر۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی کیونکہ کہیں
سے ایک ہلکی سی آواز ابھری تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک دم کھٹکے کی آواز سنائی دی
تو میں چونکا ہو گیا۔

”یہ کیا۔۔۔؟“ میرین نے گھبرا کر پوچھا۔
”سنو۔۔۔“ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ
کرتے ہوئے اپنے کان آواز کی سمت لگا دینے۔

دور سے آتی ہوئی آواز اب بلند ہوتی جا رہی
تھی۔ یہ ایک کار کے انجن کی آواز تھی جو سڑک کے اوپری
حصے سے آرہی تھی۔ اس طرف سے جدھر سے میں آ رہا تھا
اور جہاں میں نے اپنی کار چھپائی تھی۔ میں بھی جانتا تھا
ایک یادو میل آگے جا کر یہ ذیلی سڑک بڑی شاہراہ سے
مل جاتی تھی۔

میرین نے بھی کار کے انجن کی آواز سن لی تھی۔
میں اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا وہ پیلا پڑ رہا تھا اور اس کی
آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ان میں خوف درآ رہا تھا۔ وہ بری
طرح گھبرا گئی تھی۔

”میرین۔۔۔“ میں نے اسے سرگوشی میں
پکارا۔ ”مت گھبراؤ، خاموشی سے بیٹھی صرف سامنے
دیکھتی رہو، تم سمجھ رہی ہونا۔۔۔۔۔“

چند لمحے بعد وہ الٹی ہوئی آواز میں بولی۔
”ہاں۔۔۔۔۔“

کار کے انجن کی آواز قریب آتی جا رہی تھی
مگر ابھی تک کار کی روشنیاں نظر نہیں آئی تھی۔ پھر یہ آواز
بھی معدوم ہو گئی۔

میں نے اپنا پستول ہولسٹر سے نکال کر اس
کو سیدھے ہاتھ میں تھام لیا اور خود جھاڑیوں میں اچھی طرح
چھپ گیا۔ میری نظریں میرین کی کار پر جمی تھیں۔

وقت رک سا گیا تھا۔ میرے پیٹ میں ہلچل
ہونے لگی تھی۔ میری آنکھیں اندھیرے میں کسی حرکت
کو دیکھنے کے لئے بالکل تیار تھیں۔ مگر وہاں کچھ نہ تھا۔

اچانک مجھے چٹوں کے چرمرانے کی بہت ہلکی سی
آواز سنائی دی۔ کوئی میرین کے کار کے عقب میں تھا جہاں
شاہ بلوط کا ایک بڑا سادرخت تھا۔ میں نے اپنی نگاہیں اس
درخت کی طرف جمادیں۔ وہاں ایک سایہ حرکت کر رہا تھا



موکل کا کرشمہ

رفعت محمود۔ پٹنہ لہور اور لپنڈی

اچانک کمرے میں ایک موکل نمودار ہوا اور بولا۔ جیسی گندی کھیتی کی خواہش تو نہ کی ہے ویسے ہی پہل تجھے ملیں گے۔ تجھے دولت ملے گی، پر تعیش زندگی گزارے گا مگر پل پل مرتا بھی رہے گا کیونکہ کوئی بھی قانون قدرت سے بچ نہیں سکتا۔

حرص و لالچ کی ایک عجیب و غریب ذہن پر نقش ہونے والی پراثر اور سبق آموز کہانی

اور آنکھیں کھلیں مگر اب کیا ہو سکتا تھا جب چڑیاں چک گئیں کھیت۔ نہ کوئی لیاقت تھی نہ سلیقہ تھا۔ جسم محنت مشقت کا عادی نہ تھا تو کمری لیتی تو کس بنا پر۔ اور اگر مل بھی جاتی تو پرانی تابعداری کون کرتا۔ شرافت کا جھوٹا غرور انسان کو ہستی کی طرف لے جاتا ہے۔ انسان اپنی ہستی کو سمجھے لے اور پرانی کہانیاں بھول جائے تو پھر عمارت تعمیر ہو جاتی ہے لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا دولت اور عیش کا ارتقا ہوا نشہ ساری زندگی کو برباد کر دیتا ہے اور ان کی جگہ سستی کا بلی اور کم ہمتی پیدا ہو جاتی ہے عالم اسباب میں زندگی بسر کرنے کی قابلیت نہیں رہتی۔

سلیم جدی ہشتی امیر تھا۔ بچپن سونے چاندی کے چمچوں سے کھاتے پیٹے گزرا۔ دولت اس کے لئے بے معنی تھی۔ جوان ہوا تو باپ دادا کا پیسے بے فضول اڑایا تنگ بازی، سرخ بازی اور کوئی بازی ایسی نہ تھی جس کا اسے شوق نہ ہو، کی صدیوں کا بنا ہوا گھر تھا بگڑتا معلوم نہ ہوا۔ اپنی کمائی ہوتی تو خرچ کرتے ہوئے کچھ خیال بھی آتا۔ مال مفت دل بے رحم۔

آخر کہاں تک! پرانی امیری ٹھیکروں میں دم توڑنے لگی زیور گئے گھوڑے نیل سب پرانی پھر گیا مکان جوکل سرا کہلاتا تھا رشتہ داروں نے خرید لیا۔ ہوش آیا

اپنے ہاتھ کے ساتھ چپکالیا۔
”کیا یہ.....؟“ اس نے سوالیہ انداز میں سرگوشی کی۔

”ہاں.....“ میں نے جواب دیا۔
میرین کے ہاتھ مضبوطی سے میری کمر پر جم گئے اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس نے بلکنا شروع کر دیا تھا۔

”میں نہیں جانتی میں تمہیں پہلے خبردار کیوں نہیں کر سکی.....“ وہ ہچکیوں میں بولی۔ ”اگر مجھے وقت مل جاتا تو میں تمہیں فون پر اطلاع دے دیتی.....“
”سب ٹھیک ہے میرین.....!“ میں نے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔ ”سب ٹھیک اور وقت پر ہو گیا۔“
”..... جب اس نے مجھے فون کیا تو میں خوف زدہ تھی۔ پھر میں نے اس کے کہنے پر مجبوراً سب کام کیا۔

پینک سے رقم نکلائی اور یہاں آگئی اور تہا را انتظار کرنے لگی۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس کے کہنے پر عمل نہ کیا تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ اس نے کہا.....“

”آرام سے ہنسی.....“ میں نے اس کو تسلی۔
”..... اب تو سب ختم ہو گیا۔ اب حالات ہمارے قابو میں ہیں۔“

”اوہ..... ہاں.....“ میں نہیں جانتی میں نے پچھلے چند مہینے کیسے گزارے۔ اگر میں تم سے نہ ملتی تو..... میں نہیں جانتی تھی وہ جب واپس آئے گا تو.....“

میں نے بے تابی سے اس کا بوسہ لیا۔ پھر ہم وہاں واپس آئے جہاں میری کاررکی ہوئی تھی۔ ہم فرنٹ سیٹ پر اکٹھے بیٹھ گئے پھر میں نے اپنی کار کے ڈیش بورڈ کے نیچے سے وائرلیس فون اٹھایا اور پولیس ہیڈ کوارٹر فون ملانے لگا۔
”میں FBI کا اسپیشل ایجنٹ بول رہا ہوں۔“ رابطہ ملنے ہی میں بولا۔ ”تم لوگ فریک وارڈ کی تلاش ختم کرنے کا اعلان کرو۔ وہ مر چکا ہے۔“



اور بلی کی مانند دبے پاؤں آگے بڑھ رہا تھا۔
میری انگلیاں پستول کے ٹریگر پر دبے کو بے تاب تھیں۔

اسی لمحے چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا اور مجھے وہ سایہ صاف نظر آنے لگا۔ وہ ایک جگہ بے حس و حرکت جم کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آگے کی طرف پھیلا ہوا تھا جیسے وہ کسی کا نشانہ لے رہا ہو۔ پھر وہ ایک قدم بڑھا کر آگے آیا اور میرین کی کار کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ وہ عقب سے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ رہا تھا۔

چاند کی چمکتی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اور میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں ایک آٹومیٹک گن تھی۔

میری سانس رک گئی۔ میں آنے والے کو روک نہیں سکتا تھا۔ مگر جوئی وہ تھوڑا اور آگے آیا میں اپنے قدموں پر اچھلا اور اپنی بندوق تانتے ہوئے چیخا۔

”رک جاؤ..... جہاں ہو وہیں رک جاؤ.....“
میری آواز سن کر وہ بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور اس کی پستول کی نالی سے شعلہ اگلا۔ گولی میرے قدموں سے چند انچ دور زمین سے نکل گئی۔

روغل میں یکے بعد دیگرے میں نے دو فائر کر دیئے۔

گولیوں کی آواز سن کر میرین ہذیبانی انداز میں چیخنے لگی۔ آنے والا نیچے زمین پر گر گیا اور میرین کی کار کے پچھلے پہیوں کی طرف لڑھکے لگا وہ شاید چھپنا چاہتا تھا۔ اس کی گن اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی اور پھر وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے ایک جست لگائی اور سیدھا اس تک پہنچا۔ گٹھنوں کے بل اس پر جم کھڑا اور پناہ ایک ہاتھ اس کی چھائی پر رکھا۔ اس کی سانس رک چکی تھی۔

میں اوپر اٹھا، اس دوران میرین بھی دروازہ کھول کر کار سے اتری اور میری طرف بھاگی۔ آتے ہی میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ میں اس کے جسم کی کچکپاہٹ صاف محسوس کر سکتا تھا اس لئے میں نے اس کو مضبوطی سے

کیسی کی تلاش میں خاک چھانتا ہے یا دنیا طلبی میں قدرت کی پوشیدہ طاقت کو قابو کرنے میں زندگی برباد کرتا ہے تاکہ عالم وقت زمین میں جیسے خزانے اگل دے کوئی موکل روزانہ ایک اچھی رقم دے جایا کرے۔

لیکن بد نصیب یہ نہیں جانتا کہ پوشیدہ دولت کے خزانے اور دست غیب صرف محنت، بلند خیالی کسب حلال میں پہناتے ہیں۔ ایسے ناکارہ اور قانون الہی کی خلاف ورزی کرنے والے تو ساری زندگی بھٹکتے رہتے ہیں۔

سلیم نے بھی پوشیدہ طاقت کو قابو کرنے کے لئے کوششیں کرنی شروع کر دیں۔ دن اور رات محرابوں پر فاتحہ پڑھنے، درگاہوں میں چلے کرنے، عاملوں، فقیروں اور درویشوں کی تلاش میں مہینے گزرنے لگے۔

سلیم کو یقین تھا کہ اگر کوئی وظیفہ یا موکل پوری شرطوں کے ساتھ ہاتھ آگیا تو پوری دنیا کا بادشاہ بن جاؤں گا۔ یہ بھی نہ ہوسکا تو کم از کم دست غیب تو کہیں گیا ہی نہیں۔

خدا کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف خواہش اور احکامات کو درہم برہم کرنے کی کوشش سنگین جرم اور ناقابل معافی گناہ ہے۔ اس کا رحم و کرم آڑے نہ آجائے تو ایسے لوگ سزا کے حق ہیں۔

سلیم بھی اب دنیا کو کر دین کھونے کی فکر میں تھا، خدا کو وہ یاد کرتا تھا محض لوگوں کو کھانے کے لئے، نفس کشی ہو رہی تھی مگر صرف حصول عیش کی غرض سے مگر اس میں اپنی حسرت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی جرأت نہ تھی وہ اندرونی طور پر ہمت ہار چکا تھا کاش وہ خدا کو خدا کے لئے ہی یاد کرتا جو کہ دین و دنیا کا خالق و مالک اور سب سے بڑا ہے اور اس کی یاد دہنوں جہان کی دولت کا مالک بنادیتی ہے۔

سلیم نے سخت سے سخت ریاضتیں کیں دریا میں کھڑے ہو کر وظیفے کئے پہاڑوں کے غاروں میں چلے کشیاں کیں کئی کئی ماہ انسانی صورت نہیں دیکھی ہڈیوں کے ساتھ چمڑا لگ گیا آدمی سے ایک ڈھانچہ بن کر رہ گیا مگر کوئی رزلٹ نہ نکلا آخر پڑملہو کے قبرستان کی مسجد میں ایک بزرگ شاہ بابا سے ملاقات ہوئی شاہ بابا نے ترس کھا کر اسے

ایک وظیفہ بتایا کہ یہ دعوت درویش کے متعلق ہے۔

”شاہ بابا“ سلیم ایک دم بولا۔ ”اگر اجازت ہو تو میں اسے شروع کر دوں۔“

”بسم اللہ پڑھ کر اسے نو چندی جمعرات سے شروع کر دو اور جلد ہی اللہ تعالیٰ کے فضل سے تمہیں کامیابی مل جائے گی۔“ شاہ صاحب نے کہا۔

”باباجی کیا میرے تمام مطالبات پورے ہو جائیں گے؟“ سلیم جلدی سے بولا۔

”تمہارے مطالبات کا پورا ہونا خدا کی مرضی پر ہے۔“

”کیا یہ موکل خدا کی مرضی کو نہیں بدل سکتے؟“ سلیم آنکھیں دکھا کر بولا۔

”توبہ توبہ“ شاہ بابا۔ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے۔ ”موکلوں کی کیا طاقت ہے کہ خدا کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی اٹھائیں۔ بلکہ ہم جیسے درویش تو اس کی پوشیدہ قوتوں کو موکل کہتے ہیں۔“

”پھر آپ مجھ سے یہ مشقت کس لئے کرنا چاہتے ہیں۔“

”صرف اس لئے کہ تم برگشتہ ایمان ہوتے جا رہے ہو۔ تم نے اسم الہی کی برکات نہیں دیکھیں، تمہاری غلطیوں نے تمہیں کفر کے دروازے پر لاکھڑا کیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہیں زندہ درگور نہ ہو جاؤ۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم خدا کے صرف ایک نام کی دعوت کا کرشمہ دیکھ لو۔“

”باباجی! آپ نے درست فرمایا ہے۔ مگر اس اسم کی وجہ سے میری کوئی آرزو بھی پوری ہو سکے گی۔“

”وہی رُسن ہے وہی عظیم ہے ہی کو اس کا علم ہے۔“

یہ کہہ کر شاہ صاحب خاموش ہو گئے۔

سلیم نے ہر چند ان سے اور کوئی بات کرنی چاہی مگر شاہ صاحب نے کوئی جواب نہ دیا اور دوسرے ہی لمحے غائب ہو گئے۔

نو چندی جمعرات آگئی، سلیم نے زعفران کستوری اور کچھ دوسرا سامان منگوا کر وظیفہ شروع کر دیا ایک ہفتہ

گزر گیا دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا تیسرا ہفتہ آیا مگر ایسی کوئی علامات ظاہر نہیں ہوئی جس سے اس دعوت کی کامیابی کا خیال ہوتا سات گھنٹے کی سخت محنت اور پربیز دن بھر کا روزہ ہر طرف خاموشی اور تنہائی سلیم گھبرا گیا اس کا دل چاہا کہ چلے توڑ دے لیکن شاہ بابا نے ایسے تیروں سے یہ عمل بتایا تھا کہ توڑنے کی ہمت نہ رہی اور یہ بات بھی اس نے ہی ہوئی تھی کہ اگر بعض اعمال توڑ دینے جائیں تو ان کے اٹنے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ اس لئے عمل جاری رہا۔

چالیسواں دن تھا اور چار گھنٹے پڑھتے ہوئے گزرے تھے کہ ساری مسجد ہلنے لگی ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ حجرے کے دروازے ٹوٹ رہے تھے مہیب سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسا شور تھا جیسے آسمان سے ہزاروں سیلیں برس رہی ہیں ریل گاڑیاں زمین کی چھاتی رو بند رہی ہیں ہولناک منظر لمحہ بہ لمحہ بدھتا جا رہا تھا اور سلیم بے چارہ ہاسنا ہوا اپنے کام میں مصروف تھا۔

آنکھیں بند تھیں اور بیچ چل رہی تھی کہ یکایک حجرے کے دروازے کو ایک خت دھکا لگا دیوں دروازے اڑ کر پاش پاش ہو گئے۔ سلیم کی جان خوف کے مارے نکلنے کے قریب تھی کہ آہٹ سی معلوم ہوئی اب وہ شور غل کم ہوتا جا رہا تھا سناں اور خاموشی سلیم نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کھولی کیا دیکھتا ہے کہ ایک قوی پہل خولے صورت جوان نہایت باربع ہتھیار لگائے اندر داخل ہوا حصار کے گرد تین چکر لگائے اور تلوار میاں سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔

سلیم نے وظیفے کے لے کو ذرا تیز کر دیا۔ چند منٹ تک ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ کہنے کے بعد اس آنے والے نے تیوری پر بل ڈال کر سلیم سے کرخت لہجے میں کہا۔

”قتلہ قدرت سے مذاق کرنے والے بول کیا چاہتا ہے۔ کیوں ہمیں پریشان کیا ہے تو نے۔ ہمیں حاضر کرنے سے تجھے کس فائدے کی امید ہے؟“

سلیم کی جان میں جان آئی۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ عمل کامیاب ہو گیا۔ اور یہ وہی درویش موکل ہے جس کا شاہ بابا نے مجھے بتایا تھا اب میری ساری تمنائیں پوری ہو جائیں گی یہ موکل میرے سارے کام کر دے گا۔

”آپ کا نام درویش موکل ہے؟“ سلیم مسکرا کر بولا۔

”ہاں۔“ موکل بولا۔

”اللہ اللہ۔“ سلیم خوش خوش بولا۔ ”کیسی کیسی زبان گھسی ہے کہاں کہاں ہاتھ مارا گڑا ہے جب آپ کی زیارت نصیب ہوئی۔“

”ان فضول باتوں کو چھوڑ اور مطلب کی بات کر۔“ موکل غصے سے بولا۔

”جلد بازی نہ کریں حضور۔“ سلیم عاجزی سے بولا۔ ”ابھی تو آپ حاضر ہوئے ہیں۔“

”حاضری کیسی۔“ یہ تو صرف اسم پاک کی برکت ہے جو ہم آگے ورنہ دنیا کے بندوں سے ہمیں کیا واسطہ۔“ یہ جملہ موکل نے ایسے کڑک کر کہا کہ سلیم پر ہیبت طاری ہو گئی۔

”اچھا آپ تو یہ بتائے کہ آپ اپنے عامل کی کیا خدمات کر سکتے ہیں۔“ سلیم ڈرتے ڈرتے بولا۔

موکل بولا۔ ”قرآن کے ہر حرف اور ہر اسم میں لازوال طاقت پوشیدہ ہے جس اسم کی طاقت سے میں حاضر ہوا ہوں اور جس کا نام تم نے درویش مقرر کر لیا ہے۔“

”بہت خوب، لیکن کیا آپ، اسم کے عامل کی اطاعت نہیں کریں گے۔“

موکل ترش لہجے میں بولا۔ ”عملیات سے ہمارا اور عاملوں کی اطاعت جیسے لوگ سمجھتے ہیں وہ صرف دنیا کی طلب اور دھوکے باز عاملوں کا جال ہے۔ کچھ عامل دولت کی خاطر عمل کرتے ہیں لیکن ہمیں ان دنیاوی چیزوں سے کیا واسطہ۔ مگر اسم کی طاقت برکت کے زیر اثر ہم عاملوں کی اطاعت کرتے ہیں اور اس بزرگ شاہ بابا کی وجہ سے جس نے تم کو یہ اسم بتایا ہے روحانی طاقت ہے جو ہم آگے ہیں۔“

”تو اب آپ کا کیا کام ہے؟“ سلیم بولا۔

”صرف تمہیں سیدھی راہ دکھانی ہے۔ اللہ کا خوف دلانا ہے۔ تم کو تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو کوئی خزانہ مل جائے
جدھر نظر ڈالوں مجھے دولت ہی دولت دکھائی دے۔“
موکل تیز لہجے میں بولا۔ ”یہ سب نامعقول
مطالبات ہیں جن کے سبب ہمیں عملیات کی اطاعت سے
گزرنا پڑا ہے۔ سونے چاندی کا ڈھیر لگا دینا کسی خزانے کی
جگہ کا بتا دینا ہمارے نزدیک کچھ مشکل نہیں لیکن اس قسم کے
کام قدرت الہی کے خلاف ہیں۔“

”اچھا مجھے کسی ملک کی ریاست کا بادشاہ بنادوتا کہ
زندگی عیش و آرام سے گزرے۔“ سلیم آہستہ سے بولا۔
موکل نفرت خیز لہجے میں بولا۔ ”ہوں کی شکار گاہ
میں تم کو چھوڑ دوں کیا خوب کہا ہے تم نے پہلے ہی تمہارے
ملک بھیڑیے غریب عوام کے لئے کیا کم ہیں کہ آپ کا
بھی اضافہ کر دیا جائے۔“

”یہ بھی نہ سہی تو کم از کم سونے چاندی کا اچھا سا
نسخہ ہی بتا دو میں خود ہی سونا چاندی بنالیا کروں گا۔“
موکل بولا۔ ”اس کے سنی تو یہ ہیں کہ تم کو خدا کی منشا
کے خلاف پیکار اور سونے کا جھوٹا بادشاہ بنادوں تم سونے کا
نمونہ لے کر مخلوق خدا کو گمراہ کرو اور ہندگان الہی تم سے
سونے کا دھوکھا کھا کر رہا ہوں۔“

”میں تو دولت کا طلب گار ہوں۔“ سلیم
بولا۔ ”اسی کی خاطر ساری مشقتیں اٹھائی ہیں دولت سے
تمام خواہش پوری ہو سکتی ہیں اور آپ اس مدد کے لئے
تیار نہیں۔“

موکل غصے میں آ کر بولا۔ ”تمہارا یہ خیال غلط ہے
کہ دولت سے خواہش پوری ہو سکتی ہیں دولت تو انسان کے
لئے آگ ہے جس کا آخرت میں حساب بڑا سخت ہے
۔ اے ناقص الفہل انسان تو اس چیز کی کیوں طلب کرتا ہے
جو فانی ہے جس کا زوال تو نے اپنی آنکھوں سے اپنے گھر
میں دیکھا ہے جس سے آج تک کسی بھی کوئی سکون میسر
آیا ہے اور نہ روحانی سکون ملا ہے یہ شیطانی دوسرے دل
سے نکال اور اس کا طالب بن جس کے قبضہ قدرت میں
ایک یہ کیا ساری دنیا کے آرزو وار کل کائنات ہے۔“
”وہ کیا قارون کا خزانہ یا کسی ملک کی بادشاہت

ہے۔“ سلیم بھولے پن سے بولا۔

موکل تجب سے بولا۔ ”وہ خدا کی محبت اور رسول کی
اطاعت ہے۔ نماز اور قرآن پڑھ تیری آخرت سنو جائے
گی تجھے روحانی سکون ملے گا۔ نماز پڑھ تیرے سارے گناہ
دھل جائیں گے تیری بخشش ہو جائے گی۔ یہی تیرا خزانہ
ہے یہی تیری آخرت کی دولت ہے۔“

”لیکن میں تو دولت کا آرزو مند ہوں مجھے دولت
مند بننے کی خواہش ہے نماز روزہ تو بعد کی باتیں ہیں۔“
سلیم بولا۔

موکل غضب ناک ہو کر بولا۔ ”تو قدرت الہی کی
توہین کرتا ہے خیر اگر تجھے دولت دینا سے ہی لگاؤ ہے تو دنیا
کے قانون کے مطابق چل کوئی ایسا کام اختیار کر جس سے
مالدار بننے کا راستہ کھل جائے۔“

”دولت کے لئے تو میں نے عملیات کے پار پیلے
ہیں ان ریاضتوں کا تو یہ پھل نہیں ملنا چاہئے پھر کام کرنے
کی ہمت ہوتی تو آپ کی دعوت میں جان کیوں کھپاتا۔“

موکل آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ایسے
پست ہمتوں دنیا والوں کے لئے قانون قدرت میں کوئی
دفعہ موجود نہیں ہے دنیا میں بغیر ہاتھ پاؤں بلائے کچھ
نہیں ملتا۔ اس دنیا میں محنت اور کوشش سے تقدیر بنتی ہے۔“
آپ تقدیر تو بدل سکتے ہیں مگر مجھ سے آپ کو خند
ہو گئی ہے خیر وہ کام ہی بتا دیجئے جس سے دولت ہاتھ
آجائے مگر زیادہ محنت میں نہیں کر سکتا۔

موکل بولا۔ ”بھیری مریدی تو می پیشوائی اور فرقہ
واریت واعظ کوئی ایسے پیٹے ہیں کہ جتنی چاہو دولت سمیٹ
لو ان میں سے جس فن کو اختیار کرو گے میں مدد کرنے
کو تیار ہوں۔“

”آپ اچھے موکل ہیں۔“ سلیم بولا دولت آپ
نہیں دے سکتے۔ بادشاہت دینے سے آپ نے
انکار کر دیا سوتا آپ بنانا نہیں چاہتے۔ مگر مجھ میں اتنا
صبر نہیں ہے اور کیا ان پیشوں میں دھوکہ کیوں ہے۔“

”تمہاری کم ہمتی نے جب مال مفت کوئی اپنی
تقدیر سمجھ لیا ہے تو تمہیں ایسے ہی مکر و فریب سے دولت

حاصل ہو سکتی ہے۔“
”ان کاموں کے لئے بھی تو ہنرمندی درکار ہے۔
میں اپنے میں نہ حکیم بننے کی قابلیت پاتا ہوں۔ نہ بھیری
مریدی کی اور جعلی مذہب کا پیشوا ہونا تو بڑی چیز ہے۔ نہ بابا
نہ یہ تو بیکے درکاروں کی باتیں ہیں۔“

موکل دھیرے سے بولا۔ ”اگر تم ان آسان پیشوں
پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تو دنیا میں دھکے اور ٹھوکریں کھاتے
رہو خلقت انسانی کو روار کرنے والے بندے آخرت سے
غافل ہوتے ہوئے انسانی دنیا کے لئے نمونہ بن جاتے
ہیں۔“

”میں مانتا ہوں کہ حکیم بننے کے لئے کچھ نہ کچھ
قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے تو ضرورتاً روپیہ بھی چاہئے
واعظ کوئی اور دنیا داری بھی ذرا مشکل کام ہے۔ دوڑتے
ہوئے دماغ اور چلتی ہوئی زبان کے بغیر یہ دکانیں نہیں
چلتیں سیاسی دور میں جہاں مال آنے کا قوی امکان
ہے۔ وہاں پولیس کی سختیاں جیل کی شکنیں اٹھانے کی
جرات ہونی لازمی ہے تم جیسے شخص کے لئے تو بہترین کام
بھیری مریدی جس میں نہ کسی ساز و سامان کی قید ہے نہ کسی
قابلیت کا خرچہ بہت سی مسجدیں خانقاہیں پرانے مقبرے
دیران پڑے ہیں جہاں جی چاہے جا کر بیٹھ جاؤ۔

جتنی زیادہ سنانا جگہ اختیار کرو گے لوگ اسی
تدر زیادہ گرویدہ ہوں گے میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری
شہرت کے لئے کوشش کروں گا اور تھوڑے دن بعد تمہیں
بیر صاحب کا سرکار جی ہشاہ صاحب، درویش بابا، بیر
جنوں والا اور جو کچھ تم چاہو گے بنادوں گا لاکھوں بوڑھے
ہزاروں مرد اور ہزاروں بی بی مرید سر لڑکیاں عورتیں تمہارے
ہاتھ چومیں گی اور تم مزے کرنا۔

رنگ رنگ کی دنیا تمہارے پاس آئے گی۔
ہمراہیں لینے کے لئے فقیر بادشاہ کہلاؤ گے اس پیشے میں
دولت کمانے کی ساری خواہشیں تمہاری پوری ہو جائیں گی
اب بولو تمہارا کیا ارادہ ہے۔“

”کام تو ٹھیک ہے۔“ سلیم بولا۔ ”لیکن میرے
بس کا نہیں۔ جگہ کی قید ہر شخص سے نئے طرز کی گفتگو کرنا

ہر روز کا علاج ہر خواہش کی دوا۔ نہیں مجھ سے یہ ہو سکے
گا۔ آپ تو اللہ کے واسطے دست غیب کا انتظام کر دیں۔
زیادہ نہیں تو دس ہزار روزانہ ہی سہی۔ صبح ہوئی اور سہاوانے
کے نیچے سے اٹھائے۔“

موکل بولا۔ ”تو پیر فقیر یار ویش صاحب کرامت
مشہور ہو جائے گا آنکھوں میں سرسوں پھول جائے گی
دست غیب کیا چیز ہے دنیا کے سارے چھپے ہوئے خزانے
نظر آنے لگیں گے جب سہاگین ہمندی لگے ہاتھوں سے
پاؤں و باد با کہ مرادیں مانگیں گی اور آنسوؤں کی زبان سے
اپنے اخلاص کا اظہار کریں گی۔ تو ان حسینوں سے آنکھ
ملانے کو تیار دل نہیں چاہے گا طرح طرح کے نذرانے
نیازیں عورتیں لے کر آئیں گی۔ اب بولو کیا کہتے ہو۔“

”آپ بڑے ضدی ہیں۔“ سلیم بولا۔ ”اچھا مجھے
منظور ہے عملیات کے شوق اور درویشوں کی محبت کے
سبب میرے لئے یہ زندگی بالکل نئی بھی نہیں ہے۔“

موکل نے حقارت آمیز نگاہ سے سلیم کو دیکھ کر کہا۔
”جا اپنا کام شروع کر۔ جیسی گندی ہتھتھی کی خواہش تو نے کی
ہے۔ ویسے ہی پھل تجھے ملیں گے۔ خدا کی حقیقت سے
تو نے گریز کیا ہے اس لئے وہ بھی ہمیشہ کے لئے تجھ سے
روپوش رہے گا۔“

یہ کہہ کر موکل غائب ہو گیا سلیم نے چار برس میں
کئی روپ بدلے۔ پیر بنا، عامل بنا، خوب شہرت پائی
پورے پورے عیش اڑائے۔

چاروں کی چاندنی کے بعد جو اندھیرا شروع ہوا۔
تو سارے کمالات خاک میں مل گئے، دنیا بے وحشت
ہو گئی اور ایک مدت سے بازاروں میں کپڑے پھاڑے
ہوئے پھرتا رہتا ہے کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ سمجھتا ہے۔

لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ خدا کے
دھمکارے ہوئے نہ گھر کے نہ گھٹ کے رہتے ہیں،
نا قابل یقین، عبرت ناک اور نفرت آمیز یہی ان کی سزا
ہوتی ہے۔



وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

خبردار۔ حدود سے آگے بڑھنا اب ختم ہوا۔ اب تو اپنی من مانی نہیں کر سکتا اور پھر کسی نادیدہ ہاتھ نے روشاک کو پشت سے پکڑ کر اوپر کو اٹھا لیا اس کے بعد خود بخود دروازہ کھلا اور روشاک ہوا میں معلق دروازے سے باہر کو نکلتا چلا گیا۔ دروازہ سے نکلنے ہی خود بخود دروازہ بند ہو گیا اور اب روشاک بڑی تیزی سے ہوا میں معلق ایک طرف کو بڑی تیزی سے اڑتا چلا جا رہا تھا اس نادیدہ ہاتھ نے اسے بڑی مضبوطی سے اپنے گھٹنے میں بکڑ رکھا تھا۔ اور پھر جب وہ ایک ویرانے میں پہنچا وہ پریشانہ حد تک چھپلا ہوا تھا۔ اس ہاتھ نے روشاک کو اوپر سے نیچے بڑی بے دردی سے پھینک دیا۔ روشاک نیچے گر کر اور پھر اس کی فلک شکاف چشموں پر سے ویرانے کو دھلا گیا۔ کافی دیر تک وہ بے سدھ پڑا سوچو سوچو بوجھ سے بے خبر رہا۔ پھر جب اس سے ذرا ہوش آیا تو اس نے اپنے ذہن کو جھکا لیکن لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کون سی نادیدہ قوت ہے جس نے اسے اس طرح اپنے گھٹنے میں جکڑنے کے بعد مجھے اس ویرانے لایا۔ خیر وہ تھوڑی دیر بعد اپنے قدموں پر لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا اور اپنے قبیلے کی جانب اڑاں بھری۔ قبیلہ میں موجود اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ مائی بے آب کی طرح تر پڑے لگا۔ اسے خوشبو سے دوری تڑپا رہی تھی، خیر اس کے اپنے دل کو سمجھایا کہ کوئی بات نہیں، میں اس نادیدہ قوت کو دیکھوں گا اور اسے بھی ایک انجام تک پہنچا دوں گا۔ روشاک کی شرانگیزی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی جس کے پیش نظر رولوکا نے کئی مرتبہ اسے روکا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز رہے مگر وہ اپنی ضد کے آگے اشتعال میں آتا گیا اور وہ رولوکا اس کے قبیلہ میں اس کے والد کے پاس پہنچ گیا، رولوکا کو اپنے قبیلہ میں دیکھ کر جنوں کا سردار مناش حیرت میں پڑ گیا اور وہ رولوکا کی طاقت کو بھی بھانپ گیا اور پھر رولوکا نے اپنی شکایت سردار کے آگے گوش گزار کر دی۔ جسے سن کر سردار بولا۔ معزز مہمان آپ اپنا اصل مدعا بیان کریں۔ تو رولوکا بولا۔ سردار محترم! آپ کے قبیلہ کا ایک نافرمان اور ضدی جن ہے جس نے ایک آدم زادی کی عزت پامال کر دی ہے اور اس آدم زادی پر اپنا تسلط جما بیٹھا ہے اور وہ نافرمان جن ہے آپ کا بیٹا روشاک!! یہ سنتے ہی سردار کے تیور بدل گئے اس کا چہرہ غصے سے تھما اٹھا اور غصی غصی کی حالت میں کرخت اور گرد آواز سنائی دی۔ ”رو..... شا..... ک.....“

(اب آگے پڑھیں)

سردار کی آواز پوری محفل میں دینگ

طریقے سے گونج گئی۔ اچانک روشاک اپنی جگہ سے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سہا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ محفل میں بیٹھے تمام جنات نے اپنی نظریں اس پر مرکوز کر دیں۔ سردار کی تہہ برساتی نگاہیں اس پر جم گئی تھیں۔

روشاک نے سردار کی تہہ برساتی آنکھوں کی طرف دیکھا تو ان آنکھوں میں غضب اور نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آیا۔ روشاک اندرونی طور پر کپکپانے لگا۔ اچانک سردار کی غصیلی اور گرد آواز سنائی

دی۔ ”روشاک اگر کچھ کہنا ہے تو کٹہرے میں جا کر کہو۔“
روشاک نڈھال اور لڑکھڑاتے قدموں سے کٹہرے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔
مگر یہ کیا۔ ایک بجلی کا کوند سا لپکا اور روشاک کٹہرے سے غائب تھا۔

محفل میں بیٹھے سارے جنات اچنبھے کی حالت میں کٹہرے کو گھور رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سردار بھی اچنبھے کی حالت میں کٹہرے کو گھورے جا رہا تھا۔
سردار کے قریب ہی ایک بہت ضعیف بارش جن



کھڑا تھا جسے سردار کی مرتبہ استاد محترم کہہ کر مخاطب کر چکا تھا۔ سردار مخاطب ہوا۔ ”استاد محترم! روشاک فرار ہو چکا ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ روشاک مجرم ہے۔“ اجنبی یعنی محترم رولوک کی ساری باتیں حقیقت ہیں، اگر روشاک قصور وار نہیں ہوتا تو یقیناً اپنی صفائی میں کچھ کہتا۔ استاد محترم اب آپ کی کیا رائے ہے؟“

”سردار! آپ کی بات درست ہے اور روشاک کی یہ حرکت اسے مجرم ثابت کرتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ روشاک گیا کہاں ہے؟ اسے ہر حال میں اپنے قبیلے میں آتا ہے اور اگر روشاک خود نہیں آتا تو اسے زبردستی لانا پڑے گا۔ یہ قبیلے کے قانون کے خلاف ہے کہ ہمارے قبیلے کا کوئی جن قبیلے کے قانون کو فراموش کر کے قبیلے سے فرار ہو جائے اور جو ایسا کرتا ہے وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ فرار ہونے والا ہماری پہنچ اور نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا اور ایسا کرنے والے جذبات میں ایسا قدم اٹھاتا ہے۔“

آپ چند محافضوں کو فوراً دوڑائیں جو کہ پتہ کریں کہ روشاک گیا کہاں اور پھر یہ محافض زور زبردستی اسے قبیلے میں لے آئیں تاکہ حقیقت کا پتہ چلے۔“ استاد جن یہ بول کر خاموش ہو گیا۔ سردار نے چار جنوں کو آواز دی اور بولا۔ ”فورا جاؤ اور یہ معلوم کرو کہ روشاک کس طرف اور کہاں گیا ہے، اگر وہ آرام سے آجائے تو ٹھیک ہے ورنہ بزدلوں طاقت لے آنا اور اگر زور زبردستی کرے تو بالکل ہچکچائے بغیر طاقت کا استعمال کر کے ہر حال میں لے آنا۔“

”جی سردار! آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ ہر حال میں ہم اسے ضرور لے آتے ہیں۔“ ان چاروں محافضوں میں سے ایک بولا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے غائب ہو گئے۔

چاروں محافضوں کے جانے کے بعد سردار رولوک سے مخاطب ہوا، رولوک ابھی تک غائب حالت میں اپنی جگہ موجود تھا۔

”محترم رولوک! ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں اور جو کچھ بھی ہوا آپ کے سامنے ہے، آپ کی تمام

باتیں درست ہیں اور ہم آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے اپنے محافضوں کو آپ کے سامنے بھیج دیا ہے تاکہ وہ روشاک کو ہر حال میں اس جگہ لے آئیں۔

روشاک کے اس جگہ آتے ہی اس نے جو حرکت کی ہے اور پھر جو اس نے قبیلے کا قانون توڑا اسے اس بنا پر اسے قانون کے مطابق قرار واقعی سزا دی جائے گی اور جو بھی سزا اسے دی جائے گی آپ کے سامنے دی جائے گی۔ ہم جب بھی کسی کو سزا دیتے ہیں قبیلے کے تمام لوگوں کے سامنے اور جو سزا کا مستحق پایا جاتا ہے اسے اپنی صفائی میں بولنے کا پورا پورا حق بھی دیا جاتا ہے۔ ہم ہمیشہ احکام خداوندی کا خیال رکھتے ہوئے انتہائی قدم اٹھاتے ہیں۔

اب میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنے ٹھوس اجسام میں آکر ہمیں خدمت کا موقع دیں۔ آپ کی خدمت کر کے ہمیں خوشی ہوگی۔ ہم نے جان لیا ہے کہ آپ واقعی ایٹھ دل و دماغ اور احکام خداوندی کو مد نظر رکھتے ہوئے شریعت کے پابند ہیں۔ اگر آپ ایسے نہ ہوتے تو روشاک کو اب تک آزاد نہ چھوڑا ہوتا۔ اور پھر آپ یہاں تک آنے کی تکلیف نہ اٹھاتے، ایٹھ لوگ ہمیشہ مستقل مزاجی اور بردباری کا ثبوت دیتے ہیں۔ میں ہی نہیں، بلکہ ہمارا پورا قبیلہ آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کا مستحق ہے۔ آپ ہماری خوشی کو مد نظر رکھتے ہوئے برائے مہربانی کچھ تو خدمت کا موقع دیں۔“ سردار بولا۔

”قابل قدر سردار! آپ کو اور آپ کے قبیلے کے تمام لوگوں کو میں سلام پیش کرتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے اصول اور شریعت کے بہت پابند ہیں۔ قانون کی پاسداری آپ لوگوں کے لئے بہت اہم ہے۔ میں آپ کو اپنی خدمت کا موقع ضرور دوں گا لیکن اس وقت میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ روشاک اس وقت یہاں سے فرار ہونے کے بعد کسی ایسی جگہ جائے گا جو کہ آپ لوگوں کی پہنچ سے دور ہو۔ اگر اس کے دماغ میں ایسا نہ آتا تو کسی صورت بھی وہ فرار نہ ہوتا۔ لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ آپ سے بچ نہیں سکتا بلکہ ہر حال میں وہ آپ کی گرفت میں آجائے گا۔ خیر اس وقت میں ایک کام کے

تحت جا رہا ہوں۔ مگر یہ میرا وعدہ ہے کہ جب وہ آپ کی گرفت میں آجائے گا تو اس وقت میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔

اور اگر آپ کو کسی قسم کی کوئی بھی دشواری پیش آئے اسے اپنے قبیلے میں لانے کے لئے تو میری خدمات حاضر ہیں، آپ ہمیشہ مجھے اپنے قریب پائیں گے، ابھی تو میں جا رہا ہوں اور بہت جلد ہماری ملاقات دوبارہ ہوگی۔

میں ایک مرتبہ پھر آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ میری ضرورت پڑے تو آپ بغیر کسی تردد کے میرے پاس اپنا پیغام بھیج سکتے ہیں۔ میں فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ یہ بول کر رولوک اپنی جگہ سے جہاں وہ موجود تھا غائب ہو گیا۔

ادھر روشاک قبیلے سے فرار ہو کر سیدھا خوشبو کے پاس پہنچا۔ اس کی حالت بہت ہی بدحواس ہو رہی تھی اس وقت خوشبو چھت پر اپنے کمرے میں موجود تھی اور سر پر ہاتھ رکھے اپنی سوچوں میں غرق تھی۔ وہ ایک تنگ خوشبو کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ جس حالت میں تھا وہ بیان سے باہر ہے۔ اندرونی طور پر اس پر کچھ طاری تھی۔

اسے یہ تو پتہ تھا کہ اس کے قبیلے والے اسے پکڑنے کے لئے آئیں گے ضرور اور کسی حال میں بھی وہ بچ نہیں سکتا مگر وہ اپنے تئیں ایسے اقدام اٹھا کر یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا حلق خشک تھا۔ اس کی زبان گنگ تھی۔ اسے بولنا دوسرے ہو رہا تھا۔ مگر بہت مشکل اور کوشش کے بعد اس کے منہ سے نکلا۔ ”خوشبو!“

خوشبو نے جیسے ہی اپنا نام سنا تو پٹ سے اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور پھر روشاک کو اس حال میں دیکھ کر وہ جھٹ اٹھ بیٹھی۔ اور اپنی نظریں روشاک پر مرکوز کر دیں وہ بھی ایک تنگ روشاک کو دیکھے جا رہی تھی۔

خوشبو اچھنبے میں تھی کہ اس وقت روشاک بھی آیا نہیں اور آج خلاف توقع اس وقت آنا اور پھر اس بگڑتی ہوئی خستہ حالت میں۔ ”آپ اور اس وقت!“ اس کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا۔

روشاک لڑکھڑائی زبان سے بولا۔ ”خوشبو! جلدی چلو!! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ تمہیں اس وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ فوراً اٹھو۔ نہیں تو میں تمہیں زبردستی لے جاؤں گا، تمہیں حاصل کرنے کے لئے میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا ہوں۔“

میرا کوئی اندیکھا دشمن تمہاری ذات کے مد نظر میرے قبیلے تک پہنچ چکا ہے اور اس نے تمہارے اور میرے میل جول کو میرے والد کو بتا دیا ہے اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں، میں تمہارے لئے در بدر ہو چکا ہوں، میں دنیا چھوڑ سکتا ہوں مگر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔“

روشاک کو ایک تنگ دیکھتے ہوئے خوشبو بھی ہوئی تھی، وہ شش و پنج میں تھی، وہ جان چکی تھی کہ یہ بد بخت کوئی بھی خطرناک قدم اٹھا سکتا ہے اور اس کے اٹھائے ہوئے قدم کو وہ کسی بھی صورت روک نہیں سکتی اور نہ ہی خود کو وہ اس کے چنگل سے بچا سکتی تھی۔

روشاک کی گھبراہٹ مزید بڑھتی جا رہی تھی، اس نے حتی الامکان فیصلہ کر لیا تھا کہ ہر صورت وہ خوشبو کو اپنے ساتھ ضرور لے جائے گا۔

ادھر جب روشاک اپنے قبیلے سے فرار ہوا تو فوراً رولوک کے دماغ میں یہ بات آئی تھی کہ روشاک سب سے پہلے خوشبو کے گھر ضرور جائے گا خوشبو سے ملنے کیونکہ رولوک کو یہ بھی پتہ تھا کہ روشاک جنون کی حد تک خوشبو کو چاہتا ہے۔

اس بنا پر روشاک کی کوشش ہوگی کہ وہ خوشبو کو بزدلوں طاقت اپنے ساتھ لے کر چلا جائے۔

یہی سوچ کر رولوک نے فوراً اپنے کئی کارندوں کو روشاک کے پیچھے خوشبو کے گھر تک روانہ کر دیا تھا۔ اور کارندوں کو حکم دیا تھا کہ اگر روشاک خوشبو کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت کرے یا پھر خوشبو کو زور زبردستی اپنے ساتھ لے جائے یا کوشش کرے تو پھر پورے مزاحمت کر کے اسے ایسا کرنے سے روکا جائے اور اگر وہ آرام سے اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو اسے کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے۔ اور پھر بھی وہ زیادہ زور آزمائی کرے یا پھر اپنی

خوشبو پر جیسے سکتے طاری ہو چکا تھا۔ روشاک کا
اچانک اس وقت آنا، اس کی بدحواسی کی حالت، ڈر اور

اتنے میں کہکشاں کی آواز سنا۔ ”امی جب میں کمرے میں آئی تو دیکھا کہ باجی تک بے سدھ سی دیوار کو دیکھے جا رہی تھیں۔ کمرے میں میرے آنے کا بھی انہوں نے محسوس نہ کیا، اور پھر جب میں نے باجی کہہ کر آواز دی تو یہ چونک پڑیں اور پھر مجھ پر نظر پڑے۔“

ول، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا، میں ہر قیمت پر تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ چلو فوراً اس حالت میں اٹھو

وہ آٹا ناٹا س قبیلہ کی حدود میں گھستا چلا گیا۔ لیکن ہم آخری حدود تک جا کر رک گئے اور اسے جانا دیکھتے رہے۔ وہ قبیلہ بھی جتنا توں کا ایک قبیلہ ہے لیکن جہاں تک ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ قبیلہ غیر غریب کافر جنوں کا قبیلہ ہے۔ اپنے علاقے کے حدود میں بے شمار جن ادھر ادھر جاتے نظر آ رہے تھے۔ ہم نے اپنے آپ کو ان پر ظاہر نہیں کیا۔ ہم تھوڑی دیر تک روٹاک کا انتظار کرتے رہے۔ مگر کافی وقت تک وہ ملیٹ

کرواپس نہیں آیا تو ہم نے اپنی راہ لی۔ اب ہمارے لئے کیا حکم ہے؟“ ایک کارندہ نے پوچھا۔
”تم لوگ ایسا کرو کہ اس قبیلہ سے دور رہ کر روشاک کو چپک کرو، ہو سکتا ہے کہ کچھ وقت کے بعد وہ وہاں سے نکلے۔“

لیکن یہ خیال ضرور رکھنا کہ اس قبیلہ کے جنوں پر تم لوگوں کی موجودگی ظاہر نہ ہو۔ اور پل پل کی خبریں مجھ تک پہنچاتے رہنا۔“ رولو کا بولا تو اس کے کارندوں نے کہا۔ ”جی! بہت اچھا۔“ اور یہ بول کر وہ جدھر سے آئے تھے اس طرف کارخ کر لیا۔

کارندوں کے جانے کے بعد رولو کا نے اپنا پیغام ہوا کی لہروں کے ذریعہ جتنا توں کے سردار کے پاس پہنچایا۔ ”سردار! میں رولو کا بول رہا ہوں۔ کیا روشاک کی کوئی خبر ملی کہ وہ کہاں ہے یا ایسا تو نہیں کہ وہ قبیلہ میں واپس آ گیا ہو؟“

اس طریقہ سے سردار نے بھی اپنا جواب رولو کا تک پہنچا دیا۔ ”محترم و معزز رولو کا صاحب! ہم نے اپنے تئیں یہ معلوم کر لیا ہے کہ روشاک نے غیر مذہب کافر جنوں کے قبیلہ میں جا کر پناہ لے لی ہے۔ ان جنوں سے ہماری کبھی بنی نہیں، ہمارے اور ان کے قبیلہ کی ایک طویل عرصہ سے دشمنی چلی آ رہی ہے اور پھر ویسے بھی غیر مذہب والوں سے ہمارا کیا واسطہ۔“

لیکن ان کا اور ہمارا ایک معاہدہ ضرور ہے کہ چاہے ان کا یا ہمارا کوئی بھی جن جرم کر کے ایک دوسرے کے قبیلہ میں پناہ لے لیتا ہے تو باہمی مشورہ سے وہ مجرم جن ہم ایک دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ لہذا مجھے قوی امید ہے کہ روشاک ان کے پاس زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتا۔ روشاک کو ہم اپنے قبیلہ میں ضرور لے آئیں گے۔“

اور اگر انہوں نے ہٹ دھرمی کی تو پھر جنگ آمد جنگ آمد۔“ یہ بول کر جنوں کا سردار خاموش ہو گیا۔ رولو کا بولا۔ ”سردار صاحب! آپ فکر نہ کریں، اگر آپ کے مخالف قبیلہ والوں نے مطالبہ پر روشاک کو واپس نہ کیا تو

مجھے بھی آپ اپنے شانہ بشانہ پائیں گے۔ لیکن میرا ایک مشورہ ہے کہ آپ فکر نہ کریں۔ جنگ و جدل میں دونوں طرف کا جانی نقصان ہوگا اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ مجھ پر یقین رکھیں میں کوشش کر کے روشاک کو اس قبیلہ سے بخیر و عافیت نکال لاؤں گا اور آپ کے حوالے کر دوں گا۔ یہ میرا آپ سے پکا وعدہ ہے۔ پہلے آپ اپنے تئیں اپنے معاہدہ کے تحت بارے کریں۔“

ادھر جب روشاک کافر جنوں کے قبیلہ میں پہنچا تو اس قبیلہ کے سردار جن نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور روشاک سے بولا۔ ”تم قطعی فکر نہ کرو، میں کسی بھی حال میں تمہیں تمہارے والد کے حوالے نہیں کروں گا۔ تمہارے والد کے اصول، پابندی، بے جا سختی، بے سرحکم، چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں اور سب سے زیادہ پابند شریعت یہ سب فضول باتیں ہیں، ہر جن کو اپنی مرضی سے جیسے کا حق ہے اور اگر کوئی جن کسی آدم زادی سے دل بہلاتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔“

بلکہ ایسا کرنے والا جن آدم زادی کی خواہشات کا بھی احترام کرتا ہے اس کی ضروریات زندگی کا بھرپور خیال کرتا ہے اور اس کے لئے آدم زادی کے آگے دولت کا ڈھیر لگا دیتا ہے۔ جس سے آدم زادی اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور اس طرح زندگی عیش سے گزرنے لگتی ہے۔ ویسے بھی اگر دیکھ جائے تو کوئی آدم زادی کو بھی آدم زادی کے ساتھ زیادہ کرتا ہے، اسے اغوا کر لیتا ہے، اس کے ساتھ دست درازی اور زیادتی کر کے آدم زادی کی عزت کو پامال کر دیتا ہے، اگر ایسا کرنے والا آدم زادی اور رسوخ ہوتا ہے تو اس کے لئے تمام قانون آدم زادوں کے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ آدم زادی پر بدچلتی کا الزام لگا دیا جاتا ہے کہ آدم زادی نے خود اپنی مرضی اور خواہش کے تحت قدم باہر نکالا تھا۔ دنیاوی عدالتیں امیروں، دولت مندوں، اشرار رسوخ والوں اور بڑے بڑے تعلقات والوں کا ساتھ دیتی

ہیں اور قصور وار کو بری کر دیتی ہیں۔ صرف غریب اور بے یار و مددگار لوگ تختہ دار پر چڑھا دیے جاتے ہیں۔ میری نظر میں روشاک تم نے کوئی جرم نہیں کیا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم نے ایک آدم زادی سے دل بہلا لیا۔ میں ہر طرح سے تمہارا تحفظ کروں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے، تم قطعی بے فکر ہو جاؤ۔ قبیلہ میں تم آزادی سے گھومو پھرو، کھاؤ پیو اور خوش رہو۔ میں تمہارے والد اور ان کے قانون سے نمٹ لوں گا اور میری یہ بھی کوشش ہوگی کہ وہ آدم زادی بھی تمہیں مل جائے۔“

سردار کی باتیں سن کر روشاک بہت خوش ہوا اور بولا۔ ”سردار صاحب! میں آپ کی بہادری اور ذہانت کی قدر کرتا ہوں۔ آپ کی تمام باتیں سو فیصد درست ہیں، میں ساری عمر آپ کا احسان مند رہوں گا اور آپ کے زیر سایہ اپنی عمر گزار دوں گا۔ میں اکثر آپ کی بہادری کے چرچے سنتا تھا مگر آج میں نے خود اپنی آنکھوں سے آپ کو دیکھ لیا۔“

سردار اپنی تعریف سن کر پھول گیا اور بولا۔ ”روشاک اب تم آرام سکون کے ساتھ مہمان خانے میں رہو، میں غلام کو بلا کر تمہیں مہمان خانے میں بھجوا دیتا ہوں، مہمان خانے میں رہو اور عیش کرو۔“ یہ بول کر سردار نے آواز دی تو ایک جن حاضر ہوا تو سردار نے روشاک کو اس کے ساتھ کر دیا اور بولا۔ ”انہیں لے جا کر مہمان خانے میں چھوڑ آؤ۔ اور مہمان خانے کے سرپرست سے بولنا کہ سردار کا حکم ہے۔ ان کو کسی قسم کی شکایت نہ ہو ان کے آرام کا ہر طرح خیال رکھا جائے۔“

روشاک کے جانے کے بعد سردار خود بڑبڑانے لگا۔ ”اصول کے پابند سردار! اب میں تمہاری ساری اکثر نکال دوں گا، اب تمہارا بیٹا میرے قبضے میں ہے اور جس پر عشق کا بھوت سوار ہو جائے وہ باپ تو کیا پوری دنیا سے بھی فکرانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ میں اپنی چالاکی اور پالیسی کے تحت تمہارے بیٹے کو تمہارا سے لیس کر کے تمہارے سامنے لا کھڑا کروں گا۔ پھر دیکھو لوں گا کہ تمہارے اصول کیا کہتے ہیں۔“ اور یہ بول کر مسکرانے لگا۔

ادھر روشاک کے باپ نے اپنے قبیلہ میں اپنے تمام سرکردہ جنوں کو اکٹھا کیا اور ان سے صلاح مشورہ کرنے لگا۔ ہر پہلو پر غور کیا گیا۔ تمام بزرگ جنوں کا فیصلہ تھا کہ ہر صورت میں روشاک کو واپس لایا جائے، چاہے اس کے لئے دشمن قبیلہ والوں سے لڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔

کیونکہ دشمن قبیلہ نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی ہے اسے معاہدہ کے تحت روشاک کو واپس کرنا چاہئے اور ویسے بھی روشاک نے غلطی کی ہے، اسے اپنے باپ کی عزت کا بھی خیال نہ رہا، اسے اپنی صفائی میں کچھ نہ کچھ کہنا چاہئے تھا۔ لیکن اچانک اس طرح فرار ہونے کا مطلب ہے کہ معزز رولو کا نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ تمام درست ہے۔

روشاک نے اپنے پورے قبیلہ کی بے عزتی کی ہے کہ بھاگ کر دشمن کے پاس چلا گیا۔ سردار! آپ فکر نہ کریں قبیلہ کا ہر جن اپنے سردار اور قبیلہ کی عزت کے لئے اپنا سر کٹوائے گا اور قبیلے کا اصول پامال نہیں ہونے دے گا۔“

سردار بولا۔ ”معزز ساتھیو! مجھے قبیلہ کی عزت زیادہ عزیز ہے چاہے میری جان چلی جائے۔ میں قبیلہ کے اصول اور عزت پر آج نہیں آنے دوں گا۔ قبیلہ کے اصول عزت اور انصاف کے تحت روشاک کو قربان کر دوں گا۔ یہ میں نے اٹل فیصلہ کر لیا ہے۔ میری نظر میں قبیلہ کا ہر جن برابری کا حقدار ہے، کوئی چھوٹا بڑا نہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ روشاک میرا بیٹا ہے تو وہ بچ جائے۔ اس نے ناقابل معافی غلطی کی ہے اور اس لئے وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔“

اور ہاں! یاد آیا۔ محترم رولو کا نے وعدہ کیا ہے کہ اگر دشمن قبیلہ نے پیار محبت کا ثبوت نہ دیا تو وہ خاموشی سے روشاک کو ہمارے پاس لے آئے گا۔ اور مجھے امید ہے کہ رولو کا کا وعدہ بکا ہے۔

خیر میری مرضی نہیں کہ ہم مہمان سے مدد لیں۔ ہم اپنے تئیں اور اپنے زور بازو سے یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں قاصد جن کو بلا کر پیغام بھیجتا

ہوں کہ فی الفور روشاک کو واپس کریں ورنہ معاملہ آگے بھی جاسکتا ہے۔“ سردار نے کہا۔

”سردار! ہماری طرف سے آپ کو اجازت ہے، قبیلے کی بھلائی کے لئے آپ جو بھی قدم اٹھائیں وہ احسن قدم ہوگا۔ ہم سب کو آپ کی اور قبیلے کی عزت عزیز ہے۔“ تمام معمر جنوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

سردار نے قاصد جن کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں ایک رقعہ دیا اور بولا۔ ”یہ رقعہ سنگار قبیلہ کے سردار کے پاس لے جاؤ، پہلے آداب کرنا اور پھر یہ رقعہ اس کے ہاتھ میں دے دینا اور وہ جو بھی جواب دے اسے لے کر یہاں آجانا۔“

اور ہاں یاد آیا میں نے تو یہ رقعہ پڑھ کر آپ لوگوں کو سنایا نہیں کہ اس میں، میں نے کیا تحریر کیا ہے۔ میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے معمر اور بزرگوں کو سناؤں۔ اس میں لکھا ہے۔ ”سنگار قبیلہ کے سردار کے حضور، یککاش قبیلہ کے سردار اور تمام جنات کی طرف سے آداب عرض۔ اصلی معاملہ جو ہے اور جس کے لئے یہ قاصد آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ قبیلہ کا ایک جن روشاک جو کہ میرا بیٹا بھی ہے، نادانی سے ایک جرم کر بیٹھا ہے اور سزا کے ڈر سے بھاگ کر آپ کی پناہ میں آ گیا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہم دونوں قبیلوں کے معاہدے کے تحت آپ روشاک کو فوراً ہمارے حوالے کر دیں۔ امید ہے کہ آپ شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔ خیر خواہ، سردار مناش۔“

رقعہ کا متن جان کر اس جگہ موجود تمام جنوں نے کہا۔ ”سردار آپ نے بہت اچھا لکھا ہے۔“

اس کے بعد قاصد جن وہ رقعہ لے کر مخالف قبیلہ سنگار کی طرف پرواز کر گیا۔

چند لمحے میں قاصد جن سنگار قبیلہ کی حدود میں پہنچ گیا اور حدود کے باہر کھڑا ہو کر محافظ جنوں سے بولا۔

”میں یککاش قبیلہ کے سردار کا پیغام لے کر آپ کے سردار کے پاس آیا ہوں۔ آپ لوگ اجازت دیں تاکہ میں قبیلہ میں داخل ہوسکوں۔“

محافظ جنوں نے جب اپنے سردار کا نام سنا تو جن آگے بڑھے اور بولے۔ ”ٹھیک ہے تم ہمارے ساتھ چلو! ہم تمہیں سردار کے پاس لے چلتے ہیں۔“ یہ بول کر وہ دونوں قاصد جن کے ہمراہ اپنے سردار کی جانب روانہ ہو گئے۔

سردار کے پاس پہنچ کر وہ تینوں مکان کے باہر ٹھہر گئے اور پھر ایک جن اندر گیا اور سردار سے اجازت لے کر قاصد جن کو سردار کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سردار نے قاصد جن سے رقعہ لیا اور پڑھنے لگا۔ رقعہ پڑھ کر سردار مسکرایا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے میں بھی اپنا جواب دیتا ہوں۔“ یہ بول کر سردار نے کاغذ پر لکھا۔

”سردار یککاش قبیلہ کے لئے عرض ہے کہ ہم کب صورت بھی روشاک کو واپس نہیں کریں گے۔ یہ ہمارا پہلا اور آخری فیصلہ ہے۔ اگر طاقت ہے تو روشاک ہمارے قبیلہ سے لے جاسکتے ہو۔“

اور رقعہ قاصد جن کے حوالے کر دیا۔ قاصد جن نے رقعہ لیا اور واپس اپنے قبیلہ میں آ گیا۔

قاصد نے واپس آ کر جواب سردار کے ہاتھ میں دے دیا۔ سردار نے رقعہ کھول کر پڑھا اور پھر پیش میں آ کر کھڑا ہو گیا اور غضب ناک آواز میں بولا۔ ”گلا جا۔“ سردار پھر اپنے ساتھیوں کی طرف مخاطب ہوا۔ ”معزز ساتھیو! گلا جانے میرے رقعہ کے جواب میں صاف لکھا ہے کہ ”میں کسی صورت بھی روشاک کو واپس نہیں کروں گا، یہ میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہے۔“

سردار کی باتیں سن کر سارے جن آئیں اور مشورہ کرنے لگے پھر ایک معمر جن جو کہ قبیلہ کا بہت

رسیدہ تھا جسے سردار استاد کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ وہ اٹھا اور بولا۔ ”سردار آپ فکر نہ کرو گلا جا کو بھیاک متاںج جھگڑے پڑیں گے۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔“

”استاد! آپ قبیلہ میں اعلان کرادیں کہ کل ہم گلا جا کی طرف پیش قدمی کریں گے۔ تمام نوجوان جن تیار ہو جائیں اور دو چار اور قبیلہ جو کہ ہمارے خیر خواہ ہیں ان کے پاس بھی پیغام بھجوادیں۔ اور ان کی بھی رائے

لے لیں اور یہ بھی کہلا دیجئے گا کہ اگر وہ ہماری مدد کرنا چاہیں تو بخوشی ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے سردار!“ استاد جن نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر سارے جن چلے گئے۔ سب کے جانے کے بعد سردار اپنی مضامین سمجھنے لگا اور بولا۔ ”روشاک تم نے اچھا نہیں کیا، تم نے جس طرح ذلت و رسوائی سے مجھے دو چار کیا ہے، اس کا خیاں نہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ اور گلا جا! تم نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے اس کی سزا بھی تمہیں ضرور ملے گی۔“

تین دوسرے قبیلوں میں جب سردار مناش کا پیغام پہنچا تو اس قبیلے کے سردار بھی سنگار قبیلہ کے سردار گلا جا کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، وہ سب کے سب مشتعل ہو گئے اور وہ بھی مناش کی مدد کے لئے تیار ہو گئے۔ سب نے وعدہ کیا کہ ہم کل یککاش قبیلہ میں حاضر ہو جائیں گے، گلا جانے وعدہ خلافی کر کے اچھا نہیں کیا، اسے اٹھام و تھیم سے سوچنا چاہئے تھا، گلا جانے اپنی طاقت کے ذمہ میں جواب دیا۔ ہم احکام خداوندی کے پابند ہیں اور کسی سے جنگ و جدل نہیں چاہتے۔ مگر ان کا فر جنوں کو اب سبق سکھانے کا موقع آ گیا ہے۔“

ادھر سنگار قبیلہ میں بھی اعلان ہو چکا تھا کہ یککاش قبیلہ کے جن ضرور جنگ کی خاطر دوڑے چلے آئیں گے۔ لہذا اس قبیلہ میں بھی جنگ کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اور خفیہ طریقے سے انہیں خبر مل گئی تھی کہ کل کا دن بہت اہم ہوگا۔

صبح اندھیرے منہ ہی دونوں طرف کی جنات قومیں ایک بہت بڑے صحرا میں پہنچ گئیں۔ وہ صحرا خاص کر اس مسئلے کے لئے وقف تھا۔ جس تیاری سے سارے جنات آئے تھے۔ اللہ..... اللہ۔

اگر دنیا کے عام انسان دیکھ لیں تو تھرا کر رہ جائیں۔ عجیب عجیب خوفناک شکلیں دیکھنے میں آ رہی تھیں۔ عجیب و غریب ناقابل یقین طرح طرح کے ہتھیار۔ اتنے بڑے اور روزنی قسم کے ہتھیار کہ کسی انسان سے اٹھانا ناممکن تھا۔ سردار گلا جا کی نظر جب اپنے

مخالفوں پر پڑی تو وہ تشویش میں پڑ گیا۔ کیونکہ اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر مخالف سمت کی جناتی فوجیں تھیں۔ سب وجہ یہ تھی کہ سردار مناش نے اپنے ہم خیال اور ہمدردوں سے بھی مدد طلب کر لی ہے مگر اب تو تیر ترش سے نکل چکا تھا۔

اس نے پالیسی کے تحت روشاک کو سب سے آگے کھڑا کیا تھا۔

دونوں طرف فوجیں صف آہ تھیں۔

لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ دونوں طرف کی کارروائی سے رولوکا پوری طرح باخبر تھا۔ اس کے کارندے پل پل کی خبریں رولوکا کے گوش گزار کر رہے تھے۔ رولوکا جان چکا تھا کہ سنگار قبیلہ کا سردار گلا جا کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہے۔ لہذا خفیہ طور پر رولوکا نے بھی اپنے مضبوط اور طاقتور کارندوں کو سردار مناش کی مدد کے لئے روانہ کر دیا۔ اور خود بھی غائبانہ طور پر میدان جنگ میں موجود تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گھمسان کارن پڑا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے بے شمار اور لاتعداد پہاڑ جیسے لوہے کے انسان ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں۔

رولوکا کے کارندے بھرپور انداز میں یککاش قبیلہ والوں کی مدد کر رہے تھے۔ عجیب و غریب ہتھیار کے علاوہ جناتی طاقتیں اور قوتیں بھی استعمال ہو رہی تھیں۔ جس کا جواز و چلتا وہ اس سے استعمال کر رہا تھا۔

سنگار قبیلہ کے جن گاجرمولی کی طرح کھنڈے لگے۔

رولوکا کے کارندے اپنے پسندیدہ جناتوں کی مدافعت کر رہے تھے۔ جو بھی مخالف جن ان کی طرف لپکتا تو رولوکا کے کارندے فوراً درمیان میں آ جاتے اور مخالف جنوں کا وارووک لیتے اور اس طرح مخالف جن نیست و نابود ہو جاتا۔

سردار مناش ایک جگہ کھڑا اپنی فوجوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ وہ بہت جہاں دیدہ تھا اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی فوجوں کے علاوہ بھی اس جنگ میں نا دیدہ ہتھیار ایسی ہیں جو کہ ان کی مدد کر رہی ہیں۔ مگر وہ یہ جاننے سے قاصر تھا

کہ وہ ہمدردانہ دیدہ بہتیاں ہیں تو کون ہیں؟

جو دوسرے قبیلہ والے اس کی مدد کو آئے تھے انہیں سردار مناش نے سب سے پیچھے رکھا تھا کہ اگر میرے لوگ پسپا ہونے لگیں تو ہمدردوں کو آگے لایا جائے۔

وقت بڑی تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ مخالف فوجیں بھی کافی تعداد میں تھیں۔ عصر تک گلا جاکر آدھی سے زیادہ فوجیں نیست و نابود ہو کر میدان جنگ میں پڑی تھیں۔

مغرب سے پہلے ایک وقت مقررہ پر جو وقت جتنا توں کی طرف سے مقرر تھا۔ دونوں طرف سے دو معرکہ جن اپنے ہاتھ میں ایک ایک سفید رنگ کا جھنڈا آفت پر نمودار ہوئے جسے دیکھ کر دونوں طرف کی فوجیں اپنی اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئیں۔ دونوں جن نیچے تارے اور درمیان میں دونوں جھنڈے جو کہا ایک بڑے ڈنڈے میں موجود تھا۔ میدان میں گاڑ دیے۔ دونوں جھنڈوں کا زمین پر گرنا تھا کہ دونوں طرف کی فوجیں پیچھے کی طرف ہٹنے لگیں۔

اس کا مطلب تھا کہ اب جنگ بند ہو چکی تھی۔ سنگار قبیلہ کی فوجوں میں سرا سبکی پھیل چکی تھی بے شمار جنت اپنا وجود جو چکے تھے۔

کیا کاش قبیلہ کے چند جنت کام آئے تھے۔ ابھی بھی مناش کے ساتھیوں میں بہت زیادہ جوش و خروش دیکھنے میں آ رہا تھا۔ مناش نے اپنے ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی اپنے ہمدرد جنوں کا بھی شکریہ ادا کیا اور بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ کل دوپہر تک گلا جا، میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ مگر اسے چھوڑنا کسی صورت بھی نہیں۔ اور ہر حال میں ہمیں روشاک کو زندہ گرفتار کرنا ہے۔“

تھوڑی دیر میں مغرب کا وقت ہو گیا تو قبیلہ کے تمام جنت نے نماز مغرب ادا کی اور اس کے بعد کھانا کھا کر آرام کرنے لگے۔

مخالف سمت کی فوجوں میں بڑی خاموشی طاری تھی۔ رات کا آدھے سے زیادہ پہر گزر چکا تھا۔ میدان سے جنتوں کی لاشیں غائب ہو چکی تھیں۔ تمام تھکے

ہارے جنت بے سدھ پڑے تھے لیکن کچھ جاگ رہے تھے جو کہ آنے والے وقت سے خوف زدہ تھے۔ سوچ رہے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کا دن ان کی زندگی کا آخری دن ثابت ہو۔ ان کے دماغ میں بار بار آ رہا کہ ہمارے خدی ہٹ دھرم اور بے اصول سردار کی ہمت سے ہمارے کتنے بھائی ہند موت سے ہمکنار ہو گئے دشمنی کی بنا پر سردار کو اپنے لوگوں سے ذرا بھی رغبت نہیں خیر سارے کے سارے مجبور تھے، اپنے قبیلہ سے بغاوت کر بھی نہیں سکتے تھے۔

ادھر رولوکا اپنے کمرے میں موجود ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ گھمبیر سوچوں میں دبا ہوا تھا۔ وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مزید خون خرابہ ہو کیونکہ ایک کی ہٹ دھرمی وجہ سے اس کے قبیلہ کے بے شمار نوجوان جنت موت بھیٹ چڑھ چکے تھے۔ کسی بھی پارٹی، کسی بھی ملک یا کبھی قبیلہ کے سردار کا کیا جاتا ہے۔ بس اس کا حکم صادر ہوتا ہے اور بے شمار لوگ قہر اجل بن جاتے ہیں۔

رولوکا بستر پر بیٹھے بیٹھے اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے میں ٹپٹپٹ لگا۔ وہ بار بار اپنا سر نیچے فرس پر چھت کی طرف کرتا۔ کافی دیر تک وہ اسی حالت میں رہا اور پھر اچانک اس نے اپنی دونوں مٹھیاں سمجھنے لیں اور پھر دائیں ہاتھ کی مٹھی کو بائیں ہاتھ پر زور سے مارا۔ پھر اپنی گردن نیچے کر کے چند لمبے کچھ سوچتا رہا پھر اس ایک لمبا سانس کھینچا اور پلک جھپکتے ہی اپنے کمرے غائب ہو گیا۔

اپنے کمرے سے رولوکا سیدھا میدان جنگ آیا۔ تمام فوجی جنت اور افسر جنت و معمر جنت اپنے خیموں میں خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اندھیرے کا تسلط ہر طرف قائم تھا۔ اتفاقاً اندھیری راتیں شروع ہو چکی تھیں۔

رولوکا غائب حالت میں تھا۔ وہ خاموشی سنگار قبیلہ کے خیموں کی طرف بڑھا اور پھر چند خیموں میں جھانکنے کے بعد اپنے مطلوبہ خیمے تک پہنچ گیا۔ خیمہ میں روشاک بے سدھ پڑا تھا۔

”کھولیں۔“

سردار فوراً ایک طرف بڑھ گیا اور ایک کمرے کے دروازے پر رک کر کمرے کی کڑی کھول دی۔ رولوکا کمرے میں داخل ہوا اور پھر سامنے پڑے بستر پر رولوکا نے اپنے ہاتھ میں موجود روشنی نما گیند رکھ دی۔ اس کے بعد رولوکا نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو روشنی نما گیند بڑی ہونے لگی اور پھر ایک شخص کا وجود دھار لیا۔ پھر رولوکا کے اشارے پر تمام شعاعیں یکسر غائب ہو گئیں۔ جنہوں نے کہ روشاک کا احاطہ کر رکھا تھا۔ رولوکا نے بستر کی جانب اشارہ کیا۔

سردار! اچنبھے کی حالت میں بستر پر موجود روشاک کو دیکھ رہا تھا۔

”سردار! یہ اپنے حواس میں نہیں۔ یہ رات بھر بے سدھ رہے گا۔ اس کے دروازے پر نورانی حصار قائم کروں۔ اور پھر میدان جنگ میں چلے جائیں۔ علی الصبح اعلان کریں کہ جنگ بندی کی جاتی ہے کیونکہ جس مقصد کے لئے یہ جنگ مسلط ہو گئی تھی اس مقصد کو ہم نے پایا ہے۔ لہذا اب میں نہیں چاہتا کہ مزید خون خرابہ ہو۔ اگر شروع میں ہی گلا جا میری بات مان لیتا تو اتنے جنت اپنی زندگی نہ ہار جاتے۔ جتنے بھی جنت موت سے ہمکنار ہوئے ہیں مجھے ان سے ہمدردی ہے۔ گلا جا کے لئے میرا مشورہ ہے کہ اپنے قبیلہ میں واپس چلا جائے۔“

”جی محترم رولوکا! ایسا ہی ہوگا صبح کا اجالا پھیلتے ہی میں جنگ بندی کا اعلان کر دوں گا۔ آپ شریف رکھیں۔“ سردار بولا۔

”نہیں سردار! میں اس وقت بیٹھ نہیں سکتا۔ اور آپ بھی فوراً اپنے خیمہ میں پہنچیں کیونکہ اگر کسی نے آپ کو خیمہ میں نہ پایا تو وہ قتلش میں مبتلا ہو جائے گا۔ آپ جب بھی اپنی کارروائی شروع کریں مجھے اطلاع کر دیجئے گا۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“

”محترم رولوکا! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہماری وجہ سے تکلیف اٹھائی، میں تاحیات آپ کا احسان مانتا رہوں گا، اور مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی

خیمہ میں ایک طرف کھڑے ہو کر رولوکا نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑھا اور اپنی دائیں ہاتھ کی پھٹی پر پھونک ماری تو اچانک پھٹی روشن ہو گئی اس کے بعد رولوکا نے اپنی پھٹی کا رخ روشاک کی طرف کر دیا۔ پھٹی سے سبز رنگ کی شعاعیں خارج ہونے لگیں اور پھر ان شعاعوں نے چاروں طرف سے روشاک کا احاطہ کر لیا۔ پھر وہ شعاعیں آہستہ آہستہ سنسنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام شعاعیں ایک بالکل چھوٹے گیند میں بدل گئیں۔ ان گیند نما شعاعوں میں روشاک کا وجود بھی مٹ کر رہ گیا تھا۔

رولوکا نیچے جھکا اور خاموشی سے اس گیند نما شعاع کو اپنے سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ رولوکا مسکرانے لگا اور پھر جس خاموشی سے غائبانہ طور پر آیتا ہی خاموشی سے اس خیمہ سے نکل گیا۔ اس کے بعد وہ سیدھا سردار مناش کے خیمے میں آیا۔ سردار اتنی رات گئے ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ اپنا سر اپنے ہاتھ میں لئے خاموشی سے بیٹھا تھا۔

اچانک رولوکا کی آواز سنائی دی۔ ”سردار!“ سردار نے چونک کر اوپر دیکھا تو دنگ رہ گیا کیونکہ اس کے سامنے رولوکا مجسم کھڑا تھا۔ فوراً سردار کے منہ سے نکلا۔ ”محترم رولوکا آپ اور اس وقت۔“

”ہاں سردار! میرے دل نے گوارہ نہ کیا کہ ایک جن سردار کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بے شمار جن موت سے ہمکنار ہو گئے اور نہ جانے کل اور کتنے اپنی زندگی ہار جائیں گے۔ تو میں نے سوچا کیوں نہ جھگڑنے کی اصل جڑ کو ہی اکھاڑ پیچھا جائے۔ میں روشاک کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ آپ فوراً اس وقت میرے ساتھ چلیں اپنے قبیلہ میں۔“

”لیکن محترم رولوکا! یہ تو بتائیں کہ روشاک ہے کہاں؟“ سردار بولا۔

”سردار! یہ پوچھنے کا وقت نہیں ہے۔ آپ فوراً چلیں۔“ رولوکا بولا۔

”جی! بہت اچھا!“ یہ بول کر سردار اپنے خیمے سے نکلا اور پھر دونوں قبیلہ کی جانب سو پرواز ہو گئے۔ قبیلہ میں پہنچ کر رولوکا بولا۔ ”آپ روشاک کا کمرہ

وہ اپنے بے شمار ساتھیوں کو موت سے ہمکنار کرنے کے بعد بھی شکست سے دوچار ہو چکا تھا۔

”میں انے ساتھیوں کی موت کا ذمہ دار ہوں اور

ادھر رولو کا کہ پاس پل پل کی ساری خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اس کے پاس اچانک ایک کارندہ عجلت میں آیا اور خبر دی کہ گھلا گا بیٹا وادی سے کافی دور کوئی قبیلوں میں گیا ہے اور ان کو اپنی مدد کے لئے راضی کر رہا ہے، اس کا کہنا ہے کہ کیکاش قبیلہ والوں نے ماق اس کے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ وہ بہت بے بس اور مجبور ہے۔ اس کا قبیلہ اتنا طاقتور نہیں کہ کیکاش قبیلہ سے بدلہ لے سکے۔ چونکہ وہ بے دین قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے ہم مذہب قبیلہ والوں کے پاس گیا ہے اور سارے قبیلہ والوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کل آدھی رات کے بعد اچانک کیکاش قبیلہ پر حملہ کر دیا جائے کیونکہ قبیلہ والے جیت کی خوشی میں نیند میں بے سدھ پڑے ہوں گے۔ چونکہ غیر مذہب یعنی کافر جنتا ویسے ہی

دوسری رات آئی اور آدھی رات سے پہلے ہی
لوکا اس وادی میں پہنچ گیا جس طرف سے وہ کافر
مات حملہ کرنے والے تھے یعنی وہ واحد راستہ تھا جس

سردار کی نظریں متواتر رولو کا پر مرکوز تھیں کہ نہ
 بجائے رولو کا کب کیا اشاہ کر دے۔ کیونکہ رولو کا کے
 اشارے پر ہی سارے جناتوں نے قدم اٹھانا تھا۔

ہر سو گھنٹا ٹوپ اندھیرے کا راج تھا۔ سارا علاقہ اور ساری وادی اندھیرے کی چادر اوڑھے بڑی مہیب اور ڈراؤنی نظر آ رہی تھی۔ اگر اس وقت انسانوں کا بھی جم غفیر ہوتا تو خوف اور ڈر کی وجہ سے ان کا پتا پانی ہو جاتا۔ اور جب یہ معلوم ہو کہ ان کے مقابل ان کا دشمن بہت قوی طاقتور اور خوفناک والا ہے تو ایسی صورت میں واقعی انسان کا ہارٹ ایک یا پھر اس پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے، مگر وہاں تو جنات موجود لیکن وہ بھی اپنے دشمن سے اندرونی طور پر خوفزدہ ضرور تھے کہ نہ جانے دشمن کتنا قوی اور طاقتور ہے، اور پھر نہ جانے اچانک کس طرف سے حملہ کر دے۔ کیونکہ حملہ آور دشمن اپنی تمام تر تیار یوں کے ساتھ دندناتا ہوا بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کر دے۔ رات کے ڈھائی بجے اچانک شمال کی جانب سے ایسا لگا کہ جیسے طوفان آگے کو بڑھ رہا ہے۔ فضا میں گوں..... گوں..... گوں..... کی آوازیں متواتر سنائی دے رہی تھیں۔

ہوا کے دوش پر آتی ہوئی آوازیں کو سن کر سردار نے خوفزدہ انداز سے رولوکا کی طرف دیکھا اور آنکھوں کے اشارے سے رولوکا سے پوچھنے لگا کہ کیا کرتا ہے۔ رولوکا خاموش تھا اس نے سیدھے ہاتھ کی انگلی اٹھا کر ہونٹوں پر رکھ کر اشارہ کیا کہ بالکل خاموش رہیں۔ کسی بھی حرکت سے گریز کریں۔ ہماری کوئی بھی حرکت دشمن کو چوکنہ کر سکتی ہے۔

سردار نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں بھی اشارہ کیا کہ بالکل خاموش رہو۔

پل پل گزرتے ہوا کے دوش پر پرواز کرتی آوازیں متواتر قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب بھی رات کی تنہائی میں کسی نادیدہ قوت یا پھر انسانوں کا جم غفیر کارواں کسی سمت رواں دواں ہوتا ہے تو ہوا کے دوش پر اس کے آگے بڑھنے یا دوڑنے یا پھر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں یا

پھر گاڑیوں کے گزرنے سے بھی آوازیں دور بہت دور سنائی دیتی ہیں۔

سارے جنات اپنی اپنی جگہ دم سادھے کھڑے تھے ایک ایک پل ایک ایک لمحہ عجیب جان لیوا گزر رہا تھا۔ جوں جوں آوازیں قریب آ رہی تھیں وہاں پر کھڑے سب عجیب طرح کا اندرونی طور پر ایک انجناہ خوف انہیں اپنے غٹنے میں کس رہا تھا۔

اچانک رولوکا کے سامنے روشنی کا ایک چھوٹا سا نقطہ نمودار ہوا، اور پھر چشم زدن میں روشنی کا وہ نقطہ غائب ہو گیا۔ اس نقطے کو سردار مناش نے بھی واضح طور پر دیکھا، اس کے بعد سردار، رولوکا کی جانب آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگا۔

رولوکا نے اس مرتبہ بھی اپنی انگلی کا اشارہ کیا۔ اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور پھر ایک گول سادارہ بنایا اور پھر اس دائرہ کے اندر اپنی انگلی کا اشارہ کر دیا جس کا معنی یہ تھا کہ ”دشمن سر پرچہ چنے والا ہے مگر دشمن غٹنے میں جکڑ جائے گا اور فرار کی صورت میں آسمان کی دستوں کی طرف پرواز کرے گا مگر اس وقت اس کے بھاگنے کے سارے راستے ختم ہو چکے ہوں گے۔“

ایک پل دو پل..... اور پھر پل پل گزرنے لگے..... گوں..... گوں..... کی آوازیں بالکل قریب آ گئیں۔ جلدی سے رولوکا نے اپنے ہاتھ کی ٹمچی بند کی اور سردار کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ ”بالکل خاموش رہنا ہے ہر حال میں، ہماری ذرا سی بھی حرکت دشمن کو باخبر کر دے گی۔“

رولوکا کے ہی انداز میں سردار نے اپنے ساتھیوں کی طرف بند ٹمچی کر کے اشارہ کر دیا اور پھر سارے جنات بالکل چوکس ہو کر کھڑے ہو گئے کہ اتنے میں۔

اچانک پوری وادی میں ایک کان بھاڑ دینے والا زوردار دھماکہ سنائی دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی ایٹم بم زمین پر پھینک دیئے گئے ہوں۔

آندھی اور طوفان کی طرح آگے بڑھتے ہوئے سارے جنات کسی اتنی اور اندھی دیوار سے ٹکرائے

تھے۔ اس جگہ پر زبردست طریقے سے بجلیاں کوندنے لگی تھیں۔ اس وقت دل دہلا دینے والا ناقابل بیان حد تک خوفناک منظر رونما ہو چکا تھا۔ جب نیچے سے بجلیاں اوپر کو اٹھیں تو اوپر سے بھڑکتے ہوئے شعلے ان پر آن گرتے۔ پوری وادی میں ایک حد متعین ہو گئی تھی۔ پورے علاقے میں بھڑکتے ہوئے شعلے اور کڑکتی ہوئی بجلیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔

اس جگہ جتنے بھی جن موجود تھے سب کے سب دہشت زدہ تھے، انہیں یہ دھڑک لگ چکا تھا کہ کہیں بھڑکتے ہوئے شعلے اور کڑکتی بجلیاں ان کی طرف نہ بڑھ جائیں۔

ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ بار بار زبردست قسم کے وجود آتے اور اس آہنی دیوار جو کہ غائبانہ طور پر موجود تھی اس سے دھڑام دھڑام طریقے سے ٹکراتے تھے ان دیکھی دیوار سے ان وجود کا ٹکرانے کا مقصد تھا کہ جو، ان دیکھی دیوار ان کے راستے میں حائل ہے وہ کسی طور بھی پاش پاش ہو جائے نکران کا تمام حربہ بنا کام ہو رہا تھا اس صورت میں ان کے وجود میں آگ بھڑک اٹھتی تھی۔

پھر ایک اور ناقابل یقین منظر رونما ہوا۔ اچانک ایک بہت بڑا شعلوں کا بھڑکتا ہوا گولہ ان کے درمیان میں گرا۔ آگ کے گولہ کا گرنا تھا کہ نادیدہ قوتوں کی چیخ و پکار کان بھاڑنے لگیں۔ وہ تمام دل دہلاتے مناظر انسانی دل و دماغ کے برداشت سے باہر تھے۔ اگر واقعی اس جگہ انسان ہوتے تو یقیناً وہ اب تک سارے اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے ہوتے۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ تک آگ اور بجلیوں کا دلخراش منظر رونما ہوتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ منظر غائب ہونے لگا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ بھڑکتے شعلے اور کڑکتی بجلیاں ختم ہو گئیں۔

تھوڑی دیر بعد جب رولوکا مطمئن ہو گیا تو اس نے اپنی انگلی کو اوپر آسمان کی جانب اشارہ کیا تو اس کی انگلی سے ایک باریک دودھیا رنگ کی روشنی کی ٹیکر نکل کر آسمان کی طرف کافی اونچائی تک گئی اور پھر روشنی ایک

جگہ ٹھہر کر دوبارہ گول دائرہ میں تبدیل ہو کر واپس زمین کی طرف پلٹی اور اس جگہ پکڑنے لگی جہاں کہ تھوڑی دیر پہلے بھڑکتے ہوئے شعلے اور بجلیاں کوند رہی تھیں۔ تمام جگہوں پر وہ روشنی کا دائرہ پکڑا تا رہا پھر اس کے بعد وہ دائرہ زمین میں پیوست ہو گیا۔ تو رولوکا نے پھر اپنے ہاتھ کا اشارہ کیا تو پورے علاقے میں سفید دودھیا روشنی پھیل گئی۔

دیکھنے والوں کی آنکھیں پھر اکر رہ گئیں کیونکہ اس جگہ پر بے شمار اور لاتعداد جنتی وجود چلے ہوئے پڑے تھے۔ وہ سب کے سب جل کر کونکہ کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

رولوکا آگے بڑھا اور سردار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”کم بخت سارے کے سارے جل کر کونکہ ہو گئے۔ سردار! آپ کے یہ دشمن ہیں جو آپ کے قبیلہ پر حملہ آور ہونے کے لئے آئے تھے، اگر میں انہیں اس طرح نہ روکتا تو یہ سب آپ کے قبیلہ کو نیست و نابود کر دیتے۔“

سردار صاحب! اب آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے قبیلہ میں چلے جائیں، آپ کے سارے دشمن اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں اور آپ کو یہ بھی بتادوں کہ آپ کے دشمن گلا جا کا بیٹا بھی جل کر خاکستر ہو چکا ہے۔

قبیلہ والوں کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے سردار کا بیٹا بھی اپنے آخری انجام کو پہنچ گیا ہے۔ اب قبیلہ والے اپنا نیا سردار جن لیں گے اور مجھے یقین ہے کہ ان کا نیا سردار سوچہ بوجھ اور باشعور ہوگا۔ کیونکہ ان لوگوں کو اپنے ضدی اور ہٹ دھرم سردار کا انجام معلوم ہے جس نے لاتعداد جنوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔

سردار! اب میں چلتا ہوں۔ مجھے اجازت دیں، پھر ملاقات ہوگی اور ایک بات یاد رکھئے گا کہ ان معاملات کے متعلق اپنے قبیلہ والوں کے درمیان میرا پرچار مت کیجئے گا۔ بس آپ کو تمام حقیقت کا علم ہے یہی بہت ہے۔“ رولوکا بولا۔

سردار مناش رولوکا کی بات سن کر بولا۔ ”محترم

رولوک! میں آپ کا یہ احسان تاحیات نہیں اتار سکتا، میں کس منہ سے آپ کا شکر یہ ادا کروں، میں تو میں بلکہ میری آنے والی قلیں بھی آپ کے احسان تلے دبی رہیں گی، اس کا جزو آپ کو خدا ہی دے گا۔

ہاں! ایک بات یاد آئی کل جمعہ کا دن ہے میں آپ کے پاس بعد نماز جمعہ پیغام بھیجوں گا۔ آپ برائے مہربانی ضرور تشریف لے آئیے گا۔ کیونکہ بعد نماز جمعہ روشاک کا معاملہ سامنے لایا جائے گا۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ اپنی مصروفیات سے تھوڑا وقت ضرور نکال کر قبیلہ میں تشریف لائیں گے۔

”ٹھیک ہے سردار صاحب میں وعدہ کرتا ہوں کہ ضرور آؤں گا۔“ رولوک بولا اور غائب ہو کر پلک جھپکتے ہی اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔

ادھر سردار مناش نے روشاک کو اس کے کمرے میں بے سدھ کر کے قید کر دیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر یہ ہوش و ہواس میں رہا تو یقیناً دوبارہ فراری کی کوشش کرے گا یا پھر بھروسہ ہے کہ کوئی اور حرکت کر بیٹھے۔

جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد معمول کے مطابق درس کے لئے محفل منعقد ہوئی۔ قبیلہ کے تمام جنات نے شرکت کی اور پھر سردار نے درس دینا شروع کیا۔ درس کے بعد روشاک کو لا کر کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ اب وہ ہوش و حواس میں تھا۔ ندامت سے سر جھکا ہوا تھا۔ کٹہرے کے گرد آٹھ جنات کھڑے تھے۔ ویسے بھی سردار نے کٹہرے کے گرد حصار قائم کر دیا تھا تاکہ روشاک اپنی کسی جتنائی قوت کے بل بوتے پر فرار نہ ہو جائے۔

سردار نے بہت مضبوط اور خفیہ حصار قائم کیا تھا کیونکہ سردار کو معلوم تھا کہ روشاک کتنی خفیہ طاقت کا مالک ہے۔ سردار نے آج اس کے فرار کے سارے راستے بند کر دیئے تھے۔

روشاک کو یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ وہ جن، کافر جنوں کے قبیلہ میں جا کر پناہ لی تھی اور پھر کافروں کے

ساتھ وہ میدان میں آیا تھا اور اپنے ہی قبیلہ کے خلاف حملہ آور ہوا تھا۔

اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کافروں کا سردار سنگارا اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ یعنی وہ موت سے ہمکنار ہو چکا ہے اور پھر میدان جنگ سے کسی نہ کسی طرح اسے اغوا کرنے سے پہلے بے سدھ کیا گیا پھر اسے اٹھا کر یہاں لایا گیا۔

سردار کے پیغام ملنے پر حسب وعدہ رولوک محفل میں آچکا تھا۔ آج وہ جسم سردار کے برابر ایک بڑی کرسی پر براجمان تھا۔ قبیلہ کے سارے جنات بڑی قدر کی نگاہ سے رولوک کو دیکھ رہے تھے اور جو جن بھی اس کے قریب سے گزرتا تو نظریہ جھک کر سلام کرتا۔

کبھی کبھی روشاک اپنی قہر بوسائی نظروں سے رولوک کو دیکھ لیتا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ رولوک کو کچا ہی چبا جاتا۔

جب سارے جنات آ کر محفل میں بیٹھ گئے تو سردار کھڑا ہوا۔ سردار کی عیسیٰ اور گویدار آواز سنائی دی۔

”روشاک تم پر الزام ہے کہ تم نے ایک آدم زادی کی عزت کو پامال کیا اور ایک طویل عرصہ سے اس کے گھر والوں کو بھی ہراساں کیا جبکہ تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے قبیلے کا کیا اصول ہے اور پھر ہم سارے جنات شریعت کے پابند مسلمان ہیں۔ تم نے قبیلہ کا قانون توڑا۔ احکام خداوندی سے منہ موڑا، یہی نہیں بلکہ تم نے اپنے والدین کے بھروسے کو روند ڈالا۔“

قبیلہ سے فرار ہونے کا تم نے جو قدم اٹھایا وہ ناقابل معافی ہے اور سب سے بڑھ کر غلطی تم نے یہ کی کہ تم نے کافر جنات کے قبیلہ میں پناہ لی اور یہ اسرار احکام خداوندی کے خلاف ہے کہ ایک مسلمان، کافر کو اپنا سپہارا اور محافظ بنالے۔

فرار ہونے کے بعد جن اذیت ناک اور جان لیوا مراحل سے پورا قبیلہ گزرا ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے ایک عورت کے لئے تم نے اپنے قبیلہ اپنے والدین اور خدا کو ناراض کیا۔ تمہارے اقدام سے خوبی جنگ شروع

ہوئی جس میں قبیلہ کے کئی جن اپنی زندگی سے گئے۔ جبکہ تمہیں اچھی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات پر انسان کو برتر بنایا ہے۔ یعنی انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود تم نے اشرف مخلوق کی عزت کی دھجیاں بکھیر دیں، تم جذبات میں اندھے ہو چکے تھے جس کی وجہ سے ناقابل یقین اور ناقابل برداشت مراحل سے سب کو گزرنا پڑا۔ اب اگر تم اپنی صفائی میں کچھ ہاتھ چاہتے ہو تو بلا جھجک کہہ سکتے ہو، مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہر حال اگر تم چاہو تو بول سکتے ہو۔“

سردار کی باتیں سن کر روشاک نے اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھائی اور ایک اپنی نظریہ پوری محفل پر ڈال کر گویا ہوا۔

”سردار! میں بلاؤر خوف یہی قرار کرتا ہوں کہ میں نے آدم زادی سے محبت کی۔ اسے جاہا بلکہ اتنا چاہا کہ میں اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میرے لئے وہ آدم زادی بہت عزیز ہے، اور اس کے آگے میرے لئے تمام اصول، تمام پابندی اور تمام قانون کی کوئی حیثیت نہیں۔“

روشاک یہاں تک ہی بول سکا تھا کہ اچانک سردار مناش غضبناک طریقے سے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی دل دہلا دینے والی عیسیٰ آواز پوری محفل میں گونج گئی۔

”بد بخت خاموش ہو جا! تو جذبات کی رو میں بہہ کر سوچھو پوچھو اور شعور سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ تو دین اور دنیا دونوں کے لئے پوچھ بن گیا ہے، تو منافقوں اور کافروں سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ احکام شریعت سے انکار پر میں تجھے جیسے بے شمار اولادوں کو بھی قربان کر سکتا ہوں۔ احکام خداوندی سے انحراف کسی صورت بھی ناقابل معافی ہے۔“

اور پھر جس کٹہرے میں روشاک کھڑا تھا اچانک زبردست بجلی کوئی شعلہ بھڑکا اور روشاک کے پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

نارنجی رنگ کا شعلہ اتنا زبردست تھا کہ روشاک کو

چپختے کا موقع تک نہ مل سکا اور پلک جھپکتے ہی روشاک جل کر کوئلہ میں تبدیل ہو گیا۔ اب کٹہرے میں روشاک کی جگہ سیاہ رنگ کی تھوڑی سی راکھ پڑی تھی۔

پھر سردار کی آواز سنائی دی۔

”محافظو! کٹہرے میں موجود راکھ کو فوراً اٹھاؤ اور لے جا کر سمندر برد کر دو۔“

سردار کی آواز سننا تھا کہ تین محافظ فوراً کٹہرے کی جانب لپکے اور کٹہرے میں موجود راکھ کو ایک کپڑے میں رکھ کر پوٹی باندھی اور ایک طرف کو پرواز کر گئے۔

اب سردار کی حالت نارمل ہو گئی تھی۔ چہرے پر سے جلال ختم ہو گیا تھا مگر اب چہرے پر ملال نظر آ رہا تھا۔ ویسے بھی چہرے پر ملال کیوں نہ نظر آتا۔ جو اس سال بیٹا موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ یہ تو فطری عمل ہے۔ اولاد کی موت ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ والدین کے لئے۔ سردار اب کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ پوری محفل پر ایک طرح کا جیسے سکتے طاری ہو چکا تھا۔ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔

رولوک کا بھی اپنی کرسی پر خاموش گردن جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

اتنے میں سردار اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور آسمان کی طرف اپنی شہادت کی انگلی اٹھائی اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

”اللہ پاک گواہ رہنا میں نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا، میری نظر میں یہی بہتر تھا۔ روشاک نے جذبات کے رو میں بہہ کر قانون شریعت سے منہ موڑا۔ اللہ تعالیٰ تو نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اس کو اس نے اذیت دی اور اس کی عزت پامال کی، سب سے بڑا جرم کہ فرار ہو کر کافر جنات کے قبیلے میں پناہ لی، دشمن کو ہمارے مقابلے پر اکسایا، ہزار ہا سال کے قبیلے کے قانون کو توڑا، قرآن اور احادیث کی رد گردوانی کی، مزید آگے شر پھیلاتا کہ اس کا نیست و نابود ہو جانا ہی بہتر ہوا۔“

میرادل مطمئن ہے کہ ایسی نافرمان اولاد سے بے اولاد رہنا ہی بہتر ہے۔ اس نے اپنے قبیلے کی نہیں بلکہ انسان کی بھی تذلیل کی اور قرآن میں بھی یہی لکھا

ہے کہ عزت پامال کرنے والے کو سخت سزا دی جائے تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔ اللہ پاک اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو میں تیرے آگے سجدہ ریز ہو کر معافی کا خواستگار ہوں۔ میری غلطیوں اور کوتاہیوں کو درگزر کر دینا۔ اور سردارِ نڈھال طریقے سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور بیٹھنے ہی آٹھیں بند کر لیں۔

اتنے میں رولوکا اپنی کرسی سے اٹھا اور سردار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”سردار! آپ بہت عظیم ہیں، اوپر والے مالک کے بنائے ہوئے قانون کی پاسداری کرنے والے اچھا اجر پاتے ہیں۔ روشاک کو مارنا یا مردانے کی میری اپنی مرضی نہیں تھی۔ اگر میرا منشا اسے ختم کرنا ہوتا تو میں بہت پہلے اسے زندگی سے دور کر دیتا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ خدای ہی نہیں بلکہ بہت خود سر اور دین سے متنفر بھی ہو گیا تھا۔

اگر وہ اپنی غلطی پر پشیمان ہو جاتا تو میں خود بھی آپ سے بولتا کہ اسے ایسی سزادیں کہ اسے تاحیات احساس رہے، اس سزا سے عبرت پکڑے اور آئندہ کبھی اپنی ہزار ہا سالہ زندگی میں احکامِ خداوندی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے مگر افسوس کہ.....“ اور رولوکا نے بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ سردار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

”محترم و معزز رولوکا! ہم آپ کی رحم دلی کے قائل ہو چکے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ آپ روحانی طاقتوں پر کس قدر دسترس رکھتے ہیں۔ مگر مجھے قطعی دکھ اور افسوس نہیں کیونکہ مجھے اولاد سے زیادہ اپنے پیدا کرنے والے کی خوشنودی چاہئے۔

محترم رولوکا! میں تاحیات قلبی طور پر آپ کا احسان انتار ہوں گا۔ کیونکہ آپ نے ہمارے قبیلہ کی مدد کی اور ہمیں ذلیل و رسوا بلکہ شکست فاش سے بچایا۔ ساتھ ہی روشاک کی شرانگیزیوں اور گناہوں کو سامنے لا کر مجھے بچایا۔ نہیں تو پہنچ نہیں روشاک کتنے عرصہ تک آدم زادی اور اس کے گھر والوں کو اذیت ناک حالات سے دوچار رکھتا۔ میری اور میرے قبیلہ والوں کی آپ سے التجا

ہے کہ آپ آئندہ بھی ہم سے ملاقات کرتے رہیں گے۔ میں اپنی ذات اور اپنے پورے قبیلہ والوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر آپ ہمیں خدمت کا موقع دیں تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔“ سردار نے التجائیہ انداز میں کہا۔

رولوکا بولا۔ ”سردار! میں خود بھی آپ کی قدر کرتا ہوں اور زندگی بھر آپ کو یاد رکھوں گا، آپ جیسے بہت کم ایسے ہیں جو حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں، میری نظر میں آپ بہت عظیم ہیں، اب میں اجازت چاہوں گا کیونکہ ایک اور ضروری کام نمٹانا ہے اور جیسے ہی موقع ملا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ویسے آپ جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں۔ آپ سے زیادہ دوری پر نہیں ہوں، میں آپ کے تمام قبیلہ والوں کی عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میری جب بھی ضرورت پڑے آپ بلا جھجک مجھے یاد کر سکتے ہیں۔“ رولوکا نے سردار سے مصافحہ کیا اور ہاتھ اٹھا کر قبیلہ کے تمام جنات کو الوداع کہا اور پلک جھپکتے ہی اپنی جگہ سے غائب ہو گیا۔

رولوکا وہاں سے نکل کر حکیم وقار کے مطب نہیں گیا بلکہ وہ سیدھا خوشبو کے گھر آ گیا۔ خوشبو کے گھر سے تھوڑی دور آ کر ایک باغ میں نمودار ہوا۔ اس وقت کوئی باغ میں موجود نہیں تھا۔ باغ سے چلتا ہوا رولوکا خوشبو کے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

چند منٹ بعد ہی رولوکا خوشبو کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے پر ایک سات آٹھ سالہ بچہ اپنی مستیوں میں مست تھا۔ رولوکا بولا۔ ”بیٹا! آپ اندر جا کر ذرا دیکھیں۔ خوشبو کے والد عتیق صاحب گھر میں موجود ہیں۔ انہیں بتائیے گا کہ حکیم کامل آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

بچہ نے کہا۔ ”جی اچھا۔“ اور گھر کے اندر چلا گیا۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ خوشبو کے والد عتیق صاحب باہر آئے اور رولوکا کو دیکھ کر فوراً مصافحہ کیا اور بولے۔ ”حکیم صاحب آپ اندر آئیں۔“ بیشک کا دروازہ پہلے ہی کھل چکا تھا۔

عتیق صاحب کے ساتھ رولوکا کمرے میں آیا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ عتیق صاحب بھی رولوکا کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے اور بولے۔

”حکیم صاحب میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ کا ہم پر اور ہماری آنے والی نسلوں پر بھی احسان رہے گا۔ چند دنوں سے ہم بہت ہی خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ کئی دن ہو گئے وہ جن پلٹ کر نہیں آیا، ورنہ وہ تو ہر روز بلانا تھا آدھمکتا تھا۔

ہم آپ کا کسی صورت بھی احسان نہیں اٹا سکتے۔ ہم اللہ کے حضور دعا ہی کر سکتے ہیں اور اس شکی کا صلہ آپ کو اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔ آپ جیسے لوگ دنیا میں بہت کم ملیں گے، مجھے لگتا ہے کہ اس جن کو آپ نے اپنے گھٹنے میں جکڑ لیا ہے ورنہ وہ آتا ضرور۔

آپ تعریف رکھیں میں خوشبو کو بلاتا ہوں، باقی تفصیل وہ خود آپ کے گوش گزار کرے گی۔“ اور یہ بول کر عتیق صاحب اٹھے اور گھر کے اندر چلے گئے۔

چند پل میں ہی خوشبو جیسے بھاتی ہوئی کمرے میں آئی اور رولوکا کو سلام کیا۔

رولوکا بولا۔ ”خوشبو بیٹا جیتی رہو! اور تمہیں مبارک ہو۔“

”حکیم صاحب! آپ کس بات کی مبارک باد دے رہے ہیں، مجھے لگتا ہے کوئی اہم بات ہے، آپ کھل کر بتادیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔“ خوشبو بولی۔

”اچھا تم اطمینان سے بیٹھو! میں بتاتا ہوں۔“ یہ سن کر خوشبو رولوکا کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور رولوکا کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

”اچھا خوشبو بیٹا! یہ بتاؤ کہ وہ بد بخت جن آیا تو نہیں؟“ رولوکا نے کہا۔

خوشبو بولی۔ ”جی حکیم صاحب! چند دن پہلے دن کے وقت بدحواس گھبراہوا آیا تھا۔ حالت بہت خندوش تھی۔ اس پر عجیب طرح کی کپکپی طاری تھی۔ آتے ہی لڑکھڑائی آواز میں بولا۔ ”خوشبو اٹھو! چلو میرے ساتھ، تمہیں میں لینے آیا ہوں، فوراً اٹھو میرے پاس وقت

بہت کم ہے، اگر تم رضامندی سے میرے ساتھ نہ گئیں تو میں تمہیں زبردستی اٹھا کر لے جاؤں گا۔“

میں خود اچنبھے میں تھی اور یک ناک اسے دیکھے جا رہی تھی، میرا حواس میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس کی باتیں سن کر جیسے مجھ پر سنگسٹ طاری ہو گیا تھا، میں کیا کر سکتی تھی، میں تو چیخ کر کئی کئی بار مدد کے لئے بلا بھی نہیں سکتی تھی۔ جب میں بے سدھ کی بستر پر بیٹھی رہی تو وہ طیش میں آ گیا اور فوراً میری کلائی پکڑ لی اور کرخت آواز میں بولا۔ ”چلو اٹھو، جلدی کھڑی ہو جاؤ ورنہ.....“

کہ اچانک کسی ناہیدہ ہستی نے اس کے گال پر ایک زوردار ٹھپھر رسد کر دیا۔ ٹھپھرتا زبردست تھا کہ وہ چکرا کر گھوم گیا اور پھر کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا اور میں غڈ غڈ سی بیٹھی رہی کہ اس وقت میری بہن کھنکشاں کمرے میں آئی تو اس نے میری حالت دیکھ کر گھبرا گئی اور مجھے آواز دی تو پھر جیسے مجھے ہوش آیا۔

اتنے میں نیچے سے امی بھی کمرے میں آ گئی تھیں۔ امی کو دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور جھٹ ان کے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ امی نے بہت تسلی دی اور پھر آپ کا حوالہ دیا کہ حکیم صاحب نے یقیناً ہم پر نظر رکھی ہوئی ہے، وہ کسی صورت بھی غافل نہیں ہو سکتے اور جہاں تک میرا خیال کہ وہ ناہیدہ ہستی ضرور حکیم صاحب کی ہی مقرر کردہ ہوگی، تم فکر نہ کرو، اللہ تعالیٰ غفور الرحیم اور مسبب الاسباب ہے۔ اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ کے گھر دیر ہے اندر نہیں۔ اس دن کے بعد اب تک وہ واپس نہیں آیا۔“

خوشبو نے یہیں تک بات کی تھی کہ اس کے والد کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک کمرے اٹھا رکھی تھی جس میں شربت سے بھرے ہوئے دو گلاس تھے۔ عتیق صاحب نے درمیان میں پڑی میز پر پڑے رکھ دی اور صوفے پر بیٹھ گئے۔

عتیق صاحب کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے رولوکا نے کہا۔ ”عتیق صاحب دراصل اس وقت

میرے آنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ میں آپ لوگوں کو یہ بتا دوں۔

وہ جن زادہ جس کا نام روشاک تھا اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ چکا ہے۔ آئندہ وہ کبھی بھی آپ لوگوں کو تنگ کرنے نہیں آئے گا۔

بد بخت بہت ضدی اور ہٹ دھرم تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ بہت جلد وہ آپ لوگوں کے راستے سے ہٹ گیا، اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ مسلمان جنات قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو مسلمان جنات کے بڑے اہم بزرگ دین دار ہوتے ہیں با اصول اور باشعور بھی ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی انسان کے ساتھ کسی جن کی ناقص شرارت کو برداشت نہیں کرتے اور جو جن اپنی من مانی کرتا ہے اسے اس کے بزرگ قرار دیتی سزا بھی دیتے ہیں۔

اس اصول کے تحت اور چونکہ اس کے والد قبیلہ کے سردار بھی ہیں۔ اس کی زیادتیوں، شرانگیزیوں، احکام خداوندی سے انحراف اور پھر خوشبو کے ساتھ زیادتی کا بہت اثر لیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اس لئے اگر کوئی جن کسی اشرف اور وہ بھی مسلمان کو تنگ کرے تو یہ ٹھیک نہیں، اور وہ ہر حال میں سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

خود اس کے والد نے اسے جلا کر خاکستر کر دیا اور اس طرح اس کا وجود اس دنیا سے ختم ہو گیا اور پھر میں نے بھی آپ کے گھر کے چاروں طرف حصار قائم کر دیا ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لہذا اب آئندہ کوئی بھی ماورائی مخلوق اس طرف کار نہیں کر سکتی۔

عقیق صاحب اب آپ لوگ کھائیں پیئیں خوش رہیں، آگے کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہیں اور ویسے بھی آئندہ اگر میری ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوں۔

نماز پڑھ کر آپ لوگ میرے حق میں بھی دعا کیجئے گا، اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ میں نے آپ کا شربت پی لیا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک اور بھی ضروری کام سے جانا ہے اب مجھے اجازت دیں۔

خوشبو بیٹا! خوش رہو اور بے فکر ہو کر نئی زندگی کی شروعات کرو۔

اس کے بعد رولو کا نے خوشبو کے سر پر ہاتھ رکھا، اور عقیق صاحب سے مصافحہ کر کے دلی حکیم وقار کے مطب کے لئے عقیق صاحب کے گھر سے نکل پڑا۔

☆.....☆.....☆

وقت مقررہ پر رولو کا صبح کے ساڑھے آٹھ بجے مطب میں پہنچا تو حکیم وقار اسے دیکھ کر مسکرانے لگے اور ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ حکیم وقار بولے۔ ”حکیم صاحب اور سنائیں کئی دن تو آپ اس قدر مصروف رہے کہ میں تو ملاقات کے لئے بھی ترس گیا تھا۔“

”جی! میں کیا بتاؤں! ایک ضدی جن سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ کم بخت اپنی ہٹ دھرمی پر اڑا رہا، حالانکہ میری خواہش تھی کہ وہ جس بچی پر عاقبت ہو گیا ہے اس سے منہ موڑ لے اور توبہ وغیرہ کر کے دوبارہ اس طرف کا رخ نہ کرے مگر وہ تو مقابلہ کے لئے ڈٹ گیا، کسی صورت بھی بچی کی جان چھوڑنے پر رضامند نہیں تھا۔

لہذا آخر کار وہ اپنے انجام کو پہنچا یعنی وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اب وہ بچی اور اس کے گھر والے خیریت سے ہیں۔ چونکہ میں پل پل اس کی خبر لیتا رہا تھا، اس لئے وقت نہیں ملا کہ آپ سے ملاقات ہو سکے، میں کیا بتاؤں آپ کو تو پتہ ہے کہ کبھی کبھار کوئی مسئلہ ذرا میڑھا آ جاتا ہے تو وہ زیادہ محنت طلب ہو جاتا ہے۔

خیر آپ سنائیں، آپ ٹھیک تو ہیں ناں! اب آپ جلدی سے چائے منگوائیں، بہت دن ہو گئے آپ کے ساتھ چائے نہیں پی۔“

حکیم وقار نے ملازم کو بلا کر چائے کا ڈور دیا۔ چند منٹ میں ہی چائے آ گئی۔ دونوں چائے پینے لگے۔ اتنے ہی حکیم وقار بولے۔ ”حکیم صاحب آپ کو یاد ہوگا کہ ایک صاحب آئے تھے غالباً ان کا نام تھا۔ پر تاب نگہ، بہت بزرگ تھے۔

ان کی دلی خواہش تھی کہ آپ سے ملاقات کریں

مگر آپ ان دنوں کچھ زیادہ ہی مصروف تھے لہذا انہوں نے اپنی ایک خود نوشت ڈائری دی جس میں ان کے سارے تکلیف دہ حالات درج ہیں۔ اور وہ ڈائری میں نے آپ کو دے دی تھی۔

کل وہ صاحب دوبارہ آئے تھے۔ صبح دس بجے سے دوپہر ساڑھے تین بجے تک آپ کا انتظار کرتے رہے۔ بات کرتے کرتے مرتبہ توبہ آبدیدہ بھی ہوئے۔

میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ بے چارے بہت زیادہ پریشان ہیں کہہ رہے تھے۔ ”کاش! کہ میں نو جوانی میں مر گیا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ روزانہ میں الیٹور سے پرارتھا کرتا ہوں کہ الیٹور اب تو مجھے اٹھالے، اب مجھ سے اپنا کرینا دکھ جھپٹائیں جاتا۔“

ان کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی ساری کہانی ڈائری میں لکھ دی ہے، آپ حکیم صاحب سے بولنے کا مجھ پر دبا کریں اور مجھے اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا دلا دیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں مر جاؤں۔ تاکہ اس دکھ سے میری جان چھوٹ جائے۔“

”ارے ہاں! یاد آیا، آپ نے وہ ڈائری مجھے دی تھی۔ اور میں نے اس کے چند صفحات پڑھے بھی تھے، مگر درمیان میں یہ عقیق صاحب کی بچی والا کیس آ گیا، اور میں اس میں مصروف ہو گیا۔ خیر میں آج رات میں اس ڈائری کو منفصل پڑھوں گا۔ پھر حالات کے پیش نظر کوئی حتمی قدم اٹھاؤں گا۔“ رولو کا بولا۔

تھوڑی دیر میں دونوں نے چائے پی لی۔ حکیم وقار کے پاس سے رولو کا اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور ادویات کے نسخے وغیرہ دیکھنے لگا۔ شام کے بعد وہ وقت مقررہ پر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کھانے وغیرہ سے وہ پہلے ہی فارغ ہو چکا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اسے خیال آیا۔ ”پر تاب نگہ والی ڈائری نکالوں اور پڑھوں کہ دراصل مسئلہ کیا ہے؟“

رولو کا نے پر تاب نگہ کی ڈائری نکالی اور پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

”میں گاؤں سے شہر کالج میں آ گیا اور بیٹے ہوئے حالات اور واقعات کو فراموش کر بیٹھا۔ وقت

کے ساتھ ساتھ میں پڑھائی میں مگن رہنے لگا۔ ایک کمرے میں ہم دو اسٹوڈنٹ رہتے تھے۔ میرے رومیٹ کو ہارر واقعات اور خوفناک ڈرامائی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا بلکہ اکثر اپنی ڈائری میں وہ خوفناک واقعات بھی لکھتا رہتا تھا۔

ایک دن میں نے اس کی ڈائری اٹھائی۔ اس وقت وہ کمرے میں نہیں تھا۔ دو دن کے لئے اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ ڈائری کی تحریر میں نے پڑھنی شروع کی۔ لکھا تھا۔

ایک شخص ایک جنگل سے گزر رہا تھا، رات کا وقت تھا چاروں طرف گھپ اندھیرا مسلط تھا، آسمان پر کالے بادل منڈلا رہے تھے۔ ہوا بندھی درختوں کے پتے بھی شاید دم سادھے بڑے تھے۔ سارے جنگل میں جان لیوا خاموشی طاری تھی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ رات کا اندھیرا اور خاموشی اس شخص کے دل پر آہستہ آہستہ اپنا اثر جاری تھی اور ایک طرح کا انجانا خوف اس کے دل میں اترتا جا رہا تھا حالانکہ وہاں اس کے علاوہ کوئی اور نہ تھا لیکن پھر بھی وہ مسافر خوف بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہوا تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے احساس ہونے لگا کہ کوئی ہے جو کہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

وہ سامنے چلتے چلتے رک گیا اور مڑ کر پیچھے دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اس نے اپنے بائیں طرف دیکھا تو اس طرف بھی کوئی نہ تھا مگر جب اس نے دائیں طرف دیکھا تو اس طرف کچھ تھا..... شاید کوئی عورت تھی۔ جو اپنے لیے بال بکھرائے کھڑی تھی۔ مسافر کا دل ہولنے لگا۔ دفعتاً ہوا چلنے لگی اور پھر عورت پاگلوں جیسی سردھنے لگی۔

”اوہ بھگوان! یہ تو جڑیل ہے۔“ مسافر دل ہی دل میں بولا۔

اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا لیکن اس کے پیروں سے جیسے کسی نے..... کئی کئی من کے وزنی پتھر باندھ دیئے ہوں۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ

بل سکا۔ وہ اپنی نظر میں اس پر گاڑے رہا جو اس کے خیال میں کوئی چیز بلی تھی۔ مسافر کی پیشانی سے موٹے موٹے پسینے کے قطرے پھٹنے لگے تھے اور اس کا خون منجمد ہونے لگا تھا۔

”کیا بزدلی ہے!“ اس نے اپنے آپ سے کہتے ہوئے اپنی ہمت بندھائی۔ دنیا میں بھوت چڑیل جیسی کوئی چیز نہیں۔ خواہ مخواہ من گھڑت باتیں ہیں۔

وہ مسافر جانتا تھا کہ نژاد دنیا میں بھوت ہیں اور نہ چڑیلیں تاہم اسے وہ نظر آگئے جسے وہ چڑیل سمجھتے ہوئے تھا۔ وہ ایک بلند بھڑائی تھی جس سے ایک بیل لپٹی ہوئی تھی۔ مسافر کا دل چاہا کہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا، وہ قہقہہ لگاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

دفعتاً ایک بڑا الور قریب کے درخت سے پھڑ پھڑا کر اڑا اور مسافر کے سر سے ٹکراتا ہوا نکلتا چلا گیا۔

مسافر کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی، وہ دونوں ہاتھوں کی مضامیں سمجھ کر بھاگا وہاں سے اپنے گھر کی طرف اور جب اسے اپنے آپ کو بستر پر ڈالا تو اس کا بدن بخار میں پھنک رہا تھا۔ وہ کئی روز تک بخار میں مبتلا رہا اور جب تک وہ پوری طرح سے تندرست نہ ہو گیا بھوتوں اور چڑیلوں کے متعلق کتنا اور نہایت ہی بھیانک آواز میں چنچر رہا جیسے کوئی اسے مار ڈال رہا ہو۔

بے شک وہ مسافر اور اس کا قصہ فرض ہے لیکن اس سے تو کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ ایسا جیسا کہ اس مسافر نے محسوس کیا۔ ”ایسا واقعہ تو زیادہ تر لوگوں نے اکثر مرتبہ نہیں تو ایک آدھ مرتبہ تو ضرور محسوس کیا ہوگا۔“

بھوتوں، چڑیلوں اور خبیثوں وغیرہ سے انسان نے اس وقت سے ڈرنا سیکھا ہے جب وہ غاروں میں رہتا تھا اور اسی وقت سے انسان اس ناقابل فہم مخلوق سے جس کا دراصل کوئی حقیقت نہیں مگر انسان اس وقت سے ڈرتا آیا ہے۔ چاہے سائنس جتنی ترقی کر لے انسان بھوتوں، چڑیلوں سے ڈرتا رہے گا۔ انسان میں اس خوف کی جڑیں بہت گہری ہوئی ہیں اور دنیا کے اس دور تک پہنچی ہیں جسے کہ تاریک دور کہتے ہیں۔ خوف! وہم

سے بڑھ کر حقیقت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ افریقہ کے وحشیوں کی بات تو دور ہے کیونکہ یہ لوگ تو بھوتوں کی دنیا میں جیتے ہیں۔

لیکن مہذب دنیا والے بھی اس وہم میں ان وحشیوں سے پیچھے نہیں ہیں۔

یہ بات مشہور ہے کہ کالی بلی اور کالا کتا بھوت ہوتا ہے اور ہندوؤں کے یہاں جب کوئی بے موت مرتا ہے تو وہ راکش بن جاتا ہے اور زندہ انسانوں کو ستایا کرتا ہے اور بسا وقت اپنے دشمنوں کا خون تک پی جاتا ہے۔ یہی راکش اگر یزیدی زبان میں ویجاڑ کہلاتا ہے۔

انسان کا وہم اب وہم نہیں رہا بلکہ یقین میں بدل گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اندھیرے، بند کمروں، مدت سے خالی پڑے ہوئے مکانوں اور سستان کھنڈروں وغیرہ میں اکثر لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اگر ہر شہر میں نہیں تو اکثر دیہاتوں میں ایسے گھر موجود ہیں جہاں وہ رہتے ہیں چنانچہ ایسے خالی گھروں میں رہتے ہوئے خوف کھاتے ہیں اور ڈرتے ہیں۔

زمانہ قدیم کے برے یا اچھے کے دیوتاؤں کو اگر راضی یا خوش نہ کیا جاتا تو وہ انسانوں پر تباہی نازل کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ انہیں خوش کرنے کے لئے انسان خود انسان کو ان پر بھینٹ چڑھا دیتا تھا۔ افریقہ اور کئی جگہوں پر اب بھی یہ رسم جاری و ساری ہے۔

برے یا شیطان دیوتا دراصل کسی کی بدروح ہوتے تھے اور چونکہ روح کی جان ہوتی ہے اور جان! خون کے بغیر نہیں رہ سکتی اس لئے ان دیوتاؤں کو خون کی پیاس ہوتی ہے یعنی زندہ رہنے کے لئے انسانوں کو ان پر بھینٹ چڑھا کر ان دیوتاؤں کی پیاس بجھائی جاتی تھی یا بجھائی جاتی ہے۔

اگر بدروح کو خون نہ ملے تو ظاہر ہے کہ وہ خفا ہو جائے اور پھر اس کی خفگی قحط، سیلاب یا طاعون امراض کی شکل میں ظاہر ہو کر انسانوں کو برباد کر دیتی۔ دریائے نیل کی جیجی ایک بدروح تھی۔ جسے خوش رکھنے کے لئے مصری ہر سال ایک کنواری لڑکی کو دریا میں

غرق کر دیتے تھے۔ مصریوں میں یہ رسم اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ مسلمانوں نے مصر کو فتح نہ کیا۔ قحط سالی کا خوف سب سے بڑا خوف ہے چنانچہ انسان کو بھینٹ چڑھا گیا، رسم عموماً آج بونے کے موسم میں ادا کی جاتی تھی کہ دیوتا خوش ہوں اور غلہ خوب پیدا ہو۔ لہذا سرسبز اور شاواب وادی کی پر پیچ گھائیوں میں بے لگے لوگ راگھروں کو اغوا کر لیتے اور لے جا کر انہیں قتل کر دیتے تھے اور پھر جشن مناتے تھے کہ ہمارے اس اقدام سے دیوتا خوش ہوگا اور ہماری زندگی پر قبضہ گزرے گی۔

یہی نہیں بلکہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی فوجوان لڑکے کو اغوا کر لیتے تھے اور پھر اس لڑکے کو ایک جگہ کھڑا کر دیتے اور اس لڑکے کے جسم میں مختلف جگہوں پر چھید کر دیتے تھے جس سے لڑکے کے جسم کا سارا خون نیچے کی طرف بہنا شروع ہو جاتا۔ اس خون کو لوگ ایک بڑے برتن میں جمع کر لیتے تھے۔ اور پھر اس خون کو کھیتوں میں چھڑک دیا کرتے تھے تاکہ اس عمل سے دیوتا خوش ہو کر غلہ میں فراوانی کر دے۔ کئی ملک اور علاقوں میں بھینٹ چڑھانے کا رواج آج بھی ہے۔

لیکن انسانی بھینٹ چڑھانے کی رسم جس جگہ اور جس قبیلہ میں سب سے زیادہ ہے۔ وہ بنگال کا ایک ڈراوئیڈ قبیلہ کھنڈ ہے اس کی تفصیل یوں ہے کہ بھینٹ ایک دیوی پر چڑھائی جاتی تھی۔ بھینٹ کی شرط یہ ہوتی تھی کہ ایسا لڑکا یا ایسی لڑکی جو کہ بھینٹ کے لئے وقف ہو۔ بھینٹ چڑھانے سے پہلے اس لڑکے یا لڑکی کو انہوں کھلاتے تھے جس سے وہ اپنا حواس کھو بیٹھتا تھا اور ہاتھ پیر نہیں مارتا تھا۔ لہذا بھینٹ چڑھانے والا پیشوا ایک تیز دھار چھری سے اس کا شہرہ رگ کاٹ دیتا تھا اور یوں دیوی کو خون پیش کرنے کے لئے دیوی کو خوش کیا جاتا تھا۔

خونی آتما، آسیب یا خونی بلا کون بنتا ہے۔ تو خونی آتما بلا چنچل خاص قسم کے مردے بنتے ہیں۔

یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ خونی آتما بلا وہ بنتے ہیں جو کہ بے موت مرے ہوں۔ جس نے خودکشی کر لی

ہو، جو زندگی میں برے کام کرتا ہو اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنی خواہشات اور آرزوئیں پوری کرتا ہو۔ وہ جس کی کوئی آرزو پوری نہ ہوئی ہو اور مرتے وقت جس کی جان کسی چیز میں انک رہی ہو اور جان بڑی مشکل سے نکلی ہو اور پھر بلا وہ لوگ بھی بنتے ہیں جو اپنے والدین کو خوش نہ رکھتے ہوں اور جنہیں والدین نے بد عادی ہو مثلاً بد عادی جاتی ہے کہ ”کم بخت کو مرنے کے بعد بھی چین نہ ملے اور اس کی روح بھٹکتی رہے گی۔“ تو ایسی ہی روہیں دراصل خونی بلا بن جاتی ہیں۔

آج بھی یونان کی سلاوی اقوام میں خونی روح کا محکم یقین موجود ہے اور یہ لوگ آج بھی راتوں میں ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جو ان کے خیال میں خونی روح کو دور رکھ سکتی ہیں۔ جب کوئی مسلمانوں میں مرتا ہے تو اسے دفن کرتے وقت خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ خونی روح نہ بننے پائے اور جب وہ خونی روح قبر سے نکل پڑتی ہے تو وہ سب سے پہلے اپنے دشمن کا خون پیتی ہے چاہے وہ دشمن اس کے گھر کا ہی کیوں نہ ہو، اس کے بعد وہ اپنا دائرہ بڑھاتی ہے اور پھر اسے جو بھی اندھیری رات میں اکیلا ل جاتا ہے تو وہ اس کا خون پی جاتی ہے۔ سلاوی لوگ خونی روح سے بچنے کے لئے طریقہ استعمال کرتے ہیں جب مردہ دفنایا جاتا ہے تو ایک خاص قسم کی لکڑی کا ایک نوکدار کھونٹا بناتے ہیں اور جب مردے کو قبر میں لٹا دیا جاتا ہے تو اس کھونٹے کو مردے کے دل کے اوپر والی جگہ پر رکھ کر اس زور سے اس کھونٹے پر ضرب لگاتے ہیں کہ وہ کھونٹا ایک ہی ضرب میں مردے کے دل کو پیرتا ہوا پشت پر نکل جائے۔

چین میں مشکوک لاشوں کو کھلی فضا میں سرٹنے گلنے اور خشک ہونے کے لئے رکھا جاتا تھا اور اگر مردے کو دفن کر دیا جاتا تو ذرا سے خشک کی بنا پر قبر کھول کر لاشیں نکال لی جاتی تھیں اور پھر انہیں جلایا جاتا اس کے بعد ساری راکھ دریا میں بہادی جاتی تھی۔ اور اکثر قبروں کے چاروں طرف چاول سرخ مرچ اور لوہے کے ٹکڑے بکھیر دیئے جاتے تھے کہ خونی روح ان چیزوں کے اوپر سے



گمشدہ جزیرہ

ساجدہ راجا-ہندواں سرگودھا

کمرے میں ملگجی روشنی پھیلی تھی اور ایک عجیب الخلقت وجود بھی موجود تھا۔ خاتون کی کلائی سے بھل بھل بہتے خون کو اس عجیب الخلقت وجود نے اپنی زبان لمبی کر کے تیزی سے چاٹنا شروع کر دیا اور پھر اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

جسم میں گردش کرتی لہو کو نجد اور دماغ پر رز اطاری کرتی..... ایک خوف ناک کہانی

محسوس کرنے لگا۔ گرینی آنتی جو میرے پاس رہتی تھیں۔ مجھے ایک سڑک پہ نہایت سردی میں ٹھنھری ہوئی ملی تھیں اور میں انہیں اپنے گھر لے آیا تھا جس سے میرا تنہائی کا احساس کچھ کم ہوا تھا اور میں اتنے بڑے گھر میں خود کو اکیلا نہیں محسوس کرتا تھا۔

گرینی آنتی بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں میرے ساتھ وہ یوں گل مل گئیں جیسے برسوں سے ہمارا

میرا نام ایڈم ہے اور میں امریکہ نیویارک میں رہائش پذیر ہوں۔ مجھے سیر و سیاحت کا حد سے زیادہ شوق ہے۔ پیسوں کی مجھے کمی نہیں کیونکہ مام اور ڈیڈ اپنی زندگی میں ہی میرے نام اتنا کچھ کھ گئے تھے کہ میں ساری زندگی بیٹھ کے بھی کھاتا تو وہ ختم نہ ہوتا۔ پھر زندگی نے انہیں مہلت ہی نہ دی اور وہ ایک ٹریفک حادثے میں اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔ میں اس بھری دنیا میں خود کو اکیلا

”حکیم صاحب دوست کی ڈائری میں یہیں تک لکھا تھا۔“

بہر حال ان تمام باتوں کو پڑھ کر میں یکدم سناٹے میں آ گیا اور پھر مجھے اپنے بھائی کے ساتھ پیش آنے والے حالات اور واقعات دماغ میں گردش کرنے لگے۔ جنگل میں ہرن کا نظر آنا، گولی لگنے کے بعد ہرن کا بھاگنا اور پھر بھائی نے کچھ دور جا کر اس ہرن کو دبوچ لیا، پھر بھائی کا بے ہوش ہونا، بھائی تک جب ہم پہنچے تو دیکھا کہ ایک عجیب الخلقت آدمی کا کٹا ہوا سر قریب ہی پڑا تھا۔ ہم کسی نہ کسی طرح بھائی کو گھر لے آئے۔ پتا چلی نہ پنڈت جی کو بلایا۔

پنڈت جی آئے تو انہوں نے کٹورے کے پانی پر کوئی منتر پڑھ کر بھائی کے چہرے پر چھڑکا تو اچانک بھائی غراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے منہ سے نکلا۔ ”او پنڈت تو ترنت بھاگ جائیں تو تیرا منکا توڑ کر رکھ دوں گا۔ تو نہیں جانتا میرا نام ”ماندرا“ ہے۔ اس بالک نے بہت بڑی غلطی کی ہے، میں ہرن کے روپ میں تھا کہ اس نے مجھ پر گولی چلا دی۔ پھر بھی میں بھاگا لیکن اس نے مجھے دبوچ لیا اور میری گردن پر چھری چلانا ہی چاہتا تھا کہ میں اپنی اصل چون میں آ گیا۔“

اس کے بعد بھائی کے منہ سے نکلا۔ ”میں اس بالک کو چھوڑ سکتا ہوں۔ لیکن ایک شرط پر۔ اور شرط یہ ہے کہ ترنت میں بکروں کی سمیٹ دی جائے۔“ اور جب میں بکروں کا بھینٹ دیا گیا تو بھائی بالکل ٹھیک ہو گئے۔

حکیم صاحب! اور پھر ایک وقت آیا کہ میرا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا اور میں پڑھائی چھوڑ چھاڑ فوراً گاؤں میں آ گیا۔ میں اکیلا کھیت کھلیانوں میں گھومنے لگا۔ ایک روز میں ایک باغ میں اکیلا بیٹھا تھا کہ اچانک ایک ایسا اجسی سندری سندری میرے سامنے آ گئی اور میری آنکھیں جیسے اس کی سندرتا میں کھو گئیں۔ مجھے اپنا کوئی ہوش نہ رہا اور جب ہوش آیا تو.....“ (جاری ہے)

نہیں گزرتی اور پھر مجبور ہو کر وہ خونی روح قبر سے باہر نہیں نکل سکتی بلکہ وہ قبر میں قید ہو کر رہ جاتی تھی۔ خونی بلا سے بچنے کے لئے چند خاص منتر، مقدس علامتیں مثلاً صلیب، ہلال، ترشول کا نشان، سونے چاندی اور پتھروں کے دانے یا سچے موتی، تعویذ گنڈے، آج بھی کئی ممالک میں استعمال ہوتے ہیں جہاں کے لوگ خونی بدروحوں سے ڈرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے اور تسلیم کر لیا گیا ہے کہ دیہات کسی جوان بیوہ یا کنواری لڑکی سے جنسی تعلق قائم کر سکتا ہے اور کر لیتا ہے۔ بادل دھوئیں یا کسی اور روپ میں اپنی خواہش پوری کرنے آتا ہے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں اکثر اپنے گھر میں اکثر علوں میں کسی پیر صاحب کو کسی مریضہ کے متعلق چند خاص باتیں یا خاص قسم کے فقرے کہتے ہوئے سننے میں آتے ہیں۔

”فلاں لڑکی پر امی کا بھوت آیا ہوا ہے۔“

”کنوارے پن میں عاشق ہوا تھا۔ ہائے بے چاری کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ جب اس پر عاشق نامراد آ سب آتا ہے تو بے چاری کپڑے پھاڑ رنگتی ہو جاتی ہے۔“

اور اگر آ سب مرد نہیں عورت ہوتی ہے جسے عام طور پر چڑیل کہتے ہیں۔ تو وہ مردوں سے جنسی تعلقات قائم کرتی ہے۔ ”اکثر ایسے فقرے سننے میں آتے ہیں۔ ”بھلا چنگا آ رہا تھا کہ راستے میں قبرستان کے قریب اسے وہ چپٹ گئی۔ کون؟“

”ارے وہی اٹلے بیرو والی۔“

یہ بات مشہور ہے کہ چڑیل کے عیرو الٹے ہوتے ہیں۔

کیا گہرو جوان تھا۔ پہاڑ جیسا کڑیل، کم بخت دیکھتے ہی دیکھتے اسے کھا گئی۔ سوکھ کر کاٹنا ہو رہا۔“ بھوت، چڑیل، آ سب، خبیث، خونی، آتما، یا پھر دیہات میں اس قسم کی تمام کمزور عقائد لوگوں کے ہیں۔ حقیقت سے ان کا دور کا واسطہ نہیں۔

ساتھ ہو مجھے مام ڈیڈ یاد تو آتے تھے لیکن ان کی یاد کی شدت کافی حد تک کم ہو گئی تھی گرنی آئی کے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گزرنے لگا اور میں انہی کے کہنے پر انہیں گرنی آئی کہتا تھا۔

انہیں ہر چیز کے بارے میں اتنی معلومات ہوتیں کہ میں حیران رہ جاتا۔ جب مجھے کسی چیز کے بارے میں جانا ہوتا تو میں انٹرنیٹ پوز کرتا تھا لیکن اب مجھے آئی سے اتنی معلومات مل جاتی تھیں کہ نیٹ کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ آئی کی شخصیت میں کچھ نہ کچھ پراسراریت ضرور تھا جسے میں نے بہت بعد میں جانا تھا۔ اکثر جب میں رات کو گہری نیند میں ہوتا تو بغیر کسی وجہ سے میری آنکھ کھل جاتی اور پھر مجھے بہت عجیب سی آوازیں سنائی دینی شروع ہو جاتیں۔ جنہیں میں اپنی کم عمری کی وجہ سے انور کر دیا کرتا تھا۔

ایسی ہی ایک رات جب شدید پیاس سے میری آنکھ کھلی تو میں نے سائڈ ٹیبل پر نظر دوڑائی۔ پانی کا جگ خالی تھا۔ شاید آئی پانی رکھنا بھول گئی تھیں۔

میں یہ سوچ کر بیڈ سے اتر آیا کہ خود جا کر کچن سے پانی پیتا ہوں جب میں آئی کے کمرے کے پاس سے گزرا تو مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا لیکن میں غور کئے بغیر آگے بڑھ گیا، جب میں کچن سے واپس آ رہا تھا تو آئی کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے ایسی آواز سنائی دی کہ میں سر تاپا لرز گیا۔ بہت بھدی اور کرخت آواز تھی، الفاظ تو مجھے سمجھ نہیں آ رہے تھے لیکن اتنا محسوس ضرور ہو رہا تھا کہ کوئی بہت مبذوب انداز میں آئی سے بات کر رہا ہے، اس کے باوجود اس کی آواز بہت ہیبت ناک تھی وہ زبان میری سمجھ سے بالاتر تھی میں ڈرتے ڈرتے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور ساتھ ہی کبل اوڈھ کر لیٹ گیا۔ شدید سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ نہ جانے رات کے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

صبح اٹھا تو وہ واقعہ میرے ذہن سے تقریباً محو ہو چکا تھا۔ بہر حال اس کے بعد میں روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا اور اس کے بعد میری زندگی میں بہت سے

ایسے واقعات رونما ہوئے کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میرے ساتھ کچھ نہ کچھ پراسرار حالات ضرور رونما ہو رہے ہیں اور یہ سب اسی رات کے بعد شروع ہوا تھا۔ جس رات میں نے گرنی آئی کے کمرے سے وہ پرہیز آواز سنی تھی۔ وہ دن میرے لئے اس لحاظ سے اہم تھا کہ ہم تین دوستوں نے سمندر میں موجود اس جزیرے کی سیر کا پروگرام بنایا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جزیرا صدیوں سے یوں ہی ویران پڑا ہے، وہاں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا کہ کوئی وہاں جانا پسند نہیں کرتا تھا اور جو گیا وہ شاذ و نادر ہی واپس آیا۔

میرے دوستوں نے اس کے متعلق معلومات کیں تو انہیں اس جزیرے کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں اور انہیں اس میں ایسا کچھ نظر آیا جو کسی مافوق الفطرت واقعات کی طرف اشارہ کرتا، ویسے بھی یہ سائنسی دور ہے اب ایسی باتیں تو ہم پرستی کی جانب مائل کرتی ہیں۔

بہر حال جانے سے پہلے میں گرنی آئی کو آگاہ کیا تو ان کا رد عمل شدید تھا وہ کسی صورت میرے اس جزیرے پر جانے کے حق میں نہیں تھیں، ان کے چہرے پر ڈر لے کے سے آثار تھے کہ میں بھلا کیا کر کے والا تھا۔

دوسری صبح ہماری رواجی گئی اور اس سے ایک شام پہلے کی بات ہے۔ آئی سرشام ہی اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھیں، انہوں نے سختی سے مجھے منع کیا تھا کہ میں نہ تو انہیں ڈسٹرب کروں اور نہ ہی کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کروں، میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

لیکن جب وہ کمرے میں بند ہوئیں تو اس کے چند لمحوں بعد میں ہی لاٹھ سے ملحقہ کمرے کی کھڑکی کے پاس پہنچ گیا اور اس کو آہستگی سے آگے کی طرف دھکیلا تو اس میں ہلکی سی درز پیدا ہو گئی، اتنی کہ میں با آسانی نظر ڈال سکوں کہ کمرے میں کون کون موجود ہے.....؟

پھر اک بہت عجیب اور ڈراؤنا منظر میری آنکھوں نے دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ گرنی آئی کے آگے ایک انسانی گوشت سے خالی کھوپڑی رکھی ہوئی ہے جس کی

آنکھوں سے آگ سی نکلتی محسوس ہو رہی تھی اور اس کھوپڑی سے کچھ ہی آگے ایک ایسا آدمی، جسے آدی کہنا بھی غلط ہے، موجود تھا اس کی شکل اتنی ڈراؤنی تھی کہ میں چند لمحوں میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ وہ اجنبی زبان میں آئی سے بات کر رہا تھا۔ آئی اس سے سخت لہجے میں کچھ کہہ رہی تھیں اور وہ انکار میں سر ہلارہا تھا۔

اچانک آئی نے اپنے پاس رکھی تیز دھار چھری اٹھائی اور اپنی ٹکائی پر کٹ لگایا۔ خون پھیل پھیلنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ خون کو دیکھتے ہی اس عجیب الخلقت وحشی پر خون سا طاری ہو گیا، وہ آگے بڑھا اور جھپٹ کر آئی کی ٹکائی پکڑ لی اور بہتا ہوا خون اس کے منہ میں جانے لگا اور پھر خون فرش پر گر رہا تھا اس کو بھی اپنی لمبی زبان سے چاٹ لیا۔ اس کے بعد وہ واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آئی نے زخم والی جگہ پر کس کر پٹی باندھی، اس کے بعد آئی نے اس ہیبت ناک آدی سے جوابات بھی کی تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے غائب ہو گیا۔ اس کے غائب ہوتے ہی میں جلدی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”کچھ ہی دیر گزری تھی کہ آئی میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ فحاشیت ان کے چہرے سے ظاہر تھی، میں نے جلدی سے انہیں بیڈ پر بٹھایا اور انہیں پانی کا گلاس پیش کیا جنہیں وہ ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی گئیں۔

جب وہ ڈراسکون سے ہوئیں تو میں نے ان سے طبیعت کی خرابی کی وجہ پوچھی تو وہ ٹال ٹکیں جبکہ وہ نہیں جانتی تھیں کہ میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں۔ پھر انہوں نے مجھے اس جزیرے پر جانے سے روکا تو نہیں لیکن نصیحتیں ضرور کیں اب ان کے چہرے پر مجھے کافی اطمینان نظر آ رہا تھا جیسے کوئی بوجھ ان کے سر سے مل گیا ہو۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ پراسرار علوم پر بھی دسترس رکھتی ہیں لیکن اس کا مجھے پہلے کوئی علم نہیں تھا۔

بہر حال میں نے انہیں تسلی دی کہ ہم اپنی حفاظت کا مکمل بندوبست کر کے جا رہے ہیں انہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میری بات پر انہیں اطمینان تو ہوا

لیکن یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ اتنی مطمئن کس بات پر تھیں.....؟

وقت مقررہ پر ہم تینوں دوست بوٹ پر سوار اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا ہلکی ٹھنڈی ہوا روح کو تازگی بخش رہی تھی۔ بوٹ کے آس پاس بہتا ہوا نیلگوں پانی بہت حسین لگ رہا تھا۔ اس جگہ سمندر اتنا شفاف تھا کہ پانی کے نیچے موجود ہر شے واضح نظر آرہی تھی چونکہ ہوا کا رخ بھی اسی طرف تھا جدھر ہم جا رہے تھے اس لئے ہم نے سوچا کچھ دیر بوٹ کو بند کر کے سمندر کے حوالے کر دیا جائے اور زیر آب مناظر سے لطف اٹھایا جائے۔ چنانچہ بوٹ کو بند کر دیا گیا تو وہ خراماں خراماں ہوا کے زور پر آگے بڑھنے لگی اور ہم تینوں مکمل طور پر انجوائے کر رہے تھے۔

سمندر کے شفاف پانی کے نیچے کے مناظر اتنے خوب صورت تھے کہ ہم تینوں ارد گرد سے مکمل بے نیاز تھے۔ اچانک میں چونک پڑا۔ میں نے پانی کے نیچے کوئی چمکتی ہوئی چیز دیکھی تھی۔ میں نے باقی دونوں دوستوں کو ادھر متوجہ کیا تو وہ بھی حیران ہو گئے۔ وہ گول سی کوئی پتھر نما چیز تھی جو ایک سمندری جھاڑی کے پاس پڑی چمک رہی تھی۔ ہم تینوں متحس ہونگے، آخر طے ہوا کہ چارلس آسکین ماسک پہن کر نیچے جانے اور وہ چیز لے کر آئے۔

چارلس نے ماسک پہن کر سمندر میں چھلانگ لگائی اور اس چمکتی ہوئی چیز کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اور سونگی اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ چارلس اس چیز کے قریب پہنچ گیا اور اسے ہاتھ میں اٹھا کر واپس بوٹ کی طرف آنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ بوٹ میں مجھے اور سونگی کو وہ چیز دکھا رہا تھا، نہ تو وہ کوئی ڈائنڈ تھا اور نہ ہی سچا موتی، وہ پتھر نما تھا لیکن بہت خوب صورت اور اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ ہم نے کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد اپنے سامان میں رکھ لیا تاکہ جزیرے سے واپسی پر اس کا اچھی طرح معائنہ کر سکیں۔

بہر حال رات ہونے میں ابھی وقت تھا۔ ہم نے بوٹ کا انجن خود کار پر سوئچ کر دیا، تاحد نظر سمندر ہی سمندر تھا اور دور تک پھیلی عجیب سی ویرانی۔ ہم پہلی بار سمندر کے

اس دور دراز سفر پر روانہ ہوئے تھے جہاں آبی جہازوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ ہم تینوں اس ماحول کی ویرانی کو اپنے اندر اترا محسوس کر رہے تھے۔ اب ہمیں پتہ چلا تھا کہ شام کا وقت سمندر میں کتنی اداوی لے کر آتا ہے۔

ہم تینوں خاموش تھے ماحول نہ جانے کیوں بوجھل سا ہو گیا تھا۔ دن کو حسین تر لگنے والا سمندر رات میں عجیب سی ہولناک خاموشی میں ڈوبا بہت پر اسرار لگ رہا تھا۔ بوٹ تیزی سے اپنے سفر پر رواں دواں تھی۔ نقشے کے مطابق ہمیں کل تک اس جزیرے پر پہنچ جانا تھا، شاید جزیرے کے مطابق کسی گئی باتیں ہمارے اعصاب پر سوار ہو گئی تھیں۔ اس وجہ سے ماحول بہت پر اسرار لگ رہا تھا۔ اب شام کا اندھیرا ہر سو چھایا رہا تھا۔

اس ہولناک خاموشی کو سونگی کی آواز نے توڑا جو ہمیں کھانا کھانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ہم دونوں خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانے کے ساتھ ہی چارلس نے میوزک آن کر دیا جس نے ماحول کے بوجھل پن کو کافی حد تک دور کر دیا، کھانے کے بعد کافی کا دور چلا جس کے بعد ہمیں نیند آ گئی۔ انجن کو خود کار پر سیٹ کرنے کے بعد ہم سونے کے لئے لیٹ گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائ نے ہمیں جلد ہی نیند کی وادی میں لا پھینکا اور ہم ارد گرد سے بیگانے ہو کر نیند کی وادی میں اترتے چلے گئے۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب ہماری بوٹ کو ایک زور دار جھٹکا لگا ہم تینوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے پھر تو جھٹکوں کا ایک طوفان آ گیا۔ ہماری بوٹ کو مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے اس کی وجہ ہمیں جلد ہی سمجھ آ گئی۔

ایک بہت بڑی شارک ہماری بوٹ کے آس پاس منڈلا رہی تھی اور ذرا ذرا دیر بعد اپنی دم اتنی زور سے بوٹ پر مارتی کہ بوٹ جھٹکا کھا کر رہ جاتی۔ میں نے چیخ کر سونگی کو انجن سنبھالنے کا کہا اور خود اپنے بیک سے ریو اور نکال لایا۔ سونگی نے بڑی مشکل سے خود کو قابو کیا اور انجن کو سنبھالنے لگا۔ چارلس نے سونگی کی مدد کے لئے اس کے ساتھ انجن سنبھال لیا وہ ساتھ ساتھ پیچھے مڑ کر میری

طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ سونگی نے بوٹ کی رفتار میں اضافہ کر دیا لیکن شارک بھی کم تیز نہیں تھی جب وہ کسی صورت واپس نہ مڑی تو میں نے فائر کھول دیا جو اس کی دم پر لگا۔ اس نے ایک جھٹکا ضرور کھایا لیکن اس کی رفتار میں کمی نہ آئی بلکہ وہ غصے میں اور تیزی سے بوٹ سے ٹکرا رہی تھی اور خطرہ تھا کہ بوٹ ان مسلسل لگنے والے جھٹکوں سے الٹ نہ جائے۔ میں نے چیخ کر سونگی کو بوٹ کی رفتار بڑھانے کا کہا اور خود اپنے ریو اور سے دوسرا فائر بھی کر دیا اور تیسرا بھی۔ شارک کے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے اب اس کی رفتار میں کچھ تو کمی آ گئی تھی لیکن کویلوں کی وجہ سے اس کو جو تکلیف ہو رہی تھی اس کی زیادتی کی وجہ سے وہ اپنی دم کو بے چینی سے ادھر ادھر مار رہی تھی جو بوٹ کو بھی لگ رہا ہے تھے اور بوٹ نہایت نازک پوزیشن میں تھی، ہم رفتار بڑھانے کے باوجود شارک کی ریخ سے نکل نہیں پارہے تھے۔ جو نہایت پریشانی کی بات تھی۔ ادھر شارک غصے میں پھر رہی تھی وہ ہماری بوٹ کو ٹکس نہس کرنا چاہتی تھی ہم بھی کسی صورت ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔

بوٹ کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی اور آخروی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا شارک نے جاتے جاتے اتنے زور سے ہماری بوٹ کے ساتھ رگڑا کھایا کہ بوٹ تقریباً الٹ گئی۔ یہ تو شکر تھا کہ جیسے ہی وہ بوٹ سے دور ہوئی بوٹ خود بخود سیدھی ہو گئی اور ہماری رکی ہوئی سانسیں بھی بحال ہو گئیں۔ ہوا یوں کہ شارک نے واپس مڑنے کے لئے پلٹا کھایا اور ہماری بوٹ سے رگڑ کھاتے ہوئے دوسری طرف چلی گئی اس کے بوٹ کے ساتھ رگڑ کھانے سے وہ اٹنی ہوئی لیکن جیسے ہی شارک دور ہوئی اس کے وزن کا زور ختم ہوتے ہی بوٹ خود بخود سیدھی ہو گئی۔

صبح کا ملنگی سا اجالا ہر طرف پھیل رہا تھا اور اس وقت سمندر اتنا حسین لگ رہا تھا کہ ہم رات والی ساری تکلیف اور تھکن بھول کر قدرت کی حسین صبح سے لطف اندوز ہونے لگے۔ ویسے شارک سے یوں مقابلہ بھی ہماری زندگی کا سب سے مشکل نہایت خطرناک مقابلہ تھا اور اس میں ہم کامیاب رہے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ واپس

جا کر ہم نے نہایت مریح مصالحت لگا کر اپنے باقی فریڈ زکو اپنا یہ کارنامہ بتانا تھا۔ ویسے اگر مریح مصالحت نہ بھی لگاتے تو بذات خود یہ ایک نہایت دلورز واقعہ تھا جس کا سوچ کر مجھے آج بھی جھرجھری سی آتی ہے اگر ہم اس رات شارک کا شکار ہو جاتے تو.....؟ یہ سوال ہی مجھے الجھا کر رکھ دیتا ہے بہر حال ہم زندہ سلامت تھے اور اب ہم اپنی منزل کے بارے میں پرہیز تھے۔

جلدی ہی ہمیں جزیرے کے آثار نظر آنے لگ گئے تو ہمارے جوش و خروش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سونگی انجن سنبھالنے میں مصروف تھا اور میں دور بین سے دور سے نظر آنے والے جزیرے کو دیکھنے میں مصروف..... اور چارلس حسب معمول لیٹا ہوا تھا۔ اس سفر کے دوران یا تو وہ سونے میں مصروف رہا یا پھر کھانے اور میوزک سننے میں۔ اس سفر کے دوران ہمیں معمولی نوعیت کے طوفانوں کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔ سونگی اور میں پوری طرح مستعد رہے لیکن چارلس کے کان پر جوں تک نہ رہ سکی۔ خیر جزیرے کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ ہم سم پہر تک جزیرے پر پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے دور بین ہٹا لی اور چارلس کے پاس بیٹھ گیا۔ اب وہ ایک نیا دکھارو نے میں مصروف تھا، اسے اپنی گرل فریڈ بہت یاد آ رہی تھی جو اس کے ساتھ آنا چاہتی تھی لیکن میں نے کسی خطرے کے پیش نظر اسے منع کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ پتہ نہیں سفر کے دوران اور اس جزیرے پر نہ جانے کیسے حالات پیش آئیں۔ وہ لڑکی ہے برداشت نہیں کر سکے گی اور اب مجھے اپنا یہ فیصلہ درست لگ رہا تھا جبکہ چارلس بہت اداں تھا۔ وہ مجھ کو برا بھلا کہہ رہا تھا کیونکہ میں نے ہی اس کی گرل فریڈ کو ساتھ آنے سے منع کیا تھا۔

میں نے اس کو تسلی دی اور کہا ”ہم ایک دو دن اس جزیرے پر رکیں گے اس کے بعد واپس آ جائیں گے۔“ میری بات سے وہ کچھ نابل ہو گیا۔ میں نے اسے دور بین تھمائی کہ وہ بھی جزیرے کو دیکھ لے۔ چارلس دور بین کی مدد سے جزیرے کا جائزہ لینے لگا جبکہ میں سونگی کے پاس بیٹھا ادھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا کہ اچانک بادلوں کے زور

دار گر نے کی آواز نے ہمیں چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے آسمان کی طرف نظر دوڑائی تو کالے بادل پورے آسمان پر پھیلتے نظر آئے۔ سونگی نے اس خطرے کے پیش نظر بوٹ کی رفتار بڑھا دی کہ خدا خواستہ اگر طوفان آ گیا تو جزیرے پر ہم محفوظ بھی ہوں گے اور بوٹ کو بھی کسی محفوظ جگہ پر کھڑا کریں گے۔ چارلس اور میرے چہرے پر بھی تشویش کے آثار تھے۔ سونگی کے خیال میں ابھی مزید آدھے گھنٹے کا سفر رہتا تھا۔ اس نے بوٹ کی رفتار میں خطرناک حد تک اضافہ کر دیا۔ بادلوں کی رنگت سیاہ سے سیاہ ہوئی جا رہی تھی ساتھ میں بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک والوں پر عجیب سی ہیبت طاری کر رہی تھی۔ ابھی مکمل طور پر دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی لیکن بادلوں کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے رات اب آئی کہ تب آئی۔

سمندری سفر، بادلوں کی وجہ سے گھور اندھیرا، طوفان کا خطرہ اور ہم تینوں انسانوں سے قطعی الگ تھلگ، ایسے میں ہمارے دلوں کا خوف کھانا کچھ ایسا عام ہی نہ تھا بے جا بھی نہ تھا۔ اچانک بجلی اتنے زور سے کڑکی کہ ہماری چیخیں نکلتے نکلتے رہ گئیں۔ روشنی کی لکیر آسمان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی اور ساتھ ہی چھما چھم بارش برسنے لگی۔

جزیرے کی حدود کافی قریب آ گئی تھی اس لئے سونگی نے بوٹ کی رفتار میں کمی کر دی، بارش اتنے زور سے برس رہی تھی کہ ہمیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سونگی کو بوٹ کو کنٹرول کرنے میں بہت مشکل پیش آ رہی تھی اس کے باوجود وہ بہت مہارت سے بوٹ کو کنارے پر لایا جیسے ہی بوٹ رکی ہم جلدی سے چھلانگ مار کر نیچاڑ آئے اور سب سامان کو ایک محفوظ جگہ منتقل کرنے کے بعد بوٹ کو ایک محفوظ جگہ پر لنگر انداز کیا اور خود بارش سے بچنے کے لئے ایک گھنے درخت کے نیچے پناہ لے لی۔ تیز بارش کی وجہ سے دور تک دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ کافی تیز ہوا بھی چل رہی تھی جس کی وجہ سے تیز بارش ہمیں درخت کے نیچے بھی بھگور رہی تھی۔

اچانک میری نظر زمین پر پڑی تو میں حیران رہ

گیا، میں سوئی اور چارلس کو بھی ادھر متوجہ کیا۔ وہ بھی حیران اور دہشت زدہ ہو گئے بات ہی کچھ ایسی تھی۔ جزیرے کی وہ زمین جہاں ہم کھڑے تھے وہاں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں کیڑے مردہ پڑے تھے۔ ہم نے ارد گرد جہاں بھی نظر دوڑائی وہاں ایسا ہی منظر نظر آیا۔ ہمارے دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہے تھے۔ نہ جانے اس جزیرے پر اتنے کیڑے کہاں سے آ گئے اور پھر وہ بھی سارے ہی مرے ہوئے.....؟

بات بہت خوفزدہ کر دینے والی تھی پہلے ہماری توجہ چونکہ سامان کو اور بوٹ کو محفوظ کرنے کی تھی اس لئے ہم نے ادھر توجہ نہیں دی اب توجہ کی تو بہت وحشت سی ہو رہی تھی۔ ”یار ایڈم مجھے تو یہ جگہ واقعی بہت پراسرار لگ رہی ہے۔ دیکھ اتنے سارے کیڑے.....! زمین کا کوئی حصہ بھی خالی نظر نہیں آ رہا اور اوپر سے بارش۔ یار سو کبھی اتنی ڈراؤنی بارش ہم لوگوں نے کب دیکھی؟“ یہ چارلس تھا جس کے چہرے اور لہجے سے بھی خوف ٹپک رہا تھا۔ میں نے غور سے آس پاس نگاہ دوڑائی واقعی اس کی بات درست تھی واقعی وہاں عجیب سی وحشت ناک صورت حال تھی اور بارش کے زمین پر گرنے سے بہت ڈراؤنی سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ جسے میں کوئی بھی نام دینے سے قاصر ہوں۔ بہر حال اب اگر ہم ادھر آ ہی گئے تھے تو کچھ نہ کچھ تو سراخ تو لگانا ہی تھا کہ پوری دنیا اس جزیرے سے کیوں اتنی خوف کھاتی تھی.....؟

بارش کا کچھ زور و ثروت رہا تھا ہوا تیز ضرور تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ سمندر میں غطیانی آتی۔ آسمان اب بھی کالے گھنگھور بادلوں سے بھرا ہوا تھا اس کی تاریکی میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بادلوں کی گرج ابھی بھی جاری تھی اور بجلی کی کڑک دلوں کو سہارا بنی تھی۔

”تم لوگ بہت زیادہ خوف زدہ نہیں ہو؟“ میں نے باری باری دونوں کے چہرے دیکھے لیکن اندرونی طور پر زیادہ خوفزدہ نہیں تھے۔ میری بات پر انہوں نے نفی میں گردن ہلائی جبکہ چارلس میری توجہ کے برعکس بولا۔ ”اب تو میں ہر چیز کا مکمل سراخ لگا کر جاؤں گا۔“

میں نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی اور جواب دہ بولا۔ ”میں نے اپنی گرل فرینڈ کو مرعوب بھی کرنا ہے، تمہیں تو پتہ ہے لڑکیاں بہادر لڑکوں سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔“ اس کی بات پر میرے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

بارش کا زور تو ٹوٹ گیا تھا لیکن ہونا باندی ابھی جاری تھی اب یہاں شہر نے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لئے ہم نے اپنے اپنے بیکز اٹھائے اور جزیرے کے اندر چلنے کے لئے تیار ہو گئے اور پھر جہاں تک ہماری نظر گئی مردہ کیڑے.....

کراہیت تو بہت آئی بلکا سا خوف بھی محسوس ہوا لیکن یہ سوچ کر دل کو ڈھارس تھی کہ وہ مردہ تھے اور ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے..... یہ بات ابھی تک ہمارے ذہنوں میں سوالیہ نشان کی طرح تھی کہ اتنے لاکھوں کی تعداد میں کیڑے مر کیسے گئے، کیا کوئی آفت آئی تھی کوئی بیماری وغیرہ.....! ہم صرف سوچ ہی سکتے تھے کوئی اندازہ قائم کرنا بھی مشکل تھا۔

کچھ دور آگے اونچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ سنگلاخ پہاڑیوں کا سلسلہ.....! اور جو درخت تھے وہ سب سبز تو تھے لیکن ان کی ہیئت کچھ عجیب سی تھی ان کے پتے ہماری زمین کے درختوں کے پتوں سے اور طرح کے تھے بہت عجیب سے جن کی ساخت کے بارے میں بیان کرنے سے قاصر ہوں.....!

اس جزیرے کے زیادہ تر درخت بھی انہی مردہ کیڑوں سے بھرے پڑے تھے لیکن چونکہ بارش بہت تیز ہوئی تھی اس لئے درختوں پر ان کی تعداد تھوڑی تھوڑی تھی۔ وہاں کوئی بھی درخت پھول دار نہیں تھا اور نہ ہی کوئی پانی کی ندی تھی!

جو بے چارے بھٹک کر اس جزیرے پر آتے ہوئے وہ تو بھوک پیاس سے ہی مر جاتے ہوں گے اور یہ کیڑے.....! نہ جانے یہ کب سے مردہ تھے ان کو دیکھ کر تو لگ رہا تھا جیسے یہ ذرا دیر پہلے ہی مرے ہیں کیونکہ ان کے

مردہ اجسام بالکل ٹھیک تھے ہم ارد گرد دیکھتے مسلسل آگے بڑھ رہے تھے تاکہ کسی صاف ستھری جگہ پر اپنا ٹھکانہ سرکس لیکن ہمیں کوئی جگہ خالی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دور تک چھلی پہاڑیاں بہت عجیب سی لگ رہی تھیں میں نے دور تک نگاہ دوڑائی سوائے ان پہاڑیوں کے اور کوئی جگہ اس قابل نہیں تھی کہ وہاں رات بسر کی جاسکتی۔

میں نے سب کی توجہ اس طرف دلائی تو وہ بھی میرے خیال سے متفق ہو گئے ہم نے ایک نسبتاً کم اونچی پہاڑی کی طرف قدم بڑھائے اور اس کی چوٹی پر پہنچ کر جو تھوڑا بہت سامان ہمارے پاس تھا وہ ہم نے نیچے رکھ دیا اور خود بھی بیٹھ گئے، دور تک پھیلے اس جزیرے پر ویرانی ہی ویرانی تھی نہ کوئی جانور نہ کوئی پرندہ.....!

پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ جانوروں اور پرندوں کی وجہ سے کبھی کتنی رونق ہوتی ہے۔ شام ہو رہی تھی اور بادل ابھی تک موجود تھے جس کی وجہ سے کافی اندھیرا تھا۔ چارلس نے نارنج روشن کر لی جو اس نے اپنے پاس موجود بیک سے نکال لی تھی۔ نارنج کی روشنی سے آس پاس کا ماحول کافی حد تک روشن ہو گیا تھا لیکن دن کو محسوس کی جانے والی وحشت اب بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔

بھوک بھی لگ رہی تھی اس لئے کھانا کھانے کے بعد ہم آپس کی گفتگو میں مصروف ہو گئے جو زیادہ تر چارلس کی گرل فرینڈ کے قصوں پر مشتمل تھی۔ جب ان قصوں سے تھک گئے تو سونے کے لئے لیٹ گئے، اچانک مجھے اس چیز کا خیال آیا جو ہم نے سمندر سے نکالی تھی وہ ہمارے بیک میں موجود تھی نہ جانے کیا سوچ کر میں نے اس کو سامان سے نکالا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

چارلس اور سوئی نیند کی وادیوں کی سیر کر رہے تھے۔ اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لئے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ ٹھوس پتھر نما چیز اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ وہ چیز دن کی نسبت اب وہ اتنا نہیں چمک رہی تھی۔ میری نگاہ غیر ارادی طور پر آسمان کی طرف اٹھی، نہ جانے کب بادل چٹھے اور چاند نکل آیا تھا۔ میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی چاند کی چاندنی میں وہ جزیرہ بہت پراسرار لگ رہا تھا۔ ہر سو پھیلی

خاموشی روح تک کو لرز رہی تھی۔ میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا وہ بے سمدہ پڑے تھے، میں آہستگی سے اٹھا اور پہاڑی پر آگے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ چیز میں نے جیب میں ڈال لی اور نارنج اٹھائے آگے بڑھنے لگا، چاند کی روشنی کی وجہ سے بھی ماحول کافی حد تک روشن تھا۔

میں آہستہ آہستہ پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں میں بلا ارادہ ہی آگے بڑھنے لگا چلتے چلتے کافی دیر ہو گئی تو میں کھڑا ہو گیا اتنا زیادہ چلنے کی وجہ سے میں کافی تھکن سی محسوس کرنے لگا تھا اور جب میں نے ارد گرد نگاہ ڈالی تو میں ٹھنک گیا۔

بات ہی کچھ ایسی تھی میں اک ایسی جگہ موجود تھا جو انتہائی خوب صورت تھی، چاند کی دودھ باریش میں سامنے بہتا چشمہ اور اس کے کنارے کے آگے جنگلی پھول اور بھی خوب صورت لگ رہے تھے۔ میں بہت حیران ہوا کہ کہاں وہ ویران وحشت ناک جزیرہ اور کہاں یہ حسین وادی.....؟ آس پاس اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں نے سوچا کہ واپس جا کر چارلس اور سوئی کو بھی اس جگہ کا بتا کر ادھر ہی لے آتا ہوں۔ وہ دونوں بہت خوش ہوں گے۔ یہ سوچ کر میں نے واپسی کے لئے قدم اٹھائے۔ جب مجھے چلتے چلتے کافی دیر ہو گئی اور مجھے واپسی کا راستہ نہ ملا تو میں بہت پریشان ہو گیا۔ آخر تھک ہار کر میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں واپس کی طرف لیتے سے جاؤں پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ صبح ہو تو دیکھی جائے گی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مجھے سلاتا شروع کر دیا اور کچھ ہی دیر میں، میں بے سمدہ ہو گیا۔

دن چڑھے میری آنکھ کھل گئی میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چارلس اور سوئی تو کافی پریشان ہو گئے ہوں گے۔ میری پریشانی بڑھ گئی۔ میں پھر اٹھ کر اسی راستے پر جانے لگا جہاں سے رات کو آیا تھا لیکن کافی کوشش کے بعد بھی مجھے واپسی کا راستہ نہ ملا اور پھر سہ پہر بھی ڈھلنا شروع ہو گئی تھی، میں تقریباً نیم پاگل سا ہو گیا۔ راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری ہمت جواب دے گئی اور میں

بیسہ بالکل بدل چکا تھا سر اور داڑھی کے بال مونڈ دیئے

93 March 2013

Dar Digest 92

2 March 2013



خون جگر

عامر ملک - راولپنڈی

اچانک کمرے میں آواز گونجی تیرا خالق لامحدود قوتوں کا مالک
ہے شیطان وقتی طور پر گمراہ کرتا ہے لیکن بالآخر اسے شکست
ہوتی ہے اپنی نفسانی خواہشات کے لئے تو نے شیطان کی پناہ
چاہی اور تو زندگی بھر کے لئے اذیت سے دو چار ہو گیا۔

دل دہلاتا اور رو گئے کھڑے کرتا شاخسانہ جسے پڑھنے والے دنگ رہ جائیں گے

ایک بہن رشیدہ کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے گھر میں
خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔ قدرت نے مجھے صحت
تو اچھی دی تھی۔ میرا جسم بھی مضبوط اور توانا تھا مگر میرا
رنگ کالا تھا۔ چہرے کے خدو خال بد نما تھے چہنچہنی ناک
اور بندر جیسا چہرہ دیکھ کر لوگ نفرت سے منہ پھیر لیتے
تھے مگر میرے دل میں کوئی بھی نہیں جھانکتا تھا کہ اسے
میرے اندر کے خوبصورت انسان کا اندازہ ہو سکے۔

برسوں پر انا قصہ ہے یہ پاکستان کو معرض
وجود میں آئے بارہ سال بیت گئے تھے ان دنوں میں
ایک سرکاری ادارے میں ملازمت کرتا تھا۔ میں جس
شہر میں کام کرتا تھا وہ ہمارے گاؤں سے چالیس میل دور
تھا اس لئے میں روزانہ گھر سے ہی صبح ڈیوٹی پر شہر جاتا
اور شام کو چھٹی کر کے واپس گاؤں آ جاتا تھا۔ میری ماں
زندہ تھی۔ جبکہ ابا جان کا انتقال ہو چکا تھا۔ مجھ سے بڑی

ہے، نہ جانے کون سی طاقت ہے جو اس کو وہاں پہنچنے نہیں
دیتی؟ ہو سکتا ہے جب میں مری جاؤں تب وہ تم تک
جائے.....؟ تمہارے دوست اسی جزیرے پر موجود
کیڑوں کی غذا بن گئے تھے اور تم اس چمکتی ہوئی پتھر کی
چیز کی وجہ سے محفوظ رہے۔

میرے بچے۔ اس جزیرے پر جب بھی بارش
ہوتی ہے تو وہ کیڑے کچھ وقت کے لئے بے ہوش
ہو جاتے ہیں اور پھر جیسے ہی بارش کا پانی سوکتا ہے خشک
ہوتا ہے تو وہ دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی انسان
ان کو مل جائے تو وہ انسان کو منٹوں میں چٹ کر جاتے
ہیں۔ میرے بچے یہ سب باتیں مجھے اپنے علوم کی وجہ سے
معلوم ہوئیں لیکن میرا علم اس حد تک نہیں پہنچا پار ہا جہاں
تم موجود ہو۔

میں نے پولیس ریکارڈ میں یہ بات محفوظ کرادی
ہے کہ تم جب بھی لوٹو گے اور اس گھر میں واپس آؤ گے
تمہیں سب کچھ ویسا ہی ملے گا تمہاری جائیداد کو نیلام نہیں
کیا جائے گا اور نہ ہی کسی ٹرسٹ کے ہوالے کیا جائے گا۔
اس لئے اب تم جب بھی لوٹو گے تمہیں کوئی پریشانی نہیں
ہوگی، ہو سکتا ہے جب تم بڑھاپے کی سرحد پر ہو، اس وقت
تمہاری واپسی کی کوئی راہ بنے لیکن جب بھی آؤ گے سب
کچھ ویسا ہی پاؤ گے تمہارے لئے بہت سارے پیارے
دعا ئیں۔

تمہاری گرینی آنٹی

میں نے ڈائری پڑھ کر ایک طرف رکھ دی۔ میری
زندگی کے کتنے سنہرے سال ضائع ہو گئے تھے۔ چار لکھ
سولہ پچھتر گئے اور میں بڑھاپے کی سرحد پر کھڑا سوچ رہا ہوں
کہ آیا اس جزیرے پر جانے کا میرا فیصلہ کیا درست تھا؟
یہ کہ وہاں ایسا کون سا ظلم تھا جو انسان کو واپسی کی راہیں
بھلا دیتا تھا؟ لیکن وہاں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد بھی میں
اس کا جواب نہیں جان سکا۔ تو اب کیا جان پاؤں گا؟ وہ چتر
چیز اب بھی میرے پاس محفوظ ہے یادگار کے طور پر.....!

گئے تھے۔
”کیا میں اپنی دنیا میں ہوں.....“ میرے دل
میں اچانک خیال آیا تو میں نے اٹھ کر باہر جھانکا۔ حیرت
انگیز طور پر وہ میرا گھر تھا جو نہ جانے کتنے سال پہلے میں
چھوڑ کے گیا تھا اور وہ آج تک ویسا ہی صاف ستھرا تھا یا
شاید میرے آنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں ساری باتوں کو
بھول گیا اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا، سارا گھر گھوم
پھر کر دیکھنے کے بعد میں گرینی آنٹی کے کمرے کی طرف
بڑھ گیا ان کا کمرہ بھی ویسا ہی تھا میں ان کے بستر کے
قریب گیا، ان کے بیڈ کے قریب رکھی چھوٹی سی میز پر
ایک سرخ جلد کی ڈائری اٹنی بڑی تھی، میں نے تجسس کے
مارے وہ ڈائری اٹھالی اور اپنے کمرے میں آ گیا اور اپنے
بستر پر دراز ہو کر پوری محویت سے وہ ڈائری پڑھنے میں
مصروف ہو گیا۔

میرے پیارے ایلیم

تمہارا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں تھک گئی
ہیں۔ نہ جانے کس وقت بند ہو جائیں۔ کاش! امرنے سے
پہلے ایک بار تمہارا چہرہ دیکھ سکتی.....؟
لیکن مجھے معلوم ہے تم زندہ ہو اور جس گورکھ
دھندے میں تم پھنس گئے ہو اس سے نکلنے کے لئے نہ
جانے کتنا عرصہ درکار ہو۔ شاید تمہیں پتہ بھی ہو کہ مجھے
پر اسرار علوم پر کافی دسترس حاصل ہے۔ جب تم نے اس
جزیرے پر جانے کی ضد کی تو میں نے تمہیں بہت روکا
لیکن تم جوان تھے وہی کرتے جس سے تمہیں منع کیا
جاتا، اس لئے میں نے عمل کے ذریعے کالی طاقتوں کے
بیر کو طلب کر لیا اور اسے جینٹل کے طور پر اپنا خون بلایا،
تب جا کر وہ تمہاری حفاظت کرنے پر رضامند ہوا لیکن
وہ اس وقت تمہاری مدد کر سکتا جب تم مکمل طور پر بے بس
ہو جاتے لیکن ایسا کوئی موقع نہ آیا اور ایک رات تم غلطی
سے اس علاقے میں قدم رکھ بیٹھے جہاں سے واپس آنا
انسانی بس کی بات نہیں تھی۔ جس بیر کو میں نے تمہاری
حفاظت پر معور کیا، وہ بھی اس علاقے میں نہ جاسکا، وہ
آج تک اسی علاقے میں جانے کی کوشش میں مصروف

سب میری ظاہری صورت دیکھ کر نفرت کا انداز اپنانے ہوئے تھے۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ تمام برادری میں صرف ہم ہی مفلس اور غریب تھے۔ یہی غریبی اور بد صورتی نہ صرف میری دشمن بلکہ میرا سب سے بڑا جرم بھی بن گئیں تھیں۔ گاؤں کی جوان لڑکیاں مجھے دیکھ کر طنز پر باتیں کرتیں اور قہقہے لگاتی تھیں۔ انہوں نے مجھے کالا کوا، بند رنگور اور نہ جانے کتنے القابات سے نوازا رکھا تھا۔

گاؤں کا سب سے امیر شخص سلطان خان تھا۔ اس کی جائیداد کا کوئی شاری نہیں تھا۔ وہ میرے ابا جان کا چچا زاد تھا۔ بچپن میں ہی میری مفتی چچا سلطان کی بیٹی ثریا سے کر دی گئی تھی۔ مگر اب جبکہ میرے ابا جان اس دنیا میں موجود نہ تھے اور میری شکل بھی کسی کو نہ بھاتی تھی۔ ساتھ ہی غریبی کا انٹ داغ بھی میری پیشانی پہ سیاہی تھا۔ تو چچا سلطان نے میری اور ثریا کی مفتی توڑنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا سماجی اور معاشی بائیکاٹ بھی کر ڈالا۔ برادری کے دیگر لوگ بھی چچا سلطان کے ہمواز بن گئے اور مجھے ایک اچھوت سمجھ کر مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ میں ان لوگوں کی نفرتیں دیکھ کر بہت کڑھتا تھا۔ اور اوپر والے سے شکوہ بھی کرتا تھا کہ اس نے مجھے بد صورت کیوں بنایا ہے اس کے خزانے میں کیا کمی تھی؟ مگر میں اور کچھ نہ کر سکتا تھا زندگی یوں ہی بے کیف گزر رہی تھی۔

ادھر میری ماں کو میرے سر پر ہر ادیکھنے کی شدید خواہش تھی۔ چچا سلطان کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد انہوں نے برادری کے ہر گھر میں جا کر میرے لئے جھولی پھیلائی مگر میری غریبی اور بد صورتی میرے راہ کی دیوار بن گئیں برادری میں سے کسی نے بھی مجھے رشتہ نہ دیا۔ برادری سے باہر ایک نزدیکی گاؤں میں ایک خاندان ہر لحاظ سے ہمارے ہی معیار کا تھا۔ وہاں میرا رشتہ طے ہو گیا لڑکی کو میں نے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ اس کا نام شمیم تھا۔ وہ بہت ہی خوبصورت تھی رشتہ طے ہونے پر میں اپنی قسمت پر رشک کرنے

لگا۔ میں بہت خوش تھا کہ میرے دل کی مراد پوری ہو رہی ہے۔ امی بھی مسرور تھیں اور زور و شور سے شادی کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ مگر تقدیر میری بدلتی پر مسکرا رہی تھی اور میرا تماشا دیکھ رہی تھی..... اور پھر وہی ہوا کہ میرے سر پر سہرانہ سج سکا اور میری ساری آرزوئیں دم توڑ گئیں۔ ایک صبح اچانک خبر ملی کہ میری منگیت اور ہونے والی بیوی شمیم اپنے گاؤں کے ایک لڑکے کے ساتھ گھر سے فرار ہو گئی ہے۔ اس سے بھی میری بد صورتی کا شہرہ بن لیا تھا۔ جلد ہی یہ خبر صرف گاؤں بلکہ علاقے میں بھی پھیل گئی میں کی کوڑ دیکھانے کے قابل نہ رہا۔ خوب بے عزتی ہو گئی میرے ارمان بھی ادھورے رہ گئے۔ لوگ میرا مذاق اڑانے لگے۔ میں اندر ہی اندر شرمندہ ہو کر کڑھنے لگا۔ میں نے گاؤں جانا کم کر دیا۔ اگر جاتا بھی تو گھر سے باہر نہ نکلتا۔ کبھی مجھے اپنے آپ پر غصہ آتا۔ جی چاہتا کہ خود کی کرلوں ذلت اور رسوائی کی اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ مگر شاید میں بزدل تھا کہ ایسا نہ کر سکا۔ میں اکثر تقدیر بنانے والے سے شکوہ کناں ہو جاتا۔

اے سب جہانوں کے مالک! تو نے مجھے پیدا ہی کیوں کیا تھا؟ میں بھی تیری ہی مخلوق ہوں۔ تیرا ہی بنایا ہوا انسان ہوں۔ تو پھر تیرے ہی تخلیق کئے گئے دوسرے انسان مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ اس سے تو بہتر تھا کہ تو مجھے پیدا ہی نہ کرتا۔ اگر میں اس دنیا میں نہ آتا تو تیری دنیا کا نظام رک تو نہ جاتا۔ سورج، چاند اور ستاروں کی روشنی ماند تو نہ پڑتی۔ میں لوگوں کی طنز بھری باتوں سے توجہ جاتا۔ شکوہ کرتے کرتے میں رو پڑتا۔ پھر سجدے میں گر جاتا اور درود کر پروردگار سے معافی مانگتا کہ تیری ذات سے شکوہ کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ تو نے جو کچھ مجھے عطا کیا ہے۔ اس میں بھی تیری کوئی مصلحت ہوگی۔ میں تیرا گناہگار بننا ہوں۔ میں تمام عمر بھی تیرا شکر ادا کرتا رہوں تو کم ہے۔ بے شک تو بخفا ہے، جہاں ہے، قہار ہے، میں، تیری ذات سے ناامید نہیں ہوں۔ نہ

جانے کب تیری رحمت جوش میں آجائے اور تو مجھے مالا مال کر ڈالے۔ میں اسی یقین کے سہارے زندگی کے دن گزار رہا تھا کہ ایک روز میری ماں میرے سر پر ہر ادیکھنے کی خواہش لئے اس دنیا سے کوچ کر گئی۔ مجھے ماں کے جانے کا بہت ہی دکھ ہوا۔ میں اس روز بہت ہی رویا تھا..... میری اس تنہائی اور بربادی کا ذمہ دار میری نظروں میں صرف میرا چچا ہی تھا۔ جس نے میرے ارمانوں کے پھولوں کو مسمل ڈالا تھا۔ اس کی دولت اور گھمنڈ نے میری ماں کی جان لے لی تھی۔ میرے دل میں چچا سلطان کے خلاف نفرت کا لاوا ابل رہا تھا۔ مگر میں مجبور اور بے کس تھا کہ میں اس کا کچھ بھی نہ لگاؤں سکتا تھا۔ میں جب بھی چچا سلطان یا ثریا کو دیکھتا تو میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی۔ میں اپنے آپ میں نہ رہتا انہوں کی بے وفائی اور ستم ظریفی کی آگ مجھے جلائی لگتی گاؤں میں رہنا اور جینا میرے لئے نذاب بن گیا تو میں نے گاؤں کو خیر آباد کہہ دیا اور مستقل طور پر شہر میں رہائش رکھ لی۔ گاؤں میں اب میرا تھا بھی کون..... سوائے ایک بہن کے..... میں کبھی کبھار اس کی خبریت معلوم کرنے گاؤں چلا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اور میرا گاؤں سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ تقدیر نے مجھے بھری دنیا میں تنہا کر دیا تھا۔ اور تنہائی کے درد نے میری زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ میں اندر میری راہوں پر لڑکھانے لگا تھا۔ میں سوچتا تھا۔ یہ آرزوئیں اور ان کی تکمیل بھی کیا شے ہے کبھی بھی تو یہ انسان کی زندگی کو خوشیوں سے مالا مال کر دیتی ہے اور کبھی ان کی زندگی اجیرن بنا دیتی ہے۔ میں جس دفتر میں ملازم تھا وہاں میری دوستی صرف ایک شخص سے تھی۔ اس کا نام برکت تھا۔ میں اب شہر میں اسی کے ساتھ رہتا تھا میں ایک دوبار برکت کے ہمراہ اس کے گاؤں بھی جا چکا تھا۔ ہم جس محلے میں رہتے تھے وہاں زیادہ تر لوگ بال بچوں والے تھے ہمارے سامنے والے گھر میں

جو لوگ رہتے تھے وہ بہت ہی امیر تھے اور پر لطف زندگی گزار رہے تھے جلیلہ کا تعلق اسی گھرانے سے تھا۔ میں نے پہلی بار جلیلہ کو دیکھا تو پلکیں جھپکنا بھول گیا جلیلہ قدرت کا ایک حسین شاہنشاہ تھی اس جیسی خوبصورت لڑکی میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں اسے دیکھ کر اپنا آپ بھلا بیٹھا۔ صرف جلیلہ یاد رہی۔ لگتا تھا میں دیوانہ ہو گیا ہوں اس کا لہذا، خوبصورت نقش اور حیا کی سرخی سے بھرپور چہرہ دیکھ کر میں بے خود ہو گیا میں ہر لمحہ اس کی سندراتاں میں گھویرا ہوتا تھا اس کے حسن کی تاب میری آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ جب میں ہوش کی دنیا میں آتا تو اپنی بد نصیبی اور بد صورتی پر آنسو بہانے لگتا۔ کہ میں ایسے خواب دیکھنے کا حق نہیں رکھتا۔ جلیلہ میرے لئے نہیں بلکہ کسی شہزادہ گفغاں کے لئے بنا کر اس دنیا میں بھیجی گئی ہے وہ میرے خوابوں کی ملکہ نہیں بلکہ کسی اور کے خوابوں کی رانی ہے۔ میں نے لاٹھ کوشش کی کہ جلیلہ کو بھول جاؤں مگر میں ایسا نہ کر سکا..... کہ محبت کرنے کا حق تو ہر کسی کو حاصل ہے اور پھر محبت، رنگ و نسل، اونچ نیچ، امیری غریبی نہیں دیکھتی۔ بس یہ ہو جاتی ہے مگر مجھ سے تقدیر نے محبت کرنے کا حق چھین لیا تھا اور ابھی میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ بن گیا تھا۔ پھر بھی نہ جانے مجھے کیوں یہ یقین تھا کہ کبھی تو میری مندگی کے چمن کے سر جھائے ہوئے پھول کھلیں گے۔ میری خزاں رسیدہ زندگی میں بھی بہار ضرور آئے گی۔ برکت کی بہن کی شادی طے پا چکی تھی اس نے دفتر سے پندرہ دن کی چھٹی لی اور مجھے بھی اپنے ساتھ گاؤں لے گیا۔ شادی کا ہنگامہ تین دن رہا اور ختم ہو گیا۔ برکت کی خاندان کی گاؤں میں کافی ساری زمینیں تھیں گاؤں سے باہر انہوں نے ایک ڈیرہ بنا رکھا تھا۔ جہاں باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا شادی کے بعد میں اور برکت اسی ڈیرے پر رہتے تھے رات ہم ڈیرے پر ہی گزارتے تھے اور صبح مچھینوں کا دودھ نکال کر برکت کے گھر لوٹ جاتے تھے برکت کے گھر والے مجھ سے مانوس تھے۔ اور گھر کی عورتیں مجھ

سے پردہ نہ کرتی تھیں میں ان لوگوں کے اخلاق اور خلوص سے بہت ہی متاثر تھا۔

وہ دسمبر کا آخری ہفتہ تھا شدید سردی کا موسم تھا۔ صبح کے وقت زمین پر اتنا پالا پڑا ہوتا تھا کہ لگتا تھا جیسے زمین پر کسی نے سفید چادر بچھا دی ہو۔ دور دور تک سفیدی ہی سفیدی نظر آتی تھی۔ وہی صبح ایک ایسی ہی سرد اور نمند کر دینے والی صبح تھی۔ میں اور برکت ہمینوں کا دودھ نکال کر بڑی سی باٹی اٹھائے گاؤں کی طرف جا رہے تھے گاؤں اور دیرے کا فاصلہ آدھے میل سے زیادہ تھا۔ اس شدید سردی کے عالم میں ہم نے دیکھا کہ ایک بھجری زمین پر ایک شخص دو زانو بیٹھا ہوا ہے اس کے سر پر بال نہیں تھے اور جسم پر کپڑا بھی برائے نام ہی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ لباس سے آزاد ہے۔ میں اور برکت اسے اس حالت میں دیکھ کر بہت ہی حیران ہوئے کہ یہ کون ہے؟ بے وقوف جو اس سردی کے عالم میں کھلے آسمان تلے بیٹھا ہوا ہے۔ ہم اپنا بھس دور کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھنے لگے کہ وہ کون ہے؟ اور یہاں اس شدید سردی میں کیا کر رہا ہے ہم اس کے قریب پہنچے تو یہ دیکھ کر ہماری حیرانگی اور بھی بڑھ گئی کہ ہر طرف سفید پالا پھیلا ہوا تھا مگر وہ شخص جہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس جگہ اور اس کے ارد گرد چاروں طرف دو دو فٹ کے فاصلے تک پالے کا نام و نشان نہ تھا۔ پھر بھی اس پر سردی کا اثر انداز ہونا لازمی تھا۔ مگر یوں لگتا تھا کہ اسے اس سردی کی شدت کا احساس ہی نہیں ہے۔ اس نے ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور پھر بیگانہ سا بن کر اپنے آپ میں مگن ہو گیا۔ اس نے ہمیں نظر انداز کر دیا۔ مگر ہمیں اس پر ترس آنے لگا۔ برکت نے اسے مخاطب کیا اور دودھ کی باٹی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اندر ڈال کر بلانے لگا۔ مٹی دودھ میں گل ہو گئی اور وہ
کا رنگ بدل کر مثیالہ سا ہو گیا تمام دودھ گدلا
ہو گیا..... تو وہ بولا..... ”لو اب تم یہ دودھ پی لو۔“
ہمیں اس کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا جی
کہ اس کی بٹائی کریں کہ اس نے دس بارہ کلودودھ خرا
کر ڈالا تھا مگر ہم نے صبر سے کام لیا اور اس سے کہا۔
”اب یہ سارا دودھ تم ہی پیو گے۔ اگر تم نے
دودھ نہ پیا تو ہم تمہیں زبردستی یہ سارا دودھ پلا
دیں گے۔“ اس نے ہمارے غصہ کا اندازہ نہ لگایا۔ اور خاموش
رہا۔ اس نے ایک بار پھر نظریں اٹھا کر باری باری
دونوں کو دیکھا اور پھر دودھ کی باٹنی سے اپنے ہونٹ
کر دودھ پینے لگا۔ اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے
تمام دودھ پی گیا اس نے جب خالی باٹنی ہمارے طرف
بڑھائی تو ہم حیران رہ گئے کہ وہ ایک مرل سا انسان
ہے دس بارہ کلودودھ اسکے پیٹ میں کیسے سما گیا ہے
چونکہ سردی زیادہ تھی اس لئے ہم نے اس سے مزید ک
بات کرنی مناسب نہ سمجھی اور گاؤں کی طرف
پڑے۔ راستے میں ایک کنواں پڑتا تھا۔ برکت
رک گیا اور پانی نکال کر باٹنی کو دھونے لگا۔ باٹنی دھو
سے قبل برکت نے اس باٹنی کے اندر گئے ہوئے دودھ
کے قطروں کو اپنی انگلی سے لگا کر زبان پر لگا تا تو ح
حیرت زدہ ہو گیا کہ دودھ کے وہ قطرے شہد
زیادہ میٹھے تھے۔ برکت کے کہنے پر میں نے بھی
قطروں کو چکھا تو حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔
ہمیں یہ یقین سا ہونے لگا کہ وہ بابا یقیناً کو
پہنچا ہوا والی ہے۔ یا یہ کہ وہ کوئی جادوگر ہے۔ لیکن
میں کوئی خاص بات ضرور ہے جو اس نے ہمیں یہ حیرا
کر دینے والا تماشا دکھایا ہے۔
ہم گھر آ گئے۔ ناشتہ وغیرہ کر لیا۔ مگر چین
آ رہا تھا کچھ دیر بعد ہم دونوں پھر واپس اسی جگہ
مگر اب وہ بابا داہاں موجود نہ تھا ہم نے ادھر ادھر
مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آیا لہذا ہم ناکام واپس آ گئے۔
صبح جب ہم پھر دودھ لے کر گاؤں کی طرف آنے

سب ایسا ہی کہتے ہیں۔
صاحب نے دفتر میں ایک نیا چڑا اسی رکھا۔
وہ دفتر کا کام تو اچھا کرتا تھا مگر صاحب اس سے
بہت تنگ تھے کیونکہ وہ ہر شخص کو صاحب سے ملنے
کی اجازت دے دیتا تھا۔ جس سے صاحب کے
کام کا حرج ہوتا۔ ایک دن اسی بات پر ناراض ہو
کر صاحب نے چڑا اسی سے کہا۔ ”تم بالکل بے
کار آدمی ہو، تمہارا مجھے کیا فائدہ۔“ میں کیا کروں
حضور۔ ”اگر میں کہوں صاحب اندر نہیں ہیں تو
کوئی میرا اعتبار نہیں کرتا۔“ سب کہتے ہیں کہ بڑا
ضروری کام ہے اور صاحب ہی نے بلایا ہے۔
صاحب نے سختی سے کہا۔ آئندہ یاد رکھو کوئی کچھ
بھی کہے تم پر واہ مت کرو۔ کہہ دیا کرو۔ ”سب
ایسا ہی کہتے ہیں“ بہت اچھا حضور۔ چڑا اسی
صاحب کی تازہ ہدایات لئے کمرے کے باہر
آ کر بیٹھ گیا۔ دوپہر کو ایک موٹی سی عورت آئی
اور باہر بیٹھے ہوئے چڑا اسی کی مطلق پروا نہ کرتے
ہوئے بڑے رعب سے کمرے میں داخل ہونے
لگی۔ ”چڑا اسی نے اسے روکا اور کہا۔ ”آپ
اندر نہیں جاسکتیں“ یہ صاحب کا آرڈر ہے۔ میم
صاحب۔ ”لیکن میں تو صاحب کی بیوی ہوں“
ہاں ہاں۔ چڑا اسی بے پرواہی سے بولا۔ ”سب
ایسا ہی کہتے ہیں۔“
(شرف الدین جیلانی / ٹنڈوالہ یار)

اور ایک جگہ شادی بھی طے ہوئی تھی مگر بعد میں منگنی بھی ٹوٹ گئی اور دوسری لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ گھر سے فرار ہو گئی۔ آپ اس کا یہ مسئلہ حل کر دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اگر میرے جگری یار کی شادی ہوئی تو ہم تمام عمر آپ کو دل میں اور دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔

میں نے بھی برکت کی ہاں میں ہاں ملائی اور درخواست کی کہ وہ میری شادی کا مسئلہ حل کر دیں۔

بابا گنگا رام نے کچھ دیر سوچا اور پھر مجھے اپنے قریب بٹھا کر کہنے لگا۔
”میں تمہیں ایک عمل بتا رہا ہوں اس عمل کے دوران کوئی غلطی نہ ہونے پائے اگر غلطی ہوئی تو نقصان تمہارا ہی ہوگا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر تم نے میرے بتائے ہوئے عمل میں کوئی غلطی نہ کی تو تمہاری شادی ضرور ہوگی۔

میں بہت خوش ہوا۔ اور یہ یقین ہو گیا کہ گنگا رام میرا کام ضرور کرے گا۔ میں نے کہا۔

”آپ مجھے عمل بتائیں۔ میں کوئی غلطی نہیں کروں گا۔“

گنگا رام نے مجھے ہندی زبان کے چند الفاظ بتائے اور کہا کہ مجھے چالیس راتوں میں یہ عمل کسی قبرستان میں بیٹھ کر کرنا ہوگا۔ آدھی رات کو قبرستان میں جا کر کسی جگہ تھوڑی سی آگ جلانی ہے مجھے اپنے ساتھ سرخ مرچیں لے کر جانا ہوں گی۔ جتنی باریہ الفاظ یا منتر پڑھنا ہے اتنی ہی باریہ مرچ اس آگ میں ڈالتے جانا ہے۔ یوں چالیس مرچیں ہر رات کو اس آگ میں جلاتی ہیں۔ میں دن کے بعد مجھے اس لڑکی کے سامنے جانا ہے جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اول تو یہ امید ہے کہ چالیس دن کا عمل مکمل ہونے سے قبل ہی میری اور اس لڑکی کی شادی ہو جائے گی ورنہ عمل کے بعد تو شادی یقیناً ہو جائے گی وہ کیسے ہوگی؟ وہ تمہیں خود ہی وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔

یہ عمل نہایت ہی مشکل اور خوفناک تھا مگر یہ میری زندگی کی رعنائیوں اور خوشی کا مسئلہ تھا اس لئے میں نے

یہ عہد کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے میں گنگا رام کا ہر عمل ضرور کروں گا گنگا رام نے مجھے اپنا دھرم اس کا مکمل بھی دیا کہ اگر میں اسے خط لکھتا چاہوں تو اس پر دستخط کر سکتا ہوں گنگا رام ہندوستان روانہ ہو گیا۔ میں اور میری بھی دو دن بعد شہر ڈیوٹی پر حاضر ہو گئے۔

ثریا کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس کی منگنی ساتھ والے گاؤں کے ملک مکھن خان کے ملک سے ہونا تھی میرے لئے ثریا کو حاصل کرنے اور چچا سلطان سے بدلہ لینے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ میں نے اس سے پورا فائدہ اٹھانے اور ثریا کو حاصل کرنے کی خاطر گنگا رام کا بتایا ہوا عمل شروع کر دیا۔

ہم شہر کے جس علاقہ میں رہ رہے تھے وہاں سے ایک قبرستان نزدیک پڑتا تھا۔ قبرستان کے ارد گرد کافی فاصلے پر کوئی آبادی نہ تھی۔ میں نے وہ وقت قبرستان جا کر ماحول اور حالات کا جائزہ لیا اور ایک گڑھے نما جگہ عمل کے لئے منتخب کر کے مطمئن ہو گیا۔ رات کو گیارہ بجے جب میں اپنے مکان سے نکلا تو ہر طرف ہوا کا عالم تھا۔ منجستہ رات میں لوگ اپنے اپنے گھروں میں نرم گرم بستروں میں دبے پرسکون نیند سو رہے تھے اور میں قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے سردی سے بچنے کے لئے پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ پھر بھی سرد ہوا میں پرچھوٹ کی مانند میرے جسم سے آ رہا ہو رہی تھیں۔ قبرستان میں چھائی ہوئی ویرانی اور سناٹے نے مجھے حد خوف زدہ کر دیا تھا۔ اندھیری رات میں راستہ بھی وارث طور پر نظر نہیں آ رہا تھا مگر میں نے بھی ہمت نہ ہارنے کی قسم کھا رکھی تھی کہ یہ میرے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا ثریا کو حاصل کرنے کی خاطر تو میں آگ کے سمندر میں کودنے کو بھی تیار تھا یہ عمل تو میرے لئے معمولی بات لگ رہا تھا۔

میں پہلی رات جب عمل سے فارغ ہوا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں واپس مکان پر پہنچا تو نڈھال

ساہوکر بستر پر گر پڑا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ دن کو میری آنکھ دیر سے کھلی تو میری طبیعت سنبھل گئی تھی ورنہ رات کو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا انگ انگ دکھ رہا ہے اور میں شدید بخار میں مبتلا ہوں اب میری جھجک اور خوف ختم ہو گیا اور میں ہر رات باقاعدگی سے قبرستان جا کر گنگا رام کا بتایا ہوا عمل کرنے لگا۔

یوں ہی میں دن گزر گئے گنگا رام کے کہنے کے مطابق مجھے بیس دن بعد ثریا کے سامنے جانا چاہئے تھا۔ مگر میں یہ بات بھول گیا۔ میں نہ ہی گاؤں گیا اور نہ ہی ثریا کے سامنے جانے کے بارے میں سوچا۔ مگر عمل مسلسل جاری رکھا۔ یہ سوچ کر کہ چالیس دن بعد میں گاؤں جاؤں گا تو گنگا رام کے بتائے ہوئے عمل کا رد عمل دیکھوں گا میں روز عمل کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ جب میں عمل کے دوران سرخ مرچ کو آگ میں ڈالتا تو وہ جلنے لگتی تھی اور ساتھ ہی دھوئیں میں سے کسی عورت کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ یوں لگتا جیسے کوئی عورت درد کی شدت سے کر رہی ہو اور سرسکیاں لے رہی ہو۔ میں یہی سمجھا کہ یہ ثریا کی سسکیاں ہیں اور گنگا رام کا بتایا ہوا عمل اثر دکھا رہا ہے آخری بیس دنوں میں میں ثریا کی سسکیاں سنتا اور خوش ہوتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ فریاد کر رہی ہو۔ اور ٹپ رہی ہو۔ ثریا نے میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر کے جوازیت مجھے دی تھی میں اس کا بدلہ لے رہا ہوں اور یہ بات میرے لئے تسکین کا باعث تھی۔

چالیس راتیں گزر گئیں تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں نے عمل مکمل کر لیا تھا۔ میں اگلی صبح گاؤں کی طرف چل پڑا تا کہ ثریا کے سامنے جا کر اس کا رد عمل دیکھوں۔ یقیناً اب وہ میرے بارے میں سوچنے لگی ہوگی۔ میں شادی کے سنے بجائے گاؤں جا پہنچا۔ میں گاؤں سے چند قدم کے ہی فاصلے پر تھا کہ میں نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ کوئی جنازہ اٹھائے قبرستان کی طرف جا رہے ہیں۔ میں بھی اسی

سمت چل پڑا اور جنازے میں شامل ہو گیا چلتے چلتے میں نے گاؤں کے ایک آدمی سے دریافت کیا کہ کون فوت ہوا ہے؟

اس کی زبان سے مرنے والے کا نام سن کر میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس لئے کہ وہ جنازہ ثریا کا تھا۔ میری آنکھیں دکھ اور درد کی شدت سے بھر آئیں۔ میں نے اس کی نماز جنازہ میں بھی شرکت نہ کی اور تھکے تھکے سے قدموں سے اپنی بہن کے گھر آ گیا۔ بہن رشیدہ نے بتایا کہ ثریا میں دن قبل بیمار ہوئی تھی۔ اس کی بیماری کسی کی سمجھ میں ہی نہ آتی تھی اس کے پورے جسم میں درد نہیں اٹھتی تھیں اور وہ زور زور سے روئی اور چیختی چلاتی تھی۔ اس کے باپ نے اس کا بہت علاج کرایا شہر میں بڑے اسپتال بھی لے کر گیا۔ مگر اسے کہیں سے بھی آرام نہ ملا۔ بالآخر وہ آج رات مر گئی کسی نے بھی اس کی بیماری نہیں پکڑی کہ اسے چلتے پھرتے کیا ہو گیا ہے بیماری آنا فنا ہی آئی اور اسے موت کے منہ میں لے گئی۔

مگر میں جان گیا تھا کہ ثریا کیوں اور کیسے مری؟ میں نے گنگا رام کے بتائے ہوئے عمل میں غلطی کر ڈالی تھی اگر میں بیس دن کے بعد ملنے آ جاتا تو آج ثریا کا جنازہ نہیں بلکہ اس کی ڈولی اٹھتی۔ مگر اب کچھ بھی نہ ہو سکتا تھا میں اپنے آپ کو ثریا کا قاتل سمجھنے لگا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیوں مجھے ایک سکون اور اطمینان کا احساس بھی ہو رہا تھا کہ اگر ثریا میری نہیں ہو سکی تو کسی اور کی بھی نہیں ہو سکی۔ میں مزید گاؤں میں نہ رکا اور اسی شام واپس شہر لوٹ آیا۔ جب میں نے برکت کو ثریا کی موت کی خبر سنائی تو وہ بھی افسردہ ہو گیا یوں ہی ایک ماہ گزر گیا۔ میں ایک روز گنگا رام کو خط لکھا اور اسے تمام حالات بتائے۔ گنگا رام نے جوابی خط میں مجھے ڈانٹ پلائی کہ تم نے مجھے قاتل بنادیا ہے میں اپنے آپ کو ثریا کا مجرم اور قاتل سمجھنے لگا ہوں اور یہ کک میں تمام عمر محسوس کرتا رہوں گا اس سانحہ کے ذمہ دار صرف اور صرف تم ہو۔ اگر تم عمل میں غلطی نہ کرتے

تو آج ثریا تمہاری ہوتی مگر تم نے میری ساری محنت اور عبادت پر پانی پھیر دیا ہے جی چاہتا ہے کہ میں تمہیں اس جرم کی سزا دوں اور تمہاری تمام عمر شادی نہ ہو سکے مگر نہ جانے کیوں مجھے تم پر رحم اور ترس آ رہا ہے شاید اس لئے کہ تم بد صورت ہو کوئی عورت تمہاری زندگی میں خوشی اور مرضی سے نہیں آئے گی۔ تم نے میری خدمت بھی کی ہے لہذا تمہاری پہلی غلطی سمجھ کر معاف کر رہا ہوں اور مزید ایک عمل بتا رہا ہوں جو نہایت ہی آسان سا ہے۔ میں اس لفافے میں تھوڑی سی راکھ ڈال کر بھیج رہا ہوں۔ اب تم جس لڑکی سے شادی کرنے کے خواہش مند ہو گے یہ راکھ کسی بھی طریقے سے اس کے کھانے میں ملا دینا تمہارے من کی مراد ضرور پوری ہو جائے گی یہ نہایت ہی آسان عمل ہے امید ہے کہ اب تمہیں ناکا کی کام نہ نہیں دیکھنا پڑے گا۔

گنگارام کے خط اور اس کی مہربانی سے میرے من کے مرجھائے ہوئے پھول پھر سے کھل اٹھے اور منزل ایک بار پھر قریب اور آسان دکھائی دینے لگی۔ خط پڑھنے کے بعد مرادھیان فوراً ہی جیلہ کی طرف گیا میں نے اس کے بارے میں سوچا۔ مگر اسے حاصل کرنا نہایت ہی مشکل بلکہ ناممکن کام تھا۔ اس لئے میں نے کسی اور کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ میں نے گنگارام کی بھیجی ہوئی راکھ اپنی جیب میں رکھ لی کہ مجھے جب بھی اور جہاں کہیں بھی موقع ملا۔ میں اپنا کام دکھاؤں گا۔ اب مجھے کسی مخصوص لڑکی سے غرض نہ تھی۔ غرض تھی تو صرف یہ کہ کہیں بھی اور کسی سے بھی میری شادی ہو جائے۔

مزید ایک ماہ گزر گیا تھا۔ ایک شام میں اپنے مکان میں اکیلا تھا ہرکت کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے جیلہ کا چھوٹا بھائی کھڑا تھا۔ اور پریشان سا لگ رہا تھا۔ میرے پوچھنے سے قبل ہی وہ بولا۔ ”بھائی جان! ای بیمار ہیں ابو گھر میں نہیں ہیں امی کو اسپتال لے کر جاتا ہے۔ آپ اس سلسلہ میں ہماری مدد کریں۔“

”کیوں نہیں..... چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے دروازے کی باہر سے کٹڑی لگائی اور اس کے ہمراہ اس کے گھر کی طرف پہل پڑا۔ پھر میں اس کی ماں کو کسی میں بٹھا کر اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے ان کو چیک اپ کیا اور ان کو اسپتال میں داخل کر دیا۔ کچھ ادویات ڈاکٹر نے لکھ دیں کہ یہ بازار سے لے آئیں۔ میں نے مطلوبہ ادویات لا کر دیں اور جیلہ کو ان کے پاس ہی چھوڑ کر واپس آ گیا۔ اور جیلہ کے گھر جا کر اس کے بہن بھائیوں کو ٹیلی دی کہ ان کی ماں جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر میں پانی پینے کے بہانے جن میں چلا گیا۔ ایک ہانڈی میں ساں پڑا ہوا تھا۔ میں نے گنگارام کی دی ہوئی راکھ تھوڑی سی مقدار میں ہانڈی میں ڈالی اور گھر لوٹ آیا۔

دو دن بعد جیلہ کی ماں صحت یاب ہو کر گھر آ گئیں وہ لوگ میرے احسان مند تھے کہ میں نے مشکل وقت میں ان کی مدد کی۔ یوں ان لوگوں سے سلام دعا شروع ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی گنگارام کی بھیجی ہوئی راکھ نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ جیلہ خود ہی میری طرف راغب ہونے لگی اس کے گھر کے سب ہی افراد میرے گرویدہ ہو گئے اور جیلہ کی نہ کی بہانے میرے سامنے آ جاتی اور مجھ سے بات بھی کر لیتی۔ اس روز میں بہت ہی خوش ہوتا آئینے کے سامنے جا کر اپنا بھدرا چہرہ دیکھتا روزانہ شیوہ بناتا اور بالوں کو سنوارتا خوشبوئیں بھی لگاتا۔ یوں لگتا جیسے منزل نزدیک آ گئی ہے میری زندگی میں بہار کا موسم آ گیا ہے پھر ایک روز میں جیلہ کے ماں باپ کو اپنے مکان میں داخل ہوتے دیکھ کر ششدر رہ گیا..... انہوں نے بغیر کسی لگی پٹی کے مجھے جیلہ کے ساتھ شادی کرنے کی پیشکش کر ڈالی..... اب مجھے یقین ہو گیا کہ گنگارام کی بھیجی ہوئی راکھ اپنا کام دکھا چکی ہے..... میں نے جان بوجھ کر انکار کرنا چاہا تو وہ دونوں میری منتیں کرنے لگے اور التجائیہ میں کہنے لگے۔

”ہم تو جیلہ کی خاطر تمہارے پاس سوالی بن

کر آئے ہیں اگر تم نے انکار کر دیا تو جیلہ زندہ نہ رہے گی وہ اپنی زندگی ختم کرے گی وہ ہر وقت تمہاری ہی باتیں کرتی ہے اس کے لبوں پر ہر وقت تمہارا ہی نام رہتا ہے وہ تمہاری دیوانی ہو گئی ہے اس لئے اب تم انکار نہ کرو..... شادی کے بعد ہم تمہیں اپنے گھر رکھیں گے اور جنہیں کاروبار بھی کرائیں گے۔

میں نے مزید منتیں نہ کروائیں اور رضامندی ظاہر کر دی..... یوں جیلہ سے میری شادی ہو گئیں وہ میری زندگی کا یادگار اور سنہرا دن تھا۔ مجھے میرے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی وہ میری اور جیلہ کی زندگی کی پہلی رات تھی جو مجھے ابھی تک یاد ہے..... جیلہ بہت ہی حسین لگ رہی تھی وہ عرصی سچ پر یوں بیٹھی تھی جیسے کسی یونانی نقاش کے ہاتھوں سے تراشیدہ ویش کا مجسمہ ہو۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک سے جلتنگ سانج اٹھا تھا رخسار چیا کی آگ سے دھک رہے تھے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جاووقا وہ سراپا خمار اور ہمہ تن کیف تھی۔ اس کی رگوں میں خون نہیں شراب دوڑ رہی تھی۔

ہماری ازدواجی زندگی نہایت شاندار اور پرسکون گزرنے لگی۔ جیلہ نے میری ساری تنگی مٹا ڈالی۔ وہ اتنی حسین ہونے کے باوجود مجھ جیسے بد صورت مرد کے ساتھ بے حد خوش تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ ہم دو بچوں کے والدین بن گئے میں نے ملازمت چھوڑ دی تھی اور کاروبار شروع کر لیا تھا اپنا گھر بھی بنالیا تھا جیلہ کے والدین نے اپنا وعدہ نبھایا تھا زندگی نہایت ہی پرسکون اور شاندار گزری تھی..... کہ میری زندگی میں پھر ایک طوفان آیا اور میں پھر سے اندھیروں میں بھٹکنے لگا۔

جب سے ہم اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ تب سے ہمارا سکون غارت ہو گیا تھا۔ گھر کے فرش پر اچانک ہی خود بخود آگ بھڑک اٹھی تھی جس سے گھر کی قیمتی چیز بھی جل کر راکھ ہو گئی تھیں کچھ کچھ مل نہیں آتا تھا کہ آگ خود بخود کیسے لگ جاتی ہے۔ میں نے اس معاملہ میں سب سے پہلے گنگارام سے

رابطہ کیا۔ اسے کئی خطوط لکھے مگر اس کی طرف سے کسی بھی خط کا جواب نہ ملا۔ تو میں نے خود ہندوستان جانے کا پروگرام بنایا کیونکہ میں اپنے کسی عامل سے رجوع نہیں کرنا چاہتا تھا میں نے اسلام آباد جا کر ہندوستان کے سفارت خانے سے وہاں کا ویزا لگوا لیا اور ہندوستان روانہ ہو گیا میں مدراس لنگرام کے دیئے ہوئے پتے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ لنگرام تو فوت ہو گیا ہے مجھے اس کی موت کا بہت ہی دکھ ہوا۔ میں نے اپنے مسئلہ کے سلسلہ میں کئی اور سادھوؤں سے رابطہ کیا۔ مگر ہر کسی نے جواب دیا کہ ہم خود لنگرام کے شاگرد ہیں اس کے بتائے عمل کا تو ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس معاملہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ میں ہر طرف سے ناکام و نامراد ہو کر واپس وطن لوٹ آیا۔ یہاں آ کر میں اپنے وطن کے عاملوں کے آگے ہاتھ پھیلائے کہ وہ اس سلسلہ میں میری مدد کریں اور مجھے اس مصیبت سے نجات دلانیں ہر ایک نے مجھے کوئی نہ کوئی عمل بتایا اور روپے بٹورے مگر مجھے اس اچانک بھڑک اٹھنے والی آگ سے پھر بھی نجات نہ مل سکی بلکہ اب تو اکثر ایسا ہونے لگا کہ بھی جیلہ کا دوپٹہ آگ پکڑ لیتا اور کبھی اس کے بستر کو آگ لگ جاتی جس پر وہ سوئی ہوئی ہوتی تھی۔ میرے بچے اتنے خوف زدہ ہو گئے کہ انہوں نے اس گھر میں رہنے سے انکار کر دیا اور نانائانی کے پاس جا کر رہنے لگے۔ ان واقعات نے مجھے دیوانہ سا بنادیا۔ میں بے بس ہو گیا۔ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہو رہا تھا۔ پھر ایک دن میری دکان میں بھی آگ لگ گئی اور دکان کا سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ میں کیا کروں اور اس آگ سے کس طرح نجات حاصل کروں؟ میں یہ تو محسوس کرنے لگا تھا اور جان گیا تھا کہ یہ آگ میرے کرتوتوں اور گناہوں کا نتیجہ ہے..... میں نہ نماز پڑھتا تھا اور نہ ہی اللہ کو یاد کرتا تھا۔

ایک روز میں نے نہایت پریشانی کے عالم میں کسی عالم کی تلاش میں سڑک پر جا رہا تھا کہ ایک مجرب و



موت کا گھر

ایس امتیاز احمد - کراچی

نوجوان کا جسم اچانک برف کی طرح سرد ہو گیا۔ سامنے کھڑی عجیب الخلق مخلوق اپنے لمبے اور نوکیلے دانت کچکچاتے ہوئے نوجوان کی طرف بڑھی کہ پھر چشم زدن میں نوجوان کو جیسے ہوش آگیا اور اس نے اوپر سے چھلانگ لگادی۔

رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی دل و دماغ کو یہ بوت کرتی ایک ناقابل فراموش کہانی

ڈاکٹر بال اس رات کو کافی دیر سے سوئے تھے۔ دن بھر ان کے ٹیکہ کے مریضوں کا تانتا بندھا رہتا اور انہیں دم لینے کی مہلت بھی نہیں ملتی تھی۔ لیکن اب ساڑھے چار بجے اچانک ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ انہوں نے سنا کہ صدر دروازے کی کھٹی مسلسل بج رہی ہے سورج کے طلوع ہونے میں ابھی کافی دیر تھی اور چاروں طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت نرم گرم بستر سے نکلتا ڈاکٹر بال کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ اپنے ملازم کو کوٹے لے گئے جو ایک دن قبل کوئی بہانہ کر کے اسے گاؤں چلا گیا تھا۔

”پتا نہیں کون تم بخت میری نیند حرام کرنے پر تلا ہوا ہے جہنم میں جائے۔“ انہوں نے بڑبڑا کر کہا اور لحاف اپنے اوپر لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگے مگر اب کھٹی بجانے والا دروازہ پینے لگا تھا۔ کئی منٹ

نے دیوانے نے میرا راستہ روک لیا۔ اور غصے سے بولا۔ ”اوبد بخت! تو اپنے گناہوں سے توبہ کیوں نہیں کرتا؟“ جو کچھ مانگتا ہے اللہ سے مانگ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے کے بجائے اس کے سامنے سر جھکاؤ بڑا رحیم و کریم ہے۔“

پتہ نہیں کہ میرے دل میں کیا آیا کہ میں نے بھری پری سڑک پر اس کے پاؤں پکڑ لئے اور رو کر فٹیں کرنے لگا رہا چلتے لوگ ٹھک گئے اور رک کر میرا تماشا دیکھنے لگے۔ میں مجرب کے پاؤں پکڑے مٹیں کر ہاتھ کہ وہ مجھے اس بلائے ناگہانی سے نجات دلائے۔

جب کافی وقت گزر گیا تو اسے رحم آگیا اور اس نے کہا..... ”چل بد بخت“

میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ کچھ دوری پر ایک مسجد کی اس مسجد کے نزدیک پہنچ کر اس نے کہا۔ ”اوائے بد بخت جا وہاں مل ہے پہلے نہا اور وہیں طالع پڑے ہوں گے انہیں پہن لے پھر خدا کے حضور جھک کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ وہ رحیم و کریم ہے سب سے دیر سے وہ تیری دعاؤں کو ضرور سنے گا تیری معافی قبول کرے گا۔ جا! اب دیر نہ کر ورنہ تو بھی اس انجانی آگ کی لپیٹ میں آجائے گا۔“

میں تیری طرح اندر داخل ہو گیا۔ نہا دھو کے نئے کپڑے پہنے۔ جو نہ معلوم کس کے تھے، مگر میرے جسم پر فٹ آ گئے تھے۔ میں نے نماز پڑھی۔ ابھی میں صورت فاتحہ کی تلاوت کر رہا تھا کہ مجھ پر شدید برقت طاری ہوگئی۔ میں نے بہ ہزار وقت نماز تمام کی اور سلام پھیرنے کے بعد پھر بعدے میں گر گیا۔ اس وقت میری زبان پر ایک ہی الفاظ تھے۔ ”ایاک نعبد و ایاک نستعین“ پتہ نہیں میں نے اس آیت کو کتنی بار دہرایا مجھے ہوش تب آیا۔ جب ایک بار بیشخص نے میرے کندھے کو پکڑ کر ہلایا اور بتایا کہ ظہر کی اذان ہونے والی ہے تب مجھے احساس ہوا کہ میں دو گھنٹے سے بعدے میں پڑا ہوا ہوں۔ مٹی میرے آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ میں



گزر گئے مگر وہ دستور دروازے کو پیٹتا رہا۔ اور جب ڈاکٹر پال کو یقین ہو گیا کہ دستک دینے والا آسانی سے نکلے والی آسانی نہیں تو غصے میں وہ بستر سے نکلے اور ڈریسنگ گاؤں پہن کر لڑکھڑاتے ہوئے صدر دروازے تک گئے۔

دروازہ کھول کر انہوں نے جونہی باہر تاریکی میں جھانکا تو ایک شخص جھٹ سے اندر آ گیا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے چپٹی لگادی پھر اس نے لڑتے ہوئے ہاتھوں سے ڈاکٹر کا بازو پکڑ لیا۔ ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ چھڑا چاہا مگر اس کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”مجھے بتایا گیا ہے کہ اس مکان میں ایک ڈاکٹر رہتا ہے جس کا نام پال ہے۔ کیا تمہارا یہی نام ہے؟ اگر تم ڈاکٹر نہیں تو خدا را مجھے ڈاکٹر پال کے پاس لے چلو۔“

ڈاکٹر پال نے جواب دینے سے پہلے اس پر اسرار اجنبی کا بطور جائزہ لیا۔ پھر مطمئن ہو کر انہوں نے اچھی کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے کتب خانے میں لے آئے جہاں آتش دان میں اب بھی لکڑیاں جھڑ رہی تھیں اور کمرہ خاصا گرم تھا۔ انہوں نے ایک موٹی سی لکڑی آتش دان میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں مجھے ڈاکٹر پال کہتے ہیں۔“
”اوہ ڈاکٹر صاحب مجھے بتائیے کیا میں پاگل ہوں۔“

ڈاکٹر پال نے بھی اپنے اس بے وقت ملاقاتی کی طرف بخود دیکھا۔ اس کا حلیہ عجیب و غریب تھا۔ سر کے بال گرد آلود اور اچھے ہوئے تھے۔ کپڑے پھٹ کر تار تار ہو چکے تھے اور چہرہ خون سے تر تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس آواز میں کپکپاہٹ اور خوف کا عنصر نمایاں تھا۔ ڈاکٹر نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے اس سے بیٹھنے کے لئے کہا جس پر اجنبی دھپ سے بیٹھ گیا۔ ”تم زخمی بھی ہو اور حواس باختہ بھی ٹھہرو۔ ابھی کچھ دیر بعد تمہاری داستان

سنتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے الماری کھولی اور برائڈی کا ایک بھر کر اجنبی کو دیتے ہوئے کہا۔ ”لو پہلے اسے لو۔“ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس ختم کر دیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کے اوسان بحال ہونے، چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی آخر اجنبی نے داستان اس طرح شروع کی۔

”میرا نام فرینک میتھون ہے اور میں لندن رہنے والا ہوں، میرا پیشہ فوٹو گرافی ہے اور میں براؤن اینڈ بلیک کمپنی میں ملازم ہوں کمپنی کے کام سے مجھے علاقے میں چند تصویریں لینے کے لئے آنا پڑا تھا علاقے میں قطعی ناواقف ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چند روز سے مختلف دیہاتوں میں بھٹکتا پھرتا رہا ہوں لیکن مجھے اپنی مطلوبہ تصاویر لینے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر میں نے رور کنٹنن اور وائٹ ہیون کے اضلاع کا دورہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ ہیون کے بہترین رائل ہوٹل میں قیام کرنے تھا۔ چنانچہ گزشتہ رات میں اپنی موٹر سائیکل پر چکر روانہ ہوا۔ یہ تمام راستہ ویران اور دلدلی میدانوں مشتمل تھا۔ رات بھی بہت تاریک اور سرد تھی مگر میں دھن میں برق رفتاری سے موٹر سائیکل اڑائے گا۔ ہیون کی طرف چلا جا رہا تھا کہ اچانک موٹر سائیکل رفتار خود بخود دھیمی پڑنے لگی۔

اور تھوڑی دور آگے جا کر موٹر سائیکل بالکل ٹھپ ہو گئی۔ میں نے موٹر سائیکل سے اتر کر اس چیک کیا اور یہ معلوم کر کے میرا دل دھک سے رہ گیا کہ پیٹرول کی ٹینکی تقریباً خالی ہو چکی ہے تلاش کرنے پر میں نے ٹینکی کے پمپ سے ایک تنھا سا سوراخ پایا جس میں سے پیٹرول فک فک کرتا مگر راستے گرتا آیا تھا میں نے جلدی سے ایک چوگم چپا کر سوراخ پر لگا دیا تاکہ جو تھوڑا سا پیٹرول بچ رہا ہے وہ ضائع نہ ہو۔ میری بدقسمتی دیکھنے کے فالتو پیٹرول کا ڈبا جو میں سفر میں ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں بالکل خالی تھا حالانکہ

نے کیراج والوں کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ یہ ڈبا پیٹرول سے پر کر دیں۔ مگر غالباً وہ بھول گئے تھے۔ خیر میں دوبارہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی میں جلد از جلد اس وحشت ناک علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا مگر کیا معلوم قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی بھٹکتا پیٹرول ہی گیا تھا کہ موٹر سائیکل نے جواب دے دیا۔ مجھے جو پریشانی اور وحشت ہوئی اس کا آپ صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میرے اندازے کے مطابق نزدیکی گاؤں کم از کم چھ میل دور تھا۔ میں نے جیسی گھڑی نکال کر دیکھی، ریڈیم ڈائل کی چمکتی ہوئی سوئیوں نے مجھے بتایا کہ رات کے دس بجے ہیں چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ہوا میں خنکی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پناہ لینے کیلئے کوئی مکان یا کسی دھان کی جھونپڑی کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اس قدر ہولناک سنائے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے صدیوں سے یہاں کسی انسان نے قدم نہیں رکھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ دھند کا ایک گہرا بادل مجھے اپنے حلقے میں لینے کے لئے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔

یہاں تک پہنچ کر فرینک میتھون نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بولا۔

مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس دھند کو دیکھ کر میری وحشت اور اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ چاروں طرف دھشت زدہ کر دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے میں صدیوں پرانے قبرستان میں کھڑا ہوں اور پھر دھند نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میری طاقت جیسے کسی نادیدہ قوت نے سلب کر لی۔ یقین کیجئے ڈاکٹر صاحب میں اتنا بزدل نہیں ہوں اور نہ ہی میرے اعصاب اتنے کمزور ہیں لیکن اس دھند میں پھنس کر مجھے یہ یقین ہو رہا تھا کہ اس میں کسی نادیدہ قوت کا دخل ہے پھر میں نے اپنے شانوں پر ایک زبردست دباؤ محسوس کیا اور مجھے یوں لگا جیسے یہ قوت

مجھے آگے بڑھنے کے لئے مجبور کر رہی ہے، میں نے جلد جھد کی کہ آگے نہ جاؤں مگر میری ایک نہ چلی۔ کسی سرزدہ انسان کی طرح میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ آگے خاوار جھاڑیوں کے درمیان مجھے ایک وسیع شگاف دکھائی دیا۔ اور جونہی میں شگاف میں داخل ہو کر دوسری جانب نکلا میرے شانوں پر رکھا ہوا ناقابل برداشت بوجھ اتر گیا میں نے دیکھا کہ وہ گہری دھند جسے دیکھ کر مجھ پر دھشت طاری ہو گئی تھی آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہی ہے اور پھر اچانک مجھے اس ویرانے میں ایک مکان دکھائی دیا۔ یہ ایک سرائے کی طرز کا قدیم مکان تھا جس کے چاروں طرف خود رو جھاڑیاں اور لمبی گھاس بکثرت اگی ہوئی تھی۔ سرائے چونکہ بہت قدیم تھی اس لئے اس کی دیواروں کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا یا ممکن ہے تاریکی میں مجھے سیاہ نظر آیا ہو بہر طور بے بسی اور مجبوری کے عالم میں یہ مکان مجھے بہت بڑا سہارا نظر آیا۔

مجھے یقین تھا کہ یہ مکان ضرور آباد ہوگا۔ بلاشبہ رات کافی بیت چکی تھی مگر پھر بھی مکان کا مالک یا جو کوئی بھی اس میں رہتا ہے، انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت میرے لئے دروازہ کھولے میں کوئی ناراضگی محسوس نہیں کرے گا اور عین ممکن ہے مجھے گرم کھانا بھی کھلا دے، کھانے کا خیال آتے ہی میری بھوک چمک اٹھی اور چند منٹ پہلے مجھ پر خوف و دھشت کی جو کیفیت طاری ہوئی تھی رفتہ رفتہ دور ہو گئی انسان کی فطرت بھی عجیب ہوتی ہے۔

قریب پہنچ کر اس عمارت کے دھندلے نقش مجھے واضح طور پر دکھائی دینے لگے، عمارت کے بڑے سے دروازے پر کچھ لکھا ہوا تھا جو میں کوشش کے باوجود نہ پڑھ سکا۔ عمارت کے چاروں طرف وہی پر اسرار دھند چھیلی ہوئی تھی لیکن یہ دھند اپنی جگہ بالکل ساکت تھی۔

جی کڑا کر کہ میں نے دروازے پر زور سے دستک دی اور انتظار کرنے لگا مگر اندر سے کوئی جواب نہ

انمول باتیں

☆ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کو رزق دینے کا وعدہ فرمایا ہے لیکن یہ وعدہ نہیں کیا کہ وہ ہر ایک کو بخش دے گا۔ پھر ہم کیوں رزق کے لئے فکر مند ہیں اور مغفرت سے بے پرواہ.....؟

☆ قسمت آپ کے ہاتھوں میں نہیں لیکن کام آپ کے ہاتھ میں ہے۔ قسمت آپ کا کام نہیں سنوار سکتی لیکن کام قسمت سنوار سکتا ہے۔

☆ جب آپ روشنی میں ہوں گے تو ہر چیز آپ کے پیچھے چلے گی لیکن جب آپ اندھیرے میں داخل ہوں گے تو ہر چیز حتیٰ کہ آپ کا سایہ بھی آپ کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ یہی زندگی ہے۔

☆ انسان کے اعمال ہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ نیک نیتی سے کی جانے والی کوششیں کبھی ضائع نہیں ہوتیں۔ جو شکوہ کرتا ہے وہ اللہ کی تقسیم پر راضی نہیں۔

☆ غیبت کرنے سے صرف اس بندے کو قاعدہ ہوگا جس کی غیبت کی جائے۔ کیونکہ اس سے اس کی نیکیاں بڑھیں گی اور غیبت کرنے والی کی کم ہوں گی۔

☆ حاسد اپنے سوائے کسی کا نقصان نہیں کرتا۔ ناکامی کی وجہ نقدیر نہیں۔ ہڈ حرامی بد نیتی اور بے عملی ہوتی ہے۔

(نوشین خان - کوٹ مظفر میلسی)

میں داخل ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ سفید چہرے والا شخص کدھر کچلا گیا البتہ عورت نے مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور پہلی منزل کے ایک کمرے میں لے گئی۔ میں نے دیکھا کہ چلتے ہوئے اس کے پیروں سے ہلکی سی آہٹ بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

یہ مکان دو منزل تھا اور اس میں کئی بڑے بڑے کمرے تھے مجھے وہ جس کمرے میں لے گئی غالباً وہ سونے کا کمرہ تھا۔ کیونکہ کمرے کے ایک کونے میں ایک آرام دہ بستر موجود تھا۔ عورت کمرے میں داخل نہیں ہوئی بلکہ دروازے پر ہی رگ لگی۔ اس کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ تھیل رہی تھی اس نے سر کے اشارے سے رخصتی سلام کیا اور واپس مڑنے ہی والی تھی کہ میں نے اسے روک لیا اور پوچھا کہ کیا کھانے کے لئے کچھ مل سکتا ہے؟ مگر اس عورت نے نفی میں گردن کو جنبش دی اور بجائے انہیں غلاہرے کے اس کے سرخ سرخ لبوں پر مسکراہٹ کچھ اور زیادہ ہو گئی یہاں تک کہ مجھے اس کے سفید سفید چمکیلے دانت دکھائی دیئے جو غیر معمولی طور پر لمبے اور نوکیلے تھے پھر اس نے دروازہ بند کیا اور چلی گئی۔

اب میں کمرے میں تنہا تھا میں نے چاروں طرف بغور دیکھا یہ ایک بوسا کمرہ تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ہاتھ منہ دھونے کے لئے ایک سنگ بنا ہوا تھا۔ جس کے قریب ہی چند تولیے لٹک رہے تھے جنوبی دیوار کے ساتھ پرانی طرز کی کئی کرسیاں بھی ایک قطار میں رکھی ہوئی تھیں اور اس کے مقابل کی دیوار کے ساتھ ہی لکڑی کی بنی ہوئی ایک بے حد مضبوط اور بھاری الماری کھڑی تھی۔ کمرے کی مشربی دیوار کے کونے میں ایک ہی کھڑکی تھی جو مجھے بند دکھائی دی۔ اور اسی طرف وہ دروازہ تھا جس سے میں اندر داخل ہوا تھا۔

بستر کے قریب ہی ایک نہایت وزنی اور کٹی فٹ اونچا لپ بچہ بھی رکھا ہوا تھا جس پر گرد کی موتی نہیں جھی ہوئی تھیں۔ اس کی زرد رنگ کی روشنی میں کمرے کی یہ تمام چیزیں مجھے دھندلی سی نظر آ رہی تھیں۔ مشربی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ مجھے دکھائی دیا جس میں قفل لگا

کہ اس شخص کے چہرے پر نہ بچھونیں تھیں اور نہ آنکھیں۔ اس عجیب و غریب آدمی کے پیچھے ایک بے حد خوبصورت اور جاذب نظر عورت قدیم طرز کا شمع دان ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ مرد جتنا بھدا اور بد صورت تھا عورت اتنی ہی حسین اور دلکش تھی، اس کا مرمیں جسم سڈول اور کافی اشتعال انگیز تھا اور سفید و سیاہ آنکھیں جن میں جھیل کی سی گہرائی تھی بے پناہ چمکیں تھیں۔ سیاہ لباس میں وہ غضب و عداوت ہی تھی۔

مگر ان سب چیزوں کے باوجود اس کے چہرے پر ایک ایسی چیز بھی تھی جسے دیکھ کر میرے دل میں اس کے لئے شدید ترین نفرت اور کراہت کے جذبات پیدا ہو گئے نہ جانے کیوں؟ اس کے ہونٹ پتلے پتلے تراشیدہ ہونٹ، کبوتر کے خون کی مانند سرخ تھے جیسے وہ ابھی کسی کا خون پی کر آئی ہو۔ مجھے دیکھتے ہی اس عورت کی آنکھیں تارے کی مانند چمکنے لگی تھیں۔ میں نے ان سے اپنا حال بیان کیا اور ایک رات کے لئے پناہ لینے کی درخواست کی جب میں چپ ہوا تو ایک لمحہ انتظار کے بعد بغیر آنکھوں اور بھونڈوں والے پراسرار شخص نے اپنی لمبی لمبی سفید انگلیاں آگے بڑھائیں اور میرے چہرے کو ٹٹولنے لگا۔ شاید وہ میرے چہرے کے خدوخال سے یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ آیا میں کوئی بد معاش تو نہیں اور پھر اس عورت نے جھک کر مرد کے کان میں آہستہ سے کہا۔ ”کانی ہے اسے اندر آنے دو۔“

میں نے اس کا یہ فقرہ سن لیا مگر اس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آ سکا فوراً ہی مرد نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اگرچہ میں اس مکان کی ہیئت اس میں رہنے والے ان دو افراد کی شکل و صورت لباس اور انداز گفتگو سے کسی قدر سراسیمہ ہو گیا تھا لیکن اب میرے لئے مکان میں داخل ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بصورت دیگر میں اپنے آپ کو اس دیران دلدلی علاقے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا اور راہ گیر صبح میری اکڑی ہوئی لاش پاتے۔

بہر حال اپنے آپ کو ہمت دلاتا ہوا میں مکان

آیا تب میں نے دروازے کو کئی مرتبہ کھٹکھٹایا۔ اب میں اپنے گرد و پیش کی چیزیں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ شاندار عمارت کا مالک یا تو نہایت لاپرواہ شخص ہے یا اسے اپنے مکان سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملتا کہ اس کی حالت درست کرنے پر توجہ دے اور دفعۃً میری نگاہ عمارت کے اوپر لگے ہوئے ایک سفید پتھر پر گئی جس پر چند الفاظ کندہ تھے، پہلے میرا خیال تھا کہ شاید اس پر سرائے کا نام لکھا ہوا ہے لیکن اب بغور دیکھنے پر پتا چلا کہ اس پر عجب مضحکہ خیز الفاظ لکھے ہیں۔

”آپ کا سفر یہاں ختم ہوتا ہے۔“

ان احقانہ الفاظ کا مطلب میری سمجھ میں نہ آ سکا میں کافی دیر تک ان الفاظ پر غور کرتا رہا اور پھر اچانک میرے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے کوئی مکان کے اندر چل رہا ہو۔ پھر دائیں ہاتھ کی اونچی کھڑکی کی درازوں میں روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں مجھے دکھائی دیں اور فوراً ہی یہ روشنی غائب ہو گئی غالباً کوئی شخص دروازہ کھولنے آ رہا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ درست دینے والا لوٹ گیا وہ روشنی بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا ہوگا۔ لیکن پھر میرے کانوں میں مکان کے اندر کسی کے آہستہ آہستہ چلنے پھرنے کی آواز آئی۔ آہستہ آہستہ یہ آہٹ مکان کے اندر وئی جیسے دروازے کی طرف آئی۔ پھر میں نے دروازے کی آہنی زنجیر کی کھڑکھٹاہٹ سنی اور پھر لکڑی کا بنا ہوا بلند و بالا دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔

سامنے ہی مجھے ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک سردی لہر سرائت کر گئی۔ میں بری طرح خوف زدہ ہو گیا۔ وہ پستہ قد اور چوڑے چکلے شانوں والا مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اس کا گول مٹول چہرہ دودھ کی مانند سفید اور چمکدار تھا۔ سچی کھوپڑی اندھیرے میں سفید انڈے کی طرح چمک رہی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کا لمبا سا چنچہ زیب تن کر رکھا تھا۔ مگر ان تمام عجیب عجیب باتوں کے علاوہ جس چیز نے میرے جسم پر لرزہ طاری کر دیا تھا وہ یہ تھی

بدستور جل رہا تھا۔ میں نے جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی پورے بارہ بجے تھے اور صبح ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے میں بستر پر لیٹ گیا اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

سمہری کے اوپر چھت پر ایک بہت بڑا سائبان لگا ہوا تھا جیسا کہ پرانے زمانے میں بستر کی خوبصورتی کے لئے استعمال ہوتا تھا میں بستر پر لیٹا ناں خوبصورت سائبان کو دیکھنے میں خوش تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک ایسی شے پر پڑی جسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ کراہت ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی مکڑی تھی جس نے میرے سر کے عین اوپر سائبان کے درمیان لگی ہوئی ایک لمبی اور ٹوکیلی اتنی سلاخ سے لیکر سمہری کے ایک کونے تک اپنا وسیع جال اتان رکھا تھا، میرا خیال تھا کہ سائبان کے درمیان لوہے کی یہ ٹوکیلی سلاخ شاید لائین یا لپ وغیرہ کے لٹکانے کے کام آتی ہوگی۔ مکڑی اب جالے کے عین درمیان میں بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اسے ٹھٹکی باندھے دیکھتا رہا یہاں تک کہ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور پھر چند لمحوں بعد نیند نے مجھے آگھیرا۔

دفعتاً میری آنکھ کھل گئی اور مجھے یاد ہے کہ وہ بڑی مکڑی اپنے جالے سے گر کر میرے دائیں گال پر آن پڑی اور پھر رینگتی ہوئی گردن کی طرف بڑھی، وہ بہت زدہ ہو کر میں ایک طرف اچھلا عین اس لمحے لوہے کی بھاری ٹوکیلی سلاخ سننائی ہوئی ٹکلی اور بستر میں کھب گئی اور ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ سلاخ میرے سینے میں بیوست ہو چکی ہوتی مگر اس مکڑی نے میری جان بچائی اور تب میں نے محسوس کیا کہ سائبان کے درمیان اس اتنی سلاخ کو لگانے کا اصل مقصد کیا ہے؟

واقعی کسی کوسوے میں قتل کرنے کی اس سے بہتر ترکیب کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اس سلاخ کا معائنہ کیا جو بستر میں گڑی ہوئی تھی۔ سلاخ کی بناوٹ تیز و حدانیز کے انی سے مشابہت رکھتی تھی انی جب گری تو مکڑی کا جال اوٹ گیا اور یقیناً مکڑی کو پہلے سے پتا چل گیا ہوگا کہ سائبان کی سلاخ میں جنش ہو رہی

ہے اور پھر مکڑی خوف زدہ ہو کر میری گردن پر آن گری اور میں نیزے کی انی سے ہلاک ہوتے ہوتے بچا۔ اب میں کمرے کے وسط میں کھڑا اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے کوئی تدبیر سوچ رہا تھا کہ دفعۃً میں نے دروازے کے باہر قدموں کی دبی چاپ سن کر جواس سے قتل میں دوسرے پہلے بھی سن چکا تھا جلد ہی یہ ہلکی آواز غائب ہو گئی مگر کچھ دیر بعد ہی وہی آواز سنائی دی۔ اس مرتبہ یہ آواز دیوار کے قریب سے آئی تھی جس کے ساتھ سمہری لگی ہوئی تھی۔ اور پھر ایسی آواز سنائی دی جیسے دیوار کھرچی جارہی ہو اور اس میں سے کوئی چیز نکالی جارہی ہو اور پھر کوئی شے دن دبائے جانے کا کھٹکا بھی سنائی دیا۔

میں نے محسوس کر اس کی طرف دیکھا دیوار میں ایک چھوٹا سا شکاف ظاہر ہو رہا تھا۔ جس میں سے موسیقی کی مدھم اور رزنی ہوئی روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر لپک کو گل کر دیا میں نے کوشش کی کہ دہشت سے اپنے اعصاب کو بچائے رکھوں پھر میں لپک کر اس غسل خانے میں گھس گیا جہاں جاتے ہوئے میری روح فنا ہوئی تھی میں دروازے کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

دیوار والا شکاف آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا تھا اور پھر وہ اتنا بڑا ہو گیا کہ ایک آدمی اس میں سے بخوبی نکل سکتا تھا اور پھر مجھے دو ہاتھ دکھائی دیئے۔ بعد دے بد نما اور بچے جیسے ہاتھ جو شکاف کو ٹول رہے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ بغیر آنکھوں والی مکروہ اور غلیظ جو انسانی شکل میں تھی اندر داخل ہو گئی۔ چند سیکنڈ توقف کے بعد وہ آہستگی سے بستر کی طرف بڑھا اور پھر میں نے دیکھا کہ دیوار کے شکاف کے پیچھے وہی خوبصورت چڑیل ہاتھوں میں شمع دان لئے کھڑی ہے اس کی شیطانی آنکھیں دھکتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ تھیں جنہیں دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔

آدی اب بستر کے قریب پہنچ چکا تھا چند لمحے بستر ٹولنے کے بعد وہ اندھا شیطان لمبی کی مانند غرایا اور پیچھے ہٹا اس کی آواز سن کر چڑیل بھی

اندراگئی اور اس اندھے شیطان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”جلدی کرو..... غسل خانے میں.....“ یہ سننے ہی وہ مڑا اور بے پاؤں غسل خانے کی طرف بڑھا اس مختصر سے عرصہ میں مجھے ہر قیمت پر اپنی بچائی تھی۔ میں نے چھت پر لپکی کی طرف دیکھا جہاں ایک بڑا سا شکاف تھا۔ برق رفتاری سے میں اوپر چڑھ گیا۔ شکاف اتنا بڑا تھا کہ میں ترمڑ کر اوپر چھت پر پہنچ سکتا تھا۔ اس خوف تک پہنچنے پہنچتے میرا سانس پھول گیا اور میں ایک لمحہ دم لینے کے لئے رکا۔ نفس اور سر اندکا ایک سلسلہ مجھے اپنے تھنوں میں گھستا ہوا محسوس ہوا، اور پھر وہ مرد اور عورت غسل خانے میں داخل ہو گئے پہلے عورت نے ٹب میں جھانکا اور کمر سیدھی کر کے کھڑی ہوئی اور اب میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک کپڑا بھی تھا۔

اس عورت نے مجھے دیکھا اور بھیانک انداز میں تعجب لگانے لگی۔ ”نیچے اترو چڑیل نے چلا کر کہا اس کمرے میں رہنے کا معاوضہ تمہیں ادا کرنا پڑے گا، اور جب میں نے کوئی حرکت نہ کی تو اس کا وحشیانہ پن عود کر آیا۔ اس نے سب داں مرد کو تھمایا اور پھر میری پانپ پر چڑھنے لگی۔ میں نے جلدی سے اپنا جسم سوراخ کے اندر داخل کر لیا اور پھر میں نے بغیر سوچے سمجھے چھلا ٹنگ لگا دی۔

اف خدایا! میں گوشت اور ہڈیوں کے ایک عظیم ڈھیر پر گر اٹھا۔ دس پندرہ لاشیں جن کے عضو عضو جاتے جانے کب سے پڑی سڑ رہی تھیں۔

میرے سامنے ایک تاریک راہداری تھی جس کے اندر میں اندھا حد و حد دوڑتا چلا گیا۔ عورت جتنی چلتی ہوئی اب بھی میرے تعاقب میں تھی۔ میں لکڑی کے ایک زینے کے ذریعے دوسری منزل کی چھت پر پہنچ گیا تھا۔ اب میرے لئے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔ خوبصورت چڑیل میری بے بسی سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر رک کر وحشیانہ انداز میں تعجب لگانے اور کپڑا ڈی گھمانے لگی۔ میرا سارا جسم برف کی مانند سرد ہو گیا۔ وہ اپنے لمبے، ٹوکیلے سفید دانت

بندھتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ایک بلند بالا درخت کی چند شاخیں چھت سے دو تین فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر رک گئی تھیں۔ میں نے دیوار پر ایک ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ سے ایک شاخ پکڑ لی اور دوسرے ہی لمحے وہ مجھ پر بھجھ پڑی۔ اس نے کپڑا ڈی گھائی اور دیوار پر رکھا ہوا میرا ہاتھ سن ہو گیا۔ درخت کی شاخ میرا بوجھ نہ سنبھال سکی اور تر شاخ سے ٹوٹ گئی۔ اور میں دھڑام سے جھاڑیوں پر گرا اور اٹھ کر پاگلوں کی طرح بھاگا اور ایک میل تک بھاگتا رہا آخر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جس مقام پر سرائے تھی وہاں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے پوری عمارت ان شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔“

فریک میتھون خاموش ہو گیا اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔

”اچھا تو سرائے میں آگ لگ گئی؟“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”مگر یہ آگ کس طرح لگی ہوگی؟“

”میرا خیال یہ ہے کہ عورت نے وہ شمع اندھے کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی اور پھر کسی طرح اس کے سیاہ چنے نے شمع کی ٹوکھچھو لیا ہوگا۔ اندھے نے اپنے بچاؤ کی تدبیر کی ہوگی لیکن کمرے کے دوسرے سامان نے بھی آگ پکڑ لی ہوگی۔“

”بہر حال کہانی بہت دلچسپ ہے..... بشرطیکہ یہ سچی ہو.....“

یہ سننے ہی فریک میتھون کا چہرہ فق ہو گیا اور اس نے رزنی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ڈاکٹر کیا تم بھی مجھے پاگل سمجھتے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب سے نکال کر ڈاکٹر کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ اس کی چاروں انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور ہاتھ پر بے ترتیبی سے بندھی ہوئی ڈھیلی بیٹوں پر تازہ خون کے قتلے تھے ہوئے تھے۔



خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچھے میں ذاتی حیرت انگیز اور تھیرانگیز کہانی



ابھی عسکری حیران نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی رہا تھا کہ صوفیہ نے پلٹ کر میری کلائی پکڑ لی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بولی۔
”سوری نشاء..... ذرا میرے ساتھ آؤ۔“
”کہاں۔“ میں نے حیرانی سے پوچھا تو صوفیہ نے کہا۔

”میں، واش روم جانا چاہتی ہوں۔“
اسی وقت عسکری، دو قدم آگے بڑھا اور بولا۔ نہیں میڈم، خدا کے لئے انہیں مجھ سے انحراف پر مجبور نہ کریں، اگر ہو سکے تو یقین کر لیں کہ میں دوست ہوں۔“

عسکری نے جس انداز سے یہ الفاظ کہے اس سے صوفیہ شرمندہ ہی ہو گئی، پھر اس نے کہا۔
”اوکے میں جلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹی اور واپس چل پڑی۔

تب عسکری نے کہا۔ ”اصل میں ہمارے راستے میں دوسری بہت بڑی رکاوٹیں بھی ہیں، میں اگر تم سچ سمجھ لو تو تمہیں یقین دلا رہا ہوں کہ میں تو خیر برا ہوں، لیکن ہمارے راستے میں بہت سارے طریقے سے رکاوٹیں ڈالنے کی کوششیں کی گئی ہیں، اسی طرح سے

میڈم صوفیہ تمہیں تفصیل بتانے سے روکنا چاہتی تھیں، لیکن نشاء براہ کرم مجھے یہ بتاؤ روشاق کو یہ بات نہیں معلوم اسے یہ اطلاع دوں گا اس طرح تمہارے مفاد میں میرا کام جاری رہ سکتا ہے، یہ بے حد ضروری ہے نشاء..... یہ بے حد ضروری ہے۔“
”میں ان تابوتوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔“ میں نے ضدی لہجے میں کہا۔

”تم چاہو تو میں تمہیں وہاں لے جاسکتا ہوں، یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے لیکن مجھے اس بات کا جواب دو، پلیز مجھے اس بات کا جواب دو کہ کیا کیا..... وہ واقعی مر گیا، میری مراد..... میری مراد البرونوس سے ہے؟“

”ہاں اس کی لاش تابوتوں کے پاس پائی گئی ہے اور اس کا رنگ موت کے بعد گہرا نیلا ہو چکا تھا۔“
”کیا اب بھی وہ لاش وہیں موجود ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتی۔“
”ٹھیک ہے آؤ چلیں، مگر تمہیں ان تابوتوں سے کیا لچسپی ہے؟“ اس نے پوچھا اور میرے چہرے پر ناخوشگوار کی لکیریں پھیل گئیں۔
”یہ بھی بتانا ہوگا۔“ میں نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

”نہیں جو کچھ نہ بتانا چاہو وہ موت بتانا، اس کے بارے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ عسکری نے غلوس سے کہا اور ہم دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے، پھر جب ہم نیچے جانے لگے تو فرانسیسی پولیس کے چند افراد نے ہمیں روک دیا۔

”نہیں آپ! آگے نہیں جاسکتے۔“

”کیوں؟“ عسکری نے سوال کیا۔

”آگے خطرہ ہے کیونکہ مسٹر واسکوڈی قیدیوں کو نکال کر لارہے ہیں، ان کی ہدایت ہے کہ راستے محفوظ رکھے جائیں، خصوصاً خواتین کے لئے، پلزز..... آپ لوگ فوراً راستہ خالی کر دیجیے۔“ عسکری نے میری جانب دیکھا اور ہمیں بادل خواستہ واپس پلٹنا پڑا تو تھوڑا سا پیچھے آنے کے بعد اس نے کہا۔

”خیر ہم بعد میں وہاں ضرور جائیں گے۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، ہم دونوں واپس اسی جگہ آ گئے جہاں پر جہاز کے دوسرے مسافر جمع ہو رہے تھے، صوفیہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی، میں نے عسکری سے کہا۔

”روشاق ابھی تک نظر نہیں آیا وہ کہاں ہے؟“

”شاید ان لوگوں میں نہیں ہے۔“ عسکری نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا وہ اپنے کیمین سے کبھی باہر نہیں آتا؟“ میں نے سوال کیا تو عسکری عجیب سے انداز میں شانے ہلا کر بولا۔

”یقین کر دشتاء، مجھے تو وہ کوئی بری روح معلوم ہوتا ہے، اتنے واقعات پیش آ گئے، جہاز کے ہر مسافر پر قیامت گزر گئی، لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا، میں نے جب بھی اسے دیکھا اپنے کیمین میں ہی دیکھا۔ اس کے چہرے پر گہرا سکون پھیلا ہوا نظر آتا ہے اور وہ غیر مطمئن نہیں لگتا۔“

”اس کے پاس ایک خونخواری ملی رہتی ہے، کیا وہ اس وقت بھی اس کے پاس موجود ہے۔“

”یقین کرو میں نے نہیں دیکھی ابھی تک۔“

”مطلب یہ کہ جب بھی تم اس سے ملے ہو تو وہ خونخواری ملی روشاق کے پاس موجود نہیں تھی؟“

”لیکن وہ کہاں ہے یہ صرف روشاق ہی جانتا ہے۔“

میں ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ وہ بلی ان تمام معاملات میں ایک نمایاں کردار رکھتی تھی، کچھ دیر کے بعد لوگ اس راستے سے ہٹنے لگے جو نیچے سے اوپر آتا تھا، فرانسیسی پولیس کے سپاہی قیدیوں کو لے کر اوپر آ رہے تھے۔ لوہے کی بیڑیوں کی کھنک گونج رہی تھی، میں اور تھوڑا سا پیچھے ہٹی اور عسکری کے ساتھ ایک بلند جگہ جا کھڑی ہوئی۔ وہاں سے میں نے ان آٹھ قیدیوں کو دیکھا۔ جینز کے مونے لباس میں ملبوس تھے۔ انسانی شکل میں جانور نظر آ رہے تھے، داڑھیاں بڑھی ہوئی، آنکھیں وحشت زدہ، بدن تو ی پیکل جنہیں دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی، فرانسیسی سپاہی ہاتھوں میں چابک سنبھالے ہوئے تھے، وہ مجمع کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس جگہ تک آ گئے جہاں ان کے لئے انتظام کیا گیا تھا۔

لوگ انہیں دیکھ کر دم بخود ہو گئے تھے، پھر انہیں ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا، اس کے بعد ہینڈرک واسکوڈی نے ایک شخص کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ یہ انتہائی دیوقامت آدمی تھا۔ واسکوڈی بولا۔

”یہ گارساں ہے۔“

”ڈان وان اور فرانسیسی گارساں۔“ قوی ہیکل نے پورا نام بتایا پھر مجمع کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

”فرانس کا بوڑھا کانشیل ہمیشہ میرا پورا نام لینے سے کتراتا ہے کیونکہ میرے خوف سے اس کی جان نکلتی ہے۔“

عقب میں کھڑے ایک فرانسیسی نے پیش میں آ کر شواک کی آواز کے ساتھ ایک زوردار چابک اس پر رسید کیا، لیکن وہ منظر بھی قابل دید تھا کہ گارساں کے بدن میں جنبش بھی نہیں ہوئی، وہ اسی طرح مضحکہ خیز نگاہوں سے واسکوڈی کو دیکھتا رہا، جبکہ واسکوڈی کسی

قدر نروس ہو گیا تھا۔ برطانوی نژاد پولیس آفیسر نے آگے بڑھ کر کہا۔

”یہ کیا تم کر رہے ہو مسٹر واسکوڈی، کیا اس طرح دوستانہ فضا میں ہو سکتی ہے۔“ فرانسیسی افسر نے گہرا کر اپنے افسر اعلیٰ کو دیکھا پھر اپنے ساتھیوں سے بولا۔

”گارساں کی بکواس پر کان نہ دھرو، بکنے دو جو وہ بکتا ہے۔“ اس کے بعد اس نے گارساں سے کہا۔

”مائی ڈیئر گارساں تمہیں علم ہے کہ مارشل سمندری طوفان کا شکار ہو گیا ہے، یہ تمام لوگ.....“ واسکوڈی نے چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ تمام لوگ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں، اس وقت ہم میں سے کوئی کسی کا دشمن نہیں ہے، سب کو ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے تمہیں بھی ہم سب کا ساتھ دینا ہوگا، کیا سمجھتے؟“

گارساں نے دو تین بار سر کو مضحکہ خیز انداز میں جنبش دی، واسکوڈی کو تسخیرانہ نگاہوں سے دیکھا، پھر اس کے حلق سے قہقہہ ابل پڑا، پھر اس کا دوسرا ساتھی بھی ہنسنے لگا، پھر دوسرا، پھر تیسرا اور اس کے بعد وہ آٹھوں پاگلوں کی طرح پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگے، ہینڈرک واسکوڈی کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا، وہ لوگ مسلسل ہنسنے جا رہے تھے، انداز بالکل پاگلوں جیسا تھا اور سارا مجمع خاموش تھا، فرانسیسی افسر کو سخت طیش آ رہا تھا جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہوتا تھا، اس کے ساتھی چہرے کے ہنروں پر اپنی گرفت سخت کر چکے تھے اور منتظر تھے کہ واسکوڈی کا اشارہ ملے تو وہ ان کی کھال اتار کر پھینک دیں، لیکن واسکوڈی نے کوئی اشارہ نہیں کیا، وہ خاموشی سے اس تسخیرانہ ٹیسی کو دیکھتا رہا، یہاں تک کہ ہنسنے والے خود تھک گئے، پھر گارساں نے انگلی اٹھا کر ہینڈرک واسکوڈی کی طرف دیکھا اور مجمع کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”فرنج کانشیل بہت مخرب ہے، دلچسپ باتیں

کرنا ہے، کہتا ہے کہ یہاں کوئی کسی کا دشمن نہیں ہے، میرے دوست کو دیکھو جس نے ہمیں بیڑیوں میں جکڑ رکھا ہے، اس کے ساتھ رگروٹ ہاتھوں میں کوڑے لئے ہوئے ہیں جو ہم پر برسائے کے لئے ہیں اور یہ کہتا ہے کہ اسے ہماری مدد درکار ہے، تم لوگوں کو ٹیسی نہیں آتی اس بات پر۔“

”اور اس احمقانہ فرمائش پر سب سے پہلے میں احتجاج کرتا ہوں۔“ ایک عجیب سی آواز ابھری اور مجمع کے ساتھ ساتھ ہماری بھی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں، میرے پورے بدن کو ایک شدید جھٹکا لگا تھا وہ روشاق تھا۔ نجانے کس وقت وہ مجمع میں آ کر شامل ہو گیا تھا، میرے بدن میں چنگاریاں دوڑنے لگیں، روشاق نے پھر کہا۔

”ان لوگوں کو مدد کے قابل سمجھا گیا ہے تو انہیں بھی جہاز کے معزز مہمانوں کا درجہ دیا جائے۔“

روشاق اس وقت بہت عجیب نظر آ رہا تھا، اس نے پادریوں جیسا جبہ پہنا ہوا تھا، سر پر عجیب سی ٹوپی پہنی ہوئی تھی، یہاں تک کہ گارساں کی نگاہیں بھی اس کی جانب اٹھ گئیں اور وہ بدستور تسخیرانہ انداز میں بولا۔

”معاف کرنا نیک دل انسان، اگر تم بادی ہو تو میں تمہیں مقدس باپ نہیں کہہ سکتا کیونکہ عظیم گارساں کا ایک ہی باپ تھا اور اس نے ایک ہی زریعہ پیدا کیا یعنی گارساں، ہاں میں تمہیں چچا کہہ سکتا ہوں تو میرے مقدس چچا، میرے مقدس کی جیروی کرو۔“

”اس پورے سمندری سفر میں یہ پہلی بار اپنے کیمین سے باہر نکلا ہے۔“ عسکری نے میرے کان کے پاس سرگوشی کی۔ ”تم اسے پہچانتے ہو نا ہی روشاق ہے؟“

”ہاں ہاں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

برطانوی نژاد محضریت نے کہا۔ ”میں برٹش قانون داں ہوں، لیکن اس وقت میں عالمی قانون کی بات کرتا ہوں، ایسے لحاظ میں جب کوئی کسی کی زندگی

کی ضمانت نہ دے سکے، کوئی کسی کو قید نہیں رکھ سکتا۔ پہلے قیدیوں کو آزاد کیا جائے اس کے بعد ان سے دوسری گفتگو کی جائے۔“

”دوسرا چچا بھی ٹھیک کہتا ہے، بیڑیوں سے آزادی کے ساتھ ہمیں شریفانہ لباس بھی دینے جائیں، اور حلیہ ٹھیک کرنے کی اجازت بھی دی جائے، اس سے قبل ہم کچھ بھی نہیں سنیں گے۔“

”یہ ناممکن ہے۔ نہ میں برٹش لاء کو ماننا ہوں نہ کسی عالمی قانون کو، میں انہیں آزادی نہیں دے سکتا۔“

ہینڈرک واسکوڈی نے مستحکم لہجے میں کہا۔
”فرانسیسیوں نے انیس سو تینتالیس میں صرف جرمنی کے قانون کو ماننا تھا اور آج تک وہاں کی عورتیں اس قانون سے محبت کرتی ہیں۔“ گارساں نے بدستور مذاق اڑانے والے لہجے میں ایک شدید طنز کیا۔

”میں تمہارے بدن کی کھال اتار دوں گا پر ہنگامی کتے، ورنہ تو زبان بند رکھ۔“ ہینڈرک نے دانت پیس کر کہا اور گارساں پھر نہیں پڑا۔

”ہمیں سزائے موت کے لئے الجھناڑ لے جایا جا رہا ہے وہاں جا کر ہمیں موت کا شکار ہونا پڑے گا، یہ موت ہمیں مارشل جہاز پر آ جائے یا کسی سیارے پر ہمیں کیا فکر ہو سکتی ہے، فریج رگروٹ ہمیں یہاں گولی مار دیں یا کہیں اور لے جا کر، ہاں جہاز کے دوسرے مسافر بھی اس کے ہاتھوں موت قبول کرنے کو تیار ہوں تو دوسری بات ہے۔“

”لے چلو ان کتوں کو قید خانے میں واپس لے چلو۔ بند کردو سب حرامیوں کو۔“ چلو ہینڈرک واسکوڈی اب بالکل ہی بے قابو ہو گیا تھا، اس نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی اور وہ قیدیوں کو کوڑوں سے ہاتھ لگے، جمع خاموش تھا، کچھ دیر کے بعد وہ سب نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، ہر شخص کی اور کے بولنے کا منتظر تھا، ان میں سب سے پہلے برٹش فوج کے ریٹائرڈ میجر نے ابتدا کی۔
”فرانسیسی افسر نے اس وقت مارشل پرفرانسیسی

قانون نافذ کر دیا ہے، ہم اس قانون کو نہیں مانتے، ہم مختلف ملکوں کے باشندے ہیں، ایک شخص کی ضد نے سارے جہاز کے مسافروں کی زندگی خطرے میں ڈال دی ہے، ہو سکتا ہے بحری تفریق ہم سب کی زندگی بچانے میں کامیاب ہو جائیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک تجربے کا ملاح ہوں۔“

”ہینڈرک واسکوڈی بے جا ضد کر رہا ہے۔“ یہ آواز روشاق کی تھی۔

”اسے قیدیوں کو آزادی دینا ہوگی۔“ دوسری آواز۔

”ورنہ ہم اسے آزاد کرانیں گے۔“
”تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو تم لوگ؟“ روشاق نے کہا اور جہاز کے تمام مسافر شور مچاتے لگے۔

”مسٹر واسکوڈی ضد نہ کرو، قیدیوں کو آزادی دو، مسٹر واسکوڈی، مسٹر واسکوڈی۔“ اچانک ہی انگل ڈیزل سسٹم صوفیہ کے ساتھ کسی طرف سے نکل کر ہمارے قریب آ گئے اور مجھ سے بولے۔

”نشاء یہاں سے ہٹ جاؤ ہنگامے کا خطرہ ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔“

انہوں نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف کھینچے لگے۔

”ڈرائس معاملے کا فیصلہ تو دیکھ لینے دیں انگل، میں کیمین میں نہیں جاؤں گی۔“ نبجانے کیوں مجھے ضد چڑھ گئی۔

”میں تمہیں کیمین میں نہیں لے جا رہا، یہ جگہ غیر محفوظ ہے اس طرف آ جاؤ۔“ انگل ڈیزل کے ساتھ ہم ایک محفوظ گوشے میں جا کھڑے ہوئے، عسکری البتہ وہیں رہ گیا تھا، انگل ڈیزل کی وجہ سے اس نے ہمارے ساتھ آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”صورت حال بے حد سنگین ہو گئی ہے، فرانسیسی پولیس آفیسر ایک طرح سے درست کہہ رہا ہے، بحری تفریق گارساں شیطان صفت ہے، نبجانے اس کی آزادی دوسرے کو نئے گل کھلائے۔“

”وہ بعد کی باتیں ہیں انگل، سمندر میں یہ جہاز کب تک ڈول سکتا ہے، کوئی تحریک تو ہو؟“ میں نے کہا، انگل ڈیزل نے کوئی جواب نہیں دیا، کافی دیر تک وہ خاموش رہے پھر اچانک بول پڑے۔

”روشاق کو دیکھا ہے؟“

”ہاں اب وہ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔“
”اور اس نے گارساں کی حمایت کر کے خود کو اس کے سامنے کر لیا ہے یہ بات بہت تشویش ناک ہے، کیا تم اس کی گہرائیوں پر غور نہیں کر رہی؟“ میں نے حیران نگاہوں سے ادھر دیکھا اسی وقت صوفیہ نے پوچھا۔

”کیوں مسٹر ولسن آپ کو یہ خطرہ کیوں محسوس ہو رہا ہے؟“

”دو شیطان اکٹھے ہو جائیں تو کیا نہیں ہو سکتا، روشاق نے چالاکی سے نمودار ہو کر اس وقت صورت حال اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی ہے۔“ ولسن ڈیزل نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ اسی وقت واسکوڈی اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس نکل آیا، وہ کڑی نگاہوں سے شور مچانے والوں کو دیکھنے لگا، پھر اس کی دہانہ پٹی ہوتی آواز ابھری۔

”خاموش ہو جاؤ، پہلے میری بات سنو، میری بات سن لو، خاموش ہو جاؤ، میں تمہیں بتاؤں وہ خونخوار قاتل اور مکمل براہمن پیشہ انسان ہے، اس کی آزادی خطرناک ہو سکتی ہے۔“

”ان حالات میں ہر خطرہ مول لیا جا سکتا ہے۔“ برٹش مجسٹریٹ نے کہا۔

”مجھے چند گھنٹے درکار ہیں، میں اس پر تشدد کر کے اسے جہاز کی درنگی کے لئے مجبور کروں گا۔“ واسکوڈی بولا۔

”ہمیں سمندر میں لاوارث کھڑے کسی جہاز پر موجود لوگوں پر تشدد کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔“ اس بار روشاق نے منمنائی آواز میں کہا۔

”میں اس بارے میں کچھ نہیں سنوں گا، مجھے سختی پر مجبور مت کرو۔“ واسکوڈی نے غرائے ہوئے

لہجے میں کہا۔

”تمہیں سختی کرنے کا کوئی حق بھی نہیں ہے، ہم فرانسیسی پولیس کے محکوم بھی نہیں ہیں۔“ مسافر پھر گئے۔

”ہم سب قیدیوں کو آزاد کرانیں گے۔“ ایک گروہ نے کہا اور ہینڈرک واسکوڈی نے اپنا پستول نکال لیا، اس کے تمام ساتھی بھی ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن زندگی اور موت کی جنگش سے اکتانے ہوئے اور ویران سمندر کے بیچوں بیچ کھڑے ہوئے لوگ خوف زدہ نہ ہوئے، بلکہ پورے جہاز میں بکھر کر انہوں نے لکڑیوں کے کندھے، خولادی زنجیریں اور جو کچھ بھی ان کے ہاتھ آیا اٹھالیا۔ وہ خونی نگاہوں سے واسکوڈی کو دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت برٹش آفیسر نے کہا۔

”سنو سنو میری بات سنو، ایک منٹ، ایک منٹ، کوئی تشدد کسی پر نہ کیا جائے، مائی ڈیزل واسکوڈی تم بے گناہ انسانوں کی جان سے کھیل کر کوئی وائشنڈی کا ثبوت نہیں دے رہے، ان میں سے کتنوں کو ہلاک کرو گے جو باقی بچیں گے تمہیں مار ڈالیں گے، کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس سے، موت دونوں طرف سے ہمارے سمت آ رہی ہے، تم اسے اور قریب نہ لاؤ۔“

واسکوڈی خاموشی سے تیار کھڑے ہو جانوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنا پستول واپس جینٹی میں لگا لیا اور اپنے آدمیوں کو بھی ہتھیار استعمال نہ کرنے کا اشارہ کیا۔ پھر نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

”جہنم میں جاؤ، جو کچھ کرو گے خود جھگتو گے۔“ اس نے قید خانے کی لمبی چابیوں کا گچھا نکال کر پھینکا تو روشاق نے جھینا مار کر اسے لپک لیا۔ اسی وقت ولسن ڈیزل نے آہستہ سے کہا۔

”اس کا منصوبہ مکمل ہے، وہ اپنے پورے پورے نمبر بنانا چاہتا ہے، ویسے تم لوگ میری بھی بات سن لو، اگر جہاز بچ بھی گیا تو ہم الجھناڑ نہیں جاسکیں گے۔“

”کیا مطلب؟“ صوفیہ نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔
”بہت معمولی سی بات ہے جو ان میں سے کسی نے نہیں سوچی، کیا گارساں اسے اپنے پھانسی گھر لے جائے گا، وہ الجھڑا کا جرم ہے اور وہاں اسے سزائے موت کے لئے لے جایا جا رہا تھا۔“

”اوہ مائی گاڈ، ہاں تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل، میرے خدا، پھر کیا ہوگا، یہ بات تو دوسروں کو بھی سوچنی چاہیے۔“ صوفیہ نے کہا، ولسکن ڈیزل نے کوئی جواب نہیں دیا، اسی وقت ہم نے روشاق کی آواز سنی۔
”کچھ جوانوں کو میرے ساتھ آنا چاہیے، ان کی خواہشوں کی تکمیل کر کے ہی ہم اس مشکل سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔“

کون تھا جو اس وقت قید خانے تک جانا پسند نہ کرتا، عسکری روشاق کے بالکل قریب تھا، ہم وہیں انتظار کرتے رہے، کچھ دیر کے بعد ہی گارساں اور اس کے ساتھی بیڑیوں سے آزاد ہو کر سینہ تانے ہوئے باہر آ گئے۔ نوجوانوں کا جھوم انہیں گھیرے میں لئے ہوئے تھا، اس موقع پر واسکوڈی اور اس کے ساتھی وہاں سے ہٹ گئے تھے، گارساں نے کہا۔

”ہمارے لئے فوراً خوراک لباس اور شیعہ وغیرہ کا سامان فراہم کیا جائے۔“

اس وقت گارساں جہاز کا ہیرو بن گیا تھا اور اسے ہر چیز پیش کی جاسکتی تھی چنانچہ ہر شخص حسب استطاعت اس کی ناز برداری میں مصروف ہو گیا۔ کافی لوگ کینوں میں چلے گئے تھے، اسی وقت ڈیزل کی آواز ابھری۔

”تم یہیں روکیں بے بی۔“
”انکل میرا وہ کام کر دیں۔“ میں نے لجاجت سے کہا۔

”کیا؟“
”وہ جگہ دکھا دیں جہاں تابوت رکھے ہوئے ہیں۔“

ڈیزل نے اس وقت ایک لمحے کے لئے کچھ

سوچا، نہایت مناسب وقت تھا، سب لوگ گارساں میں الجھے ہوئے تھے، کسی کو کسی کی فکر نہیں تھی، چنانچہ ڈیزل نے کہا۔
”آؤ میرے ساتھ۔“

اور میں چل پڑی، صوفیہ بھی خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑی تھی، جس جگہ ولسکن ڈیزل ہمیں لے کر پہنچے وہ جہاز کا سب سے پر اسرار گوشہ تھا، چاروں طرف بڑے بڑے کارٹن فولادی صندوق اور دوسرا سامان سامان جن پر بڑے بڑے ٹیگ لگے ہوئے تھے رکھا ہوا تھا۔ وہیں پردوں کی تابوت بھی تھے، انہیں دیکھ کر میرا دل بند ہونے لگا، صوفیہ وہی تابوت تھے جنہیں میں کالج میں دیکھ چکی تھی، کپڑے کی پٹیاں بھی وہی تھیں، بنجانے کیوں حلق میں گولا سا بن گیا، میں حسرت سے ان تابوتوں کو دیکھتی رہی، میری پیاسی آنکھیں وہ انسانی وجود تلاش کر رہی تھیں جو میرا نام نہاد باپ تھا۔ وہ تھا یا نہیں یہ بعد کی بات ہے، لیکن میں نے اسے باپ ہی کی صورت میں دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ میرے اس انداز پر ڈیزل نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولے۔
”بچپنا تم نے۔“

”یہ تو وہی ہیں نشاء۔“ صوفیہ بے اختیار بول پڑی۔

”میرا بھی یہی خیال تھا لیکن سسر صوفیہ۔“

”ہاں بولو۔“

”وہ شخص کون تھا، کون تھا وہ؟“

”کس کی بات کر رہی ہو؟“

”البر ونوس، میں البر ونوس کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔“ میں نے کہا اور چند لمحات تک خاموش طاری رہی، اچانک ہی ولسکن ڈیزل کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا، اس بات کو ہم دونوں نے محسوس کیا تھا۔ ولسکن ڈیزل کچھ لمحے خاموش رہے۔ پھر ان کی پر اسرار آواز ابھری ایسی ہولناک آواز جسے سن کر بدن کا ہر روتلا تھرا جائے۔ انہوں نے بھاری لہجے میں کہا۔
”ہارون دانش، میرے دوست اگر تم آس پاس

موجود ہو تو مجھ سے رجوع کرو، یہاں کوئی اجنبی نہیں ہے، تمہارا ہر راز راز رہے گا، ان حالات میں مجھے تمہاری مزید ہدایات کی ضرورت ہے، میں بعض فیصلے کرنے سے قاصر ہوں۔“

سارا ماحول تھرا رہا تھا، بڑی شدید لرزش محسوس ہو رہی تھی، وہ پر اسرار الفاظ بڑے سنسنی خیز تھے ان کی ادائیگی کے بعد ولسکن ڈیزل خاموش ہو کر انتظار کرتے رہے پھر انہوں نے بار بار کہا۔

”اور اگر یہ اس وقت مناسب نہ ہو اور تم کچھ بولنا مناسب نہ سمجھو، تو کسی بھی وقت میں تمہارا انتظار کروں گا، کچھ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

پھر ولسکن ڈیزل ہماری جانب پلٹے اور بولے۔
”آؤ بے بی چلیں۔“

”میں کچھ دیر یہاں رہنا چاہتی ہوں انکل، تنہا بالکل تنہا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں بے بی یہ مناسب نہیں ہوگا۔“

”میں یہاں رکوں گی انکل۔“

”بالکل نہیں بے بی میں کسی طور اس کی اجازت نہیں دوں گا، مجھے یقین ہے کہ تم میرے ساتھ تعاون کرو گی۔“ ولسکن ڈیزل نے سخت لہجے میں کہا اور میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر خاموش ہو گئی، ہم وہاں سے نکل آئے، ادھر برٹش مجسٹریٹ کے متعین کردہ افراد خوراک تقسیم کر رہے تھے، عسکری ہمیں تلاش کرتا پھر رہا تھا، اس نے ہمارے قریب آ کر کہا۔

”آپ لوگوں کا کھانا میں نے آپ کے کیمین میں پہنچا دیا ہے، گرم ہے بعد میں خراب ہو جائے گا۔“

”شکریہ نوجوان..... آؤ بے بی۔“ ولسکن ڈیزل نے آگے قدم بڑھا دیئے۔

ہمیں بھی ان کے ساتھ جانا پڑا، کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ولسکن ڈیزل نے کہا۔

”کسی طرح کی ضد اس وقت مناسب نہیں ہوگی، جو کچھ جہاز پر چل رہا ہے تم لوگ اچھی طرح جانتی ہو، ذرا فیئر لٹریچر ہماری زندگیوں کا خاتمہ کر سکتی ہے، میں

جار ہا ہوں خیال رکھنا پلیر۔“

ڈیزل چلے گئے، کیمین میں میں اور صوفیہ رہ گئے تھے، تھوڑی دیر تک خاموشی رہی، پھر صوفیہ نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

”آؤ کچھ دیر آرام کر لیں نشاء۔“

”آپ یہ بتائیے کیا ہمیں اپنی زندگی کا یقین ہے، کیا تاحد نگاہ کھرا ہوا سمندر آخر کار ہمیں نگل نہیں لے گا، ہم یہیں اس جہاز پر مرجا سکیں گے سسٹراب اور کچھ نہیں ہو سکتا میں مایوس ہو گئی ہوں زندگی سے، لیکن میں مرنے سے قبل اپنے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ چاہے کیسے ہی ہو، چاہے یہ بات مجھے روشاق ہی سے کیوں نہ معلوم کرنی پڑے۔“

”روشاق۔“ صوفیہ دہشت سے بولی۔

”ہاں وہی کمروہ انسان، کوئی تو مجھے میرے بارے میں بتائے، میں تو اس سے رجوع کرنا چاہتی ہوں۔“

”یہ تمہاری زیادتی ہوگی نشاء۔“ صوفیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں آخر کیوں؟“

ذرا ماضی کے واقعات پر نگاہ ڈالو، ہمیں اندازہ ہوگا کہ روشاق کا کردار مسلسل بھڑکا رہا ہے، وہ چوروں کی طرح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے، اس نے ہمارے قریب بکھرے ہوئے لوگوں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے تمہیں اس کا علم ہے، تمہیں معلوم ہے اے کے ہمدانی میرے لئے باپ جیسی شخصیت رکھتے تھے وہ اس کے ہاتھوں موت کے گڑھے تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد ولسکن ڈیزل نے ہمارا ساتھ دیا۔

”ہاں میں جانتی ہوں یہ سب کچھ ہے۔“

”اور میں بھی تو تمہاری بہتری کے لئے اپنی پریش زندگی چھوڑ کر اس پانی کے جہنم میں موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہوں، میں یہ سب کیوں کر رہی ہوں تم جانتی ہو، روشاق کے بارے میں تم جانتی ہو اس کا ایک ہی مقصد ہے تمہاری آڑ میں ہارون

دانش تک پہنچنا، اگر اسے سب کچھ معلوم ہو گیا تو نجانے کیا ہو، عسکری اسی کا آلہ کار ہے، کیا تم چاہتی ہو کہ وہ ہو جائے جو بارون دانش نہیں چاہتے۔
”ابو“ میرے حلق سے سسکی نکلی۔

صوفیہ نے پھر کہا۔ ”وہ اگر چاہتے تو تمہیں روشاق سے رجوع کرنے کے لئے کہہ سکتے تھے، تمہیں اس سفر کے لئے انہوں نے کیوں آمادہ کیا؟“

”سسر صوفیہ میری قوت برداشت کہاں تک میرا ساتھ دے سکتی ہے۔“ میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”معاف کرنا نشاء میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میں تو ایک غیر متعلق شخصیت ہوں جن کا ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وِسکن ڈیزل جو صرف دوستی تمہارے ہیں سب کچھ برداشت کر رہے ہیں، یہ سب کچھ تو تمہارے لئے ہی ہو رہا ہے نا، صرف تمہارے لئے۔“ سسر صوفیہ نے کہا اور میں خاموش ہو گئی۔

آہ میں کسی کو کیا بتانی کہ میری زندگی کن حالات کا شکار ہے، تینس میں کارپوک کی پہاڑیوں میں میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے، میں جو ایک قطعی غیر متعلق شخصیت بن کر خود اپنی ہی نگاہوں میں آئی، میں کیا ہوں، کیا تھی مستقبل میں کیا ہوں گی مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ نہ ماں علم میں تھی، نہ باپ کا کوئی پتہ تھا، کتنی الجھی ہوئی زندگی تھی میری۔ صوفیہ کو یہ سب کچھ نہیں معلوم تھا، بہر حال میں نے اس کی باتوں پر غور کیا، کم از کم یہاں تو وہ سچ کہہ رہی تھی، کوئی نہ کوئی جواب دینا ضروری تھا چنانچہ میں نے آہستہ سے کہا۔
”سوری! سوری سسر۔“

”ہم عسکری پر بالکل بھروسہ نہیں کر سکتے نشاء ڈارلنگ۔“ میں نے تمہیں بس اتنا نرم ہونے کے لئے کہا تھا جتنا ضروری ہے اور جتنا ہمارے کام آ رہا ہے، اس سے زیادہ کسی بھی شکل میں اسے بتانا خطرناک ہوگا، کیا تم نے اسے تابوٹوں کی کہانی سنا دی ہے، میرا مطلب ہے وہ کہانی جو۔“

”نہیں بالکل نہیں، بس وہی بتایا تھا میں نے اسے جو آپ کے سامنے بتایا تھا۔“
”اس نے خود بھی کوئی تفصیل نہیں پوچھی۔“
”موقع نہیں ملا کیونکہ ہم جہاز کے تہہ خانے تک نہیں جاسکے تھے۔“

”اوہ یہ اچھا ہی ہوا، اسے بالکل کچھ نہیں بتانا۔“
”ایک بات میرے دل میں بری طرح چھب رہی ہے سسر اس سے پوچھوں۔“
”ہاں بولو۔“

”کیا اس دوسرے تابوت میں میری ماں بھی ہو سکتی ہے، اس گھر میں بھی اس جیسے دو تابوت تھے، ایک کھلا تھا دوسرا بند تھا، کھلے ہوئے تابوت کی کہانی تمہیں معلوم ہو چکی ہے لیکن اب دونوں تابوت کھلے ہوئے ہیں۔“
”سسر صوفیہ نے پیاری بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ انہیں میرے اس سوال کا پوری طرح احساس ہو گیا تھا، میرے لہجے میں جو حسرت بسی ہوئی تھی وہ ان کے ذہن تک پہنچ گئی تھی، لیکن وہ میرے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکیں، کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔

”اتنا ہی کہوں گی نشاء ڈارلنگ کہ وقت کا انتظار کرو وقت خود مناسب انکشاف کر دے گا، یہ ہوشربا واقعات انسانی عقل سے بعید ہیں، بھلا مجھ جیسی معمولی سی عورت اس پر کیا روشنی ڈال سکتی ہے۔“

میں خاموش ہو گئی تھی، شام کے ساڑھے چار بجے پھر باہر نکل آئے، کیمین میں گھسے گھسے طبیعت بو جھل ہو گئی تھی، باہر نہ عسکری نظر آتا نہ وِسکن ڈیزل لیکن سسر صوفیہ نے ایک اور شخص کو روک کر پوچھا۔

”کیا گارساں نے کوئی جواب دیا؟“
”شام کو پانچ بجے وہ جہاز کے لوگوں سے مینگ کرے گا، ابھی آرام کر رہا ہے۔“ اس شخص نے کہا۔
صوفیہ خاموش ہو گئی، اس کے بعد ہم لوگ جہاز پر گھومتے پھرے، اس شخص نے جس نے اپنے آپ

کو برٹش مجسٹریٹ بتایا تھا کافی انتظامات کر لئے تھے، عرش صاف و شفاف تھا، طوفان سے ہونے والی ٹوٹ پھوٹ درست کر دی گئی تھی، پھر ہمیں وہ جگہ معلوم ہوئی جہاں گارساں مینگ کرنے والا تھا مجھے اور سسر صوفیہ کو بھی اس مینگ سے دلچسپی تھی، وِسکن ڈیزل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا، ہم نے پہلے ہی ایک بہتر جگہ قبضے میں کر لی۔ پھر کیمین خالی ہونے لگے اور پانچ بجے گارساں اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں آ گئے، گارساں کی عمر کوئی پچاس سال کے قریب ہوگی۔ جلدیہ درست کرنے کے بعد یہ لوگ اور خوفناک نظر آنے لگے تھے۔ ان کے سر کے بال بہت لمبے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، ٹھوڑیاں صاف کر لی گئی تھیں لیکن ایک مخصوص انداز سب کے چہروں پر نظر آ رہے تھے، پھر اس کی آواز ابھری۔

”میں چاہتا ہوں کہ جس مقصد کے تحت مجھے آزادی دی گئی ہے اسے بیان کرنے کے لئے آپ لوگ ایک نمائندہ منتخب کر لیں، وہ مجھے تفصیل بتائے اور اگر چاہے تو مشورے کے لئے کچھ لوگوں کو ساتھ رکھ سکتا ہے۔“

برٹش مجسٹریٹ ہی کو بات کرنے کے لئے منتخب کیا گیا، چند اور افراد بھی اس کے ساتھ تھے جو عمر رسیدہ تھے اور شیروں کی حیثیت سے اس کے سامنے بنے، اچانک ہی صوفیہ نے ایک طرف اشارہ کیا اور بولی۔

”دیکھو نشاء ادھر دیکھو۔“
میں نے صوفیہ کے اشارے پر دیکھا تو روشاق نظر آیا لیکن اس وقت پہلی بار میں نے اس منحوس بلی کو اس کے شانے پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ انتہائی خوفناک شکل کی بلی تھی، بس کیا بتاؤں لگتا تھا جیسے یہ چہرہ بلی کا نہیں بلکہ کسی عورت کا چہرہ ہو، ایک عجیب و غریب شکل تھی اس کی، بہت سے لوگ شاید اسی لئے اس کی جانب متوجہ تھے۔ پھر شاید گارساں نے بھی اسے دیکھ لیا اور وہ زور سے چیخا۔

”مقدس چچا..... کیا تم میرے شیر کی حیثیت سے میرا ساتھ دو گے؟“
”بے فکر ہو جیتے، میں یہیں سے تمہارے مفادات کی نگرانی کر رہا ہوں۔“ روشاق نے بھی چیخ کر جواب دیا اور گارساں نے قہقہہ لگا کر کہا۔
”ٹھیک ہے اپنے دشمن سے ہوشیار رہنا۔“ برٹش مجسٹریٹ نے کہا۔

”الجزائر کی طرف سفر کرتے ہوئے مارشل جس حادثے کا شکار ہوا ہے تمہیں اس کا علم ہے گارساں، جہاز کے انجن خراب ہو گئے ہیں، انجینئر حادثے کا شکار ہو کر مر چکے ہیں، کیمپن روڈرکس بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور دوسرے ذمے دار افراد کشتیاں لے کر فرار ہو گئے ہیں، اس وقت جہاز سمندر میں لاوارث ہے۔ کیونکہ تمہیں بہترین جہاز راں ہونے کا فخر حاصل ہے اس لئے جہاز کے اینجنیئروں مسافروں کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”معزز بزرگ! میں سب کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن سمندر کے قانون کے مطابق اور یقیناً تم میں سے کسی نہ کسی کو سمندر کا بین الاقوامی قانون معلوم ہوگا، اگر نہیں معلوم تو عمر رسیدہ خلاصیوں سے پوچھو یا قانون کے کسی ماہر سے جو واقعی قانون داں ہو۔“
”اپنی بات کی خود وضاحت کرو مائی ڈیزل گارساں۔“ برٹش مجسٹریٹ نے کہا۔

”دنیا بھر کی جہاز راں کمپنیوں اور مالک نے اس قانون پر دستخط کئے ہیں، جینو میں اس کا مسودہ پیش کیا گیا اور اسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ قانون یہ ہے کہ کھلے سمندر میں اگر کوئی جہاز کپتان کے کنٹرول میں نہ رہے اور وہ سفر جاری رکھنے سے بے بسی کا اظہار کر دے تو ہر وہ شخص جو جہاز کو بچالینے کا دعویٰ کرے اور اسے بچالے اس جہاز اور اس پر موجودہ ساز و سامان کا مالک بن جاتا ہے، اس پر موجود ہر شے اس کی ملکیت ہوتی ہے، اس ملکیت کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا، اگر یہ سمندری قانون آپ لوگوں کو منظور

ہو تو میں پورے غلوں سے ان زندگیوں کو بچانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔“

مسافر سناٹے میں رہ گئے تھے، ایک لمحے میں انہیں اپنے قیمتی ساز و سامان دوسرے کی ملکیت میں چلے جانے کا احساس ہو گیا تھا، ایک شخص نے برٹش جمسٹریٹ سے کہا۔

”ہاں یہ سمندروں کا بین الاقوامی قانون ہے میں جانتا ہوں۔“

”مسافروں کو خود اس کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔“ اس میں کوئی شک نہیں کہ برٹش جمسٹریٹ بھی بالکل اسی انداز میں سوچ رہا تھا اس نے کہا۔

”یہ سمندر کا قانون ہے یا نہیں میں نہیں جانتا، لیکن ایک شخص جو اس وقت متوقع سمندری موت کوٹا لے کی اہلیت رکھتا ہے یہ قیمت دینے کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔“

”میں اپنے خاندان کو بچانے کے لئے اپنا سب کچھ دینے کے لئے تیار ہوں۔“ ایک معمر شخص نے کہا اور پھر بہت سے اس کے ہم آواز ہو گئے، پھر چاروں طرف سے آمدگی کا اظہار ہونے لگا اور اس کے بعد شاید ہی کوئی ایسا رہا ہو جو زندگی خریدنے کے لئے تیار نہ ہو، گارساں نے کہا۔

”سب خاموش ہو جائیں اور صرف وہ شخص بولے جسے اس بات پر اعتراض ہو۔“

کوئی نہیں بولا تھا، چالاک بحری قزاق مسکرایا اور بولا۔

”تو شرط مکمل ہو گئی، مارشل اب میری ملکیت قرار پا چکا ہے، اب دوسری بات اول تو میں جہاز کا کپتان قرار پایا، دوسرا اس کا مالک، اب اس پر موجود ہر شے ہر چیز میری ملکیت ہے اور اس پر صرف میرا تصرف ہے، کپتان کا حکم جہاز پر ایک حکمران کا حکم ہوتا ہے، اور یہ حکم ماننا ہر ایک پر فرض، آپ لوگ میرا حکم مانیں گے۔“ کیوں نہیں گارساں؟“ جمسٹریٹ نے کہا۔

”تو پھر سب سے پہلے جہاز پر جتنے آتشیں

ہتھیار اور غیر آتشیں ہتھیار ہیں وہ میرے حوالے کر دیئے جائیں، ان میں فرانسیسی سپاہیوں کے ہتھیار بھی شامل ہیں۔“ گارساں بولا اور واسکوڈی بگڑ گیا۔

”یہ بکو اس ہے میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔“

”تو کیا تم مجھے بیوقوف سمجھتے ہو بوڑھے کاشیبل، ابھی یہ سب کچھ زبانی ہے، نہ میں نے جہاز کا انجن دیکھے ہیں اور نہ کپتان کا لباس پہنا، تم مجھے دوبارہ بیڑیاں لگا سکتے ہو، ہم تعرض نہیں کریں گے، لیکن پھر کیا کرو گے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ مجھے اس جہاز پر بچائی دے دو، ایسا کرو اگر تمہیں یہ اختیار دے دیا جائے۔“

پچھلے سے روشاق نے چیخ کر کہا۔ ”فرانسیسی افسر مسلسل مارشل پرفرانس کا قانون لاگو کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے، اگر یہ سیکڑوں انسانوں کی زندگیاں ختم کرنے پر آمادہ ہے تو اس پر حملہ کرو اور اسے بے بس کر دو۔ ہم اسے دوسروں کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“

غالباً واسکوڈی نے غصے میں آکر اپنا پستول نکالا تھا، میں صحیح طریقے سے نہیں دیکھ سکی تھی، لیکن میرے ساتھ بیشتر انسانوں نے روشاق کے کندھے سے خونخوار بلی کو چھلانگ لگا کر واسکوڈی کی جانب دوڑتے ہوئے دیکھا اور دوسرے لمحے وہ اس کے کندھے پر چڑھ گئی، اس نے واسکوڈی کا زرخرہ اپنے دانتوں میں دبایا تھا۔ واسکوڈی پستول نکالنا بھول گیا، بلی کو اپنے زرخرے سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بلی نے اس کا زرخرہ چبا ڈالا۔

بمشکل تمام واسکوڈی اسے اپنے گلے سے کھینچنے میں کامیاب ہوا تھا، لیکن بلی نے پھر اپنا رخ بدلا اور اس بار اس نے اس کے دائیں گال پر حملہ کیا تھا، میں نے بھی دیکھا اور دیکھنے والوں نے بھی کہ اس نے واسکوڈی کا داہنا گال بری طرح چیر کر پھینک دیا تھا اور پھر اس کے دانت واسکوڈی کی آنکھ میں گڑ گئے اور واسکوڈی کی ہینٹ ناک چپچپ گونجنے لگیں۔

لوگ سکتے میں رہ گئے تھے، واسکوڈی پستول

کالاک بھی نہیں کھول سکتا تھا اور اسے پھینک کر بلی کو اپنے پھرے سے ہٹانے کے لئے کوششیں کرنے لگا تھا۔ لیکن بلی اپنا کام کر چکی تھی، واسکوڈی کی آنکھ کی جگہ اب ایک خون اگتا غار سا نظر آ رہا تھا۔ کمزور دل کی عورتیں چیخیں مارنے لگیں، واسکوڈی زمین پر گر کر بری طرح تر پنے لگا۔ ہر طرف افراتفری پھیل گئی تھی، بلی نے ایک چھلانگ لگائی ایک بلند جگہ چڑھی اور اس کے بعد مزید اوپر، اور آخر کار وہ جہاز کے سب سے اوپری حصے میں چلی گئی اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

بلی جہاں جہاں سے گزری تھی وہاں نیچے موجود لوگوں کے لباس سے خون کے قطرے نچکے تھے، گویا واسکوڈی کی آنکھ اب بھی اس نے اپنے دانتوں میں دبائی ہوئی تھی، ایک لمحے کے لئے گارساں بھی شدید نظر آیا تھا اور اس کے بعد اس کی نگاہیں روشاق کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ پھر چند لمحوں کے بعد شاید وہ سنبھلا اور گرجدار آواز میں بولا۔

”میں کسی کو اس شخص کی عیادت کے لئے وقت نہیں دے سکتا، فیصلہ کرو اور عمل کرو۔ وہ نوجوان جو مجھے اختیار دے کر اس کام کے لئے اجازت دینا چاہتے ہیں فوراً عمل کریں۔ پہلے مرحلے کے طور پر سارے ہتھیار ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں اور اس کے بعد میں اپنے کام کا آغاز کروں گا۔“

سمندر کے قیدی گارساں کو ناخدا مان چکے تھے وہ سب کے سب واسکوڈی کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔ پورے جہاز پر یہی لوگ ہتھیاروں سے مسلح تھے، دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہتھیار چمکنے لگے، میں نے عسکری کوشی انہی لوگوں کے ساتھ مصروف دیکھا تھا، البتہ وٹکن ڈیزل کو بھی ہم نے دیکھا جو تین افراد کے ساتھ واسکوڈی کو اٹھا کر جہاز کے ایک سائیڈ پر لے جا رہا تھا، یہ تینوں افراد ڈاکٹر تھے میں جانتی تھی، جمع تقریباً منتشر ہو گیا تھا اور اب جہاز پر گارساں کی حکومت قائم ہو گئی تھی، حالات بتا رہے تھے کہ کچھ لوگوں کے علاوہ کوئی بھی اس کا مخالف نہیں رہا ہے، صوفیہ نے

آہستہ سے کہا۔

”اسے دیکھو، روشاق کا ہر کارہ کس طرح گارساں کے لئے مصروف عمل ہے۔“ صوفیہ کا اشارہ عسکری کی طرف تھا، میں تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر میں نے تھکے تھکے لمحے میں کہا۔

”پلیز سسٹر صوفیہ کین میں چلے، میں تھک گئی ہوں۔“ صوفیہ نے میرا کانپتا ہوا باز پکڑا اور میرے ساتھ کین کی جانب چل پڑی، کین میں داخل ہو کر میں اپنے بستر پر لیٹ گئی تھی، سسٹر صوفیہ بھی ایک گوشے میں پڑے ہوئے صوفیہ نے پر بیٹھ گئیں۔ ان کی نگاہیں میرا جائزہ لے رہی تھیں، پھر وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھیں اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئیں، انہوں نے محبت سے میرے بالوں میں انگلیاں ڈال دیں۔

”وہی زندگی اپنائے رہیں تو کیا ہرج تھاج، کتنی پریشان ہو، چہرہ مرجھا گیا ہے۔“

”بہت عجیب لگتا ہے سسٹر بہت ہی عجیب لگتا ہے، کاش بس اتنا پتہ چلنا کہ میرے ماں باپ مر چکے ہیں یا زندہ ہیں، کوئی مجھے یہ بتا دیتا۔“

”مگر تمہاری زندگی تو پریش تھی، آرام سے جی رہی تھیں، بہت سے لوگ یتیم خانوں میں پرورش پاتے ہیں، ان کے ماں باپ یا ماں یا باپ انہیں بہت چھوٹی سی عمر میں یتیم خانے میں داخل کر دیتے ہیں، وہاں رہ کر وہ صرف یتیم خانے کے متولی سے واقف ہوتے ہیں۔ نہ ان کے ماں کا تذکرہ ہوتا ہے نہ باپ کا۔“

”مگر میں کسی یتیم خانے میں نہیں چلی سسٹر، میرا مسئلہ تو کچھ اور ہی ہے۔“

”مگر تمہاری زندگی تو بہتر تھی۔“

”نہیں..... نہیں تھی، اتنی یکسانیت تھی میری زندگی میں کہ اعصاب چنچنے لگے تھے، ملازم کوٹھی اور بس، نہ کوئی دوست نہ شناسا، تنہا بالکل تنہا اور سسٹر یہ بات پہلے نہیں تھی بس میں آپ کو کیا بتاؤں، کیا بتاؤں میں آپ کو، بڑے عجیب سے حالات تھے۔ میری زندگی پر جانے کیسے کیسے واقعات چسپاں ہیں، سسٹر ماں کے

”تین نصیحتیں“

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے انتقال کا جب وقت آیا تو انہوں نے فرمایا۔ ”اے میرے بیٹو! میں تمہیں تین باتوں سے روکتا ہوں۔ انہیں اچھی طرح یاد رکھنا۔

۱۔ حضور اکرم ﷺ کی طرف سے حدیث صرف معتبر اور قابل اعتماد آدمی سے ہی لینا اور کسی اور سے نہ لینا۔

۲۔ قرضہ لینے کی عادت نہ بنالینا، چاہے چوغہ پہن کر گزارہ کرنا پڑے۔

۳۔ اشعار لکھنے میں نہ لگ جانا ورنہ ان میں تمہارے دل ایسے مشغول ہو جائیں گے کہ قرآن مجید سے محروم رہ جاؤ گے۔ (حیاء الصحابہ جلد 3 صفحہ 231)

(نوٹ: اس سے مراد فضول اور عشقیہ قسم کے اشعار ہیں، ورنہ اچھے اشعار اور حمد و نعت وغیرہ میں مشغولیت قابل تعریف کام ہے)

(ایس اقبال احمد - کراچی)

ہو رہی، وہ دیکھو وہاں ناشتے کا بندوبست کیا گیا ہے، احکامات کے مطابق ناشتہ کھانا کیمینوں میں نہیں پہنچایا جائے گا، بلکہ یہاں آکر ہر شخص اپنے لئے کھانا حاصل کر سکتا ہے اور کھا سکتا ہے، اس طرح اس نے حکم دیا ہے کہ جو جہاں ہے اور جس جگہ ہے وہاں اپنے اپنے حصے کی صفائی ستھرائی کرانی ہوگی، ایسے ہی احکامات اس کی

کروں، وہ قریب آئے تو میں نے مسکرا کر کہا۔ ”یوں لگتا ہے اگلے جیسے آپ تو اپنے کیمین میں رچے ہی نہ ہوں، ابھی بھی آپ مجھے اپنے کیمین میں نظر نہیں آئے۔“

میرے ان الفاظ پر انکل ڈیزل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، بولے۔

”ہاں ڈے داریاں ایک جگہ قدم نہیں ٹکانے دیتیں، میں جہاز کے پورے ماحول سے واقفیت حاصل کرتا رہتا ہوں۔“

”اس بے چارے شریف آدمی کا کیا ہوا انکل، میری مراد واسکوڈی سے ہے؟“

”بہت بری حالت ہے بے چارے کی، ایک آنکھ سے محروم ہو گیا ہے، زخروہ بھی خاصا چھالیا گیا ہے، وہ توافق کی بات یہ ہے کہ جہاز پر چند اچھے ڈاکٹر موجود ہیں، البتہ یہ انداز ہو رہا ہے کہ کچھ نہیں پائے گا، کیونکہ جہاز پر اب اتنے آلات بھی نہیں ہیں کہ اس کے زخروہ کا علاج ہو سکے، ڈاکٹروں کو جو کچھ حاصل ہو سکا ہے وہ اس کا علاج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”کسی کی طرف سے کوئی مداخلت تو نہیں ہوئی انکل؟“ میں نے سوال کیا اور ڈیزل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے تقریبی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا سوچتی ہو، نہیں کسی طرف سے کوئی مداخلت نہیں کی گئی اس کے علاج کے سلسلے میں۔“

”اور وہ خوفناک شخص میری مراد گارساں سے ہے۔“

”بڑا عجیب تاثر دیا ہے اس نے، دیکھنے میں ایک خوشخوار وحشی نظر آتا ہے، لیکن ایک منتظم اور حکمران کم کا انسان ہے، بہت ہی ذہانت سے اس نے احکامات نافذ کئے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جہاز کے تقریباً ہی نو جوان مسافر اس سے بھرپور تعاون کر رہے ہیں اور اسے اپنے کاموں میں کوئی دقت نہیں

شخص ابو حامدی سے ملاقات ہوگی، اس کے بعد کیا ہوگا اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ بس کئی پتنگ کی طرح ڈولتی پھر رہی تھی۔ اور اب یہ لمحات آگئے تھے، اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاز پر بڑے بڑے دلدوز مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ بے شمار افراد ہوں گے جو بن ماں باپ کے ہوں، زندگی کے وسائل سے بھی محروم ہوں، لیکن زندگی سے بے زار رہے ہوں میں بھی اگر اپنی ان تنہائیوں کو دوسری شکل دے دیتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا، کوئی کی بھی نہیں تھی زندگی میں ہر ضرورت پوری ہو جاتی تھی، لیکن بس کیا کہتی اپنے آپ کو، کارچوک میں تابوت میں میں اپنے آپ کوئی تھی اور میں اپنے آپ کو نہیں جانتی تھی کہ میں کیا ہوں، ذہن پر منٹوں بوجھ آ رہا تھا۔ میں نے گردن کھما کر مسٹر صوفیہ کی طرف دیکھا وہ شاید سونے کی کوشش کر رہی تھیں، میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور اس کے بعد مجھے نیند لانے میں کامیابی حاصل ہو گئی۔

گزرنے والی رات کے بعد پھر وہی صبح اور صبح کے ساتھ ساتھ ایک انوکھے ماحول ایک اجنبی کیفیت کا وہی انداز، ظاہر ہے کیمین میں وقت نہیں گزرا جاسکتا تھا، پڑے پڑے طبیعت پر شدید بوجھ آ رہا تھا۔ صوفیہ بھی میری طرح الجھنوں کا شکار تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہلانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن حال اندر سے بالکل مختلف تھا۔ خیر باہر آئے، ماحول کچھ بدلا بدلا سا محسوس ہوا۔ تمام کیمین آباد ہو گئے تھے جبکہ اس دوران زیادہ تر لوگ عرشے پر ہی نظر آیا کرتے تھے۔ لیکن ایک ہی رات میں کافی باقاعدگی پیدا ہو گئی تھی، غالباً اس لئے کہ لوگوں کو زندگی کی امید بندھ گئی تھی۔

کوئی خاص بات نہیں معلوم ہو سکی، کچھ لوگ عرشے کی صفائی میں مصروف تھے، یہ سب کے سب خلاصی بھی تھے، اور جہاز کے مسافر بھی، البتہ تھوڑی دیر کے بعد دور سے انکل ڈیزل آتے ہوئے نظر آئے، ہماری ہی طرف آ رہے تھے، ایک لمحے کے اندر میں نے فیصلہ کیا کہ انکل ڈیزل سے خوشخوار موڈ میں بات چیت

بارے میں پتہ چلا کہ جس عورت نے آٹھ سال تک مجھے ماں کی محبت دی وہ میری ماں نہیں تھی، پھر باپ کی شخصیت بھی مشکوک ہو گئی اور میں آپ کو صرف دو لفظوں میں یہ بتا سکتی ہوں کہ میں خود بھی اپنی شخصیت سے ناواقف ہوں، میں کون ہوں، کیا ہوں، ماضی سے میرا کیا تعلق ہے، اتنے واقعات ہیں کہ آپ سنیں گی تو دنگ رہ جائیں گی، جب بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ کو اپنے بارے میں وہ تفصیل بتاؤں نجانے کیوں میری زبان بند ہو جاتی ہے..... میرا خیال ہے موت بھی میری مشکل کا حل نہیں ہے۔“

”خود کو سنبھالے رکھو نشاء اپنے اعصاب پر قابو رکھو، اگر ہم زندگی بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تو تم سے تمہارے بارے میں پوچھوں گی اور یقین کرو مجھ سے زیادہ بہتر تمہارا اور کوئی ساتھی نہیں ہوگا، کیا سمجھیں، تم دیکھو اس وقت لوگوں کی کیا حالت ہے انہیں دیکھ کر ڈھارس ہوتی ہے، مائیں ہیں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”خدا کی قسم سسرلیوں لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ صرف میری وجہ سے ہوا ہے، اتنے سارے لوگ صرف میری وجہ سے اس عذاب کا شکار ہوئے ہیں۔“ میں نے رندگی ہوئی آواز میں کہا۔

”نہیں یہ صرف تمہارا احساس ہے۔“

”میں آپ سے بھی شرمندہ ہوں، کاش آپ سے اپنے ساتھ رہنے کی ضد نہ کرتی۔“

”اب اس خیال کو دل سے نکال دو، ہم سب تقدیر کے محکوم ہیں، یہ سب میرے لئے بھی تھا، یوں نہ ہوتا تو کسی اور طرح ہوتا، مجھے اب کوئی احساس نہیں ہے اور تم خود کو بالکل مجرم نہ تصور کرو۔“ صوفیہ نے کہا۔

بہر حال میں خاموش ہو گئی، وقت گزرتا رہا، اوپر نجانے کیا کچھ ہو رہا تھا۔ رات کو بہت سی باتیں سوچتی رہی، یہ سب کچھ جو شروع ہوا تھا اس کے بارے میں علم نہیں تھا کہ اس کا اختتام کہاں ہوگا۔ میں بہت الجھن کا شکار تھی، وسکن ڈیزل نے کہا تھا کہ الجیزائر میں ایک

جانب سے نافذ کئے گئے ہیں اور اب وہ پراطمینان انداز میں جہاز کے انجن روم میں موجود ہے، پورے جہاز میں اسلحہ نام کی جو چیز ملی ہے اسے کپتان کے کیمین میں منتقل کر کے اس نے اپنے دو مسلح آدمیوں کی گفرائی وہاں لگادی ہے، اس سلسلے میں اس نے کسی دوسرے پر اعتبار نہیں کیا، اس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کا انسان ہے۔

”اور انکل، روشناں! وہ تو کل کر سامنے آ گیا ہے۔“

”روشناں!“ ڈیزل نے ہونٹ ہنچھ کر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس شخص کو بہت پہلے سے نہیں جانتا، میرا مطلب ہے کہ میرا اور اس کا شعبہ یکساں ہے، لیکن میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی، مجھے عجیب سا احساس ہو رہا ہے اور مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ بے حد شاطر اور بہت ہی تبدیل شدہ انسان ہے، ہم صرف اسے ایک آثار قدیمہ کا ماہر یا مصریات پر اتھاری نہیں کہہ سکتے، اس کی ذات میں کچھ ایسی انوکھی قوتیں پوشیدہ ہیں جو ناقابل یقین سی ہیں، میرا خیال ہے ابتداء ہی میں اس نے یہ بھانپ لیا تھا کہ گارساں جہاز پر برتری حاصل کر لے گا، چنانچہ وہ اپنے عمل سے گارساں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، خصوصاً اس بلی کا وہ عمل گارساں جیسے لوگوں کو توجہ کرنے کے لئے بہت اہم تھا اور اب یہ کیفیت ہے کہ روشناں گارساں کی ناک کا بال بنا ہوا ہے۔“

”وہ ڈیزل کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی اس نے پھر کہا۔

”ہمیں پورے اعتماد کے ساتھ حالات کا انتظار کرنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے انکل میں مستعد ہوں۔“ میں نے کہا اور سرسٹر صوفیہ نے چونک کر مجھے دیکھا، غالباً وہ میرے اس نئے موڈ سے حیران ہوئی تھیں، غرض یہ کہ جہاز کے اصولوں کے مطابق پہلے ہم نے اپنے لئے ناشتہ حاصل کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کیمین کی طرف چل پڑے۔ کیمین کی صفائی کی خبر سگالی کے طور پر

سوچا کہ انکل ڈیزل کے کیمین کی بھی صفائی کردی جائے لیکن وہاں وہ خود مصروف تھے، تقریباً ان کے کیمین کی صفائی مکمل ہو چکی تھی، ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔

”اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مصروفیت بہت سے دوسروں کا علاج ہوتی ہے، تم لوگ بھی مصروفیت میں خود کو بہلا سکتی ہو۔“

”اب کیا کریں انکل، آپ نے تو اپنا کیمین خود ہی صاف کر لیا۔“

”کام بہت سے ہیں، اگر کوئی کام نہ ہو تو جہاز کے اسپتال میں جا کر زنگ کرو، سب سے عمدہ کام ہے۔“

”ارے واہ! زبردست.....“ یہ مشورہ مجھے بہت اچھا لگا تھا، وسکن ڈیزل ہمیں خود اسپتال لے کر چلے گئے۔ ہم اس اسپتال کو دیکھ کر حیران رہ گئے، بہت سے بستر تھے یہاں سب کے سب بھرے ہوئے تھے، کوئی شدید بخار کے عالم میں دبیاں بک رہا تھا کوئی زخموں سے کراہ رہا تھا۔ کچھ اس طوفان کی زد میں تھے اور طوفان کے بعد پیدا ہونے والے بحران کے زخمی، ایک بستر پر ہم نے داسکوڑی کو کبھی دیکھا، بے ہوش پڑا ہوا تھا، یہ بھی فکر تھا کہ گارساں نے اس کے سلسلے میں کوئی انتقامی طرز عمل نہیں اختیار کیا تھا، ڈاکٹروں کو اس کا علاج کرنے کی کئی آزادی تھی اور وہ زیادہ تر ای پر مصروف تھے، دواؤں کو عسکری ہمیں تلاش کرتا ہوا آ گیا۔

”دو گھنٹے سے مسلسل تلاش کر رہا ہوں تمہیں انتہائی مجبور ہو کر انکل ڈیزل سے پوچھنا پڑا تب پتہ چلا کہ تم یہاں ہو، ویسے اچھا مسئلہ ہے جاری رکھو۔“

”تم کیا کر رہے ہو؟“ میں نے طنز سے مسکرا کر پوچھا۔

”بہت سے کام ہیں ویسے مجھے روشناں کی وجہ سے خاص آدھی سمجھا جانے لگا ہے۔“ خاص آدھی تو ہم ہو۔“ میں نے بدستور اسی انداز میں کہا اور عسکری نہیں پڑا، پھر وہ صوفیہ سے بولا۔

”نشاء نے اس دوران بہت کچھ سیکھا۔“

خاتون صوفیہ، دنیا داری، دنیا سے آزادی، دنیا سازی، مجھ سے نفرت کے باوجود میرے ساتھ گفتگو میں تھوڑی سی لپک اور میں یہ محسوس کرتا رہا ہوں، لیکن خاتون صوفیہ آپ گواہ رہیں جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اگرقت آئے اور میں نشاء پر زندگی قربان کر دوں تو انہیں یہ ضرور یاد دلادیں کہ یہ میں نے کہا تھا اور خاتون صوفیہ اس کے لئے میں جس رنگ میں نظر آؤں جس کے ساتھ نظر آؤں یہ میری مجبوری ہوگی۔“ میں نے یا صوفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا کچھ دیر کے بعد وہ پھر بولا۔

”گارساں کے ساتھ بہترین انجینئر ہیں، انجن ٹھیک ہو جائیں گے، لیکن کمپاس ٹوٹ گئے ہیں اور گارساں کا خیال ہے کہ طوفانی لہریں جہاز کو عام سمندری روٹ سے دور ہٹا لائی ہیں۔ کمپاس کی غیر موجودگی میں جہاز اپنی مرضی سے روٹ پر نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس کا صرف یہ حل ہوگا کہ سمندر میں آگے بڑھتے ہوئے کسی اور جہاز کو تلاش کیا جائے گا، اگر ایسا ہو گیا تو کام بن جائے گا اور.....“ وہ خاموش ہوا تو صوفیہ نے سوال کیا۔

”اور اگر نہ ہوا تو؟“

”ہمیں خاتون صوفیہ ایسا ضرور ہو جائے گا، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سینکڑوں مسافروں کو لے کر سفر کرنے والے جہاز میں ایمر جنسی کے لئے خوراک اور ایندھن کے ذخائر بہت ہی اطمینان بخش ہیں، اس لئے کچھ وقت بے شک لگ جائے گا لیکن کچھ کچھ ضرور ہو جائے گا۔“ اس کے بعد سب خاموش ہو گئے تھے۔

دن گزر گیا، کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا تھا، مغرب کا وقت ہوا تھا، اچانک جہاز میں زلزلہ ہونے لگی، ہلکی آوازیں بلند ہونے لگیں، مختلف مشاغل میں مصروف مسافر چونک چونک کر اسات ہو گئے، سب اس تبدیلی کے بارے میں بانٹنا چاہتے تھے، پھر چند نوجوان خوشی سے ناچتے ہوئے لپکاتے وہ چیخ رہے تھے۔

”انجن ٹھیک ہو گئے، جہاز روانگی کے قابل ہو گیا، گریٹ کپٹن گارساں نے سینکڑوں انسانوں کی زندگی بچائی۔ آپ سب کو مبارک ہو۔“

ہر طرف خوشیاں بکھر گئیں چہروں کی رونقیں لوٹ آئیں، ہر طرف زندگی بکھر گئی، عرشہ پر جگہ جگہ رقص ہونے لگے۔

”مائی گاڈ!“ صوفیہ نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

پھر کپتان گارساں کی طرف سے نئے احکامات صادر ہونے لگے۔ جہاز کے ہوا بان اور بیرونی حصے ٹھیک کئے جانے تھے یہ کام جہاز کے اصل خلاصی کر رہے تھے اور نوجوان ان کی بھرپور معاونت کر رہے تھے۔ رات تک یہ ہنگامی کارروائی جاری پھر ڈنر کا وقت ہو گیا اور ڈنر کے بعد اعلان ہو گیا کہ عزت مآب جناب گارساں جہاز کے انجنوں کی درنگی سے مطمئن ہو گئے ہیں۔ اور جہاز اب کسی بھی وقت لنگر اٹھا دے گا۔

مسافر اس رات کیمینوں میں نہیں گئے تھے وہ زندگی کا جشن منا رہے تھے۔ ہم لوگ بھی عرشہ پر تھے۔ مگر میرے دل میں ایک خیال آیا اس وقت سب لوگ اپنی خوشیوں میں مگن ہیں کیوں نہ میں مال خانے میں موجود ان تابوتوں کو دوبارہ دیکھوں..... ممکن ہے، ممکن ہے۔“

یہ خیال اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ میں خود کو باز نہ رکھ سکی، لیکن میں تنہا جانا جاتی تھی بالکل تنہا۔ سرسٹر صوفیہ کو ڈاج دینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور موقع ملنے ہی میں نے جہاز کے نچلے حصے کی طرف قدم بڑھادیے۔ مجھے راستہ یاد تھا پہلے جب آئی تھی تو میں نے اسے ذہن نشین کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اب سب کچھ یاد آ گیا تھا۔

مال خانہ چونکہ رات میں استعمال نہیں ہوتا تھا اس لئے اس وقت یہاں روشنی نہیں ہوتی تھی البتہ وہ جگہ جہاں تابوت رکھے ہوئے تھے میں نے جگہ دیکھی تھی چونکہ اس سے جذباتی وابستگی تھی چنانچہ مجھے وہاں

لگے ہوئے روشنی کے بلب بھی یاد تھے اور انہیں روشن کرنے کے سوچ بھی دیکھے تھے۔ چنانچہ اندھیرے میں ایک ایک قدم سنبھل سنبھل کر چلنے لگی، مال خانے میں نہ جانے کیا کیا بھرا ہوا تھا بار بار ٹھوکر لگ رہی تھی اس وقت اس طرف کسی کے آنے کا خطرہ نہیں تھا لوگ جشن میں مصروف تھے چنانچہ کوئی مداخلت نہیں ہوئی گھٹا ٹوپ اندھیرے کے باوجود میں بالکل صحیح جگہ پہنچ گئی گھر اسانا، گہری خاموشی، اتنی کہ مجھے اپنے سانسوں کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ ذرا سی جنبش آواز بن جاتی تھی۔ اس وقت میری حیات بھی تیز کام کر رہی تھیں۔ اچانک ایک عجیب سے احساس سے میرے قدم رک گئے مجھے اپنے سانسوں کی آواز میں کچھ تبدیلی سی لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس آواز میں ایک اور آواز بھی شامل ہو گئی ہے ایک غیر مانوس آواز جیسے میرے علاوہ بھی یہاں اور کوئی موجود ہے۔

تصدیق کے لئے میں نے اچانک سانس روک لی۔ اس کے باوجود مجھے سانسوں کی آواز سنائی دی لیکن پھر یکدم خاموشی چھا گئی جیسے کسی کو میرے سانس روکنے کا احساس ہو گیا۔ پوری طرح غور کرنے لگی ممکن ہے یہ تنہائی کا خوف ہو جو وہم بن گیا ہے۔ میں نے یادداشت پر زور دے کر سوچ تلاش کئے اور وہ مجھے مل گئے۔ چٹ کی آواز کے ساتھ ایک بلب روشن ہو گیا۔ روشنی وسیع و عریض مال خانے میں پھیل گئی میں نے سانس روک کر ان تابوتوں کو تلاش کیا اور وہ مجھے نظر آ گئے لیکن وہ بند تھے میرا دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا۔ میں نے آنکھیں زور سے کھینچ کر کھولیں لیکن جو کچھ میں نے دیکھا وہی تھا۔ تابوت بند تھے، لیکن اب ان میں تالے نہیں لگے ہوئے تھے نہ ہی وہ تالے کہیں آس پاس نظر آرہے تھے۔ میں دل مضبوط کر کے آگے بڑھی اور تابوتوں کے پاس پہنچ گئی پھر میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے ایک تابوت کا ڈھکن کھول دیا۔

ساری جان آنکھوں میں سٹ آئی تھی۔ شاید اس وقت میری آنکھیں کچھ دیکھ سکیں، کیا اس کا تعین مجھے خود نہیں تھا بس ایک احساس تھا۔ لیکن تابوت خالی تھا۔ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔

بے اختیار دل سے ایک آواز نکل گئی۔ ایک باہمی سی دل میں اتر گئی چند لمحے ایک حیرت کے سے عالم میں گزرے پھر کسی مومہ سی امید پر دوسرا تابوت کھولا۔ لیکن وہ بھی خالی تھا، شاید کسی نے یہ خالی تابوت بند کر دیئے تھے۔ میری آنکھیں بھڑائی میں ایک جذباتی تاثر کے تحت میں ان تابوتوں میں جھانکتی رہی۔ پھر میری رندگی آواز ابھری۔

”اور آپ جانتے ہیں کہ یہ تابوت میرے لئے اجنبی نہیں ہیں، ابھی نہیں سوچا کہ آپ میرے پاپا نہیں ہیں، کارچوک کے تحقیقاتی عمل میں، میں بھی کھو گئی، آپ بھی کھو گئے، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس سنہری تابوت میں کون تھی وہ جو بھی تھی، کون مجھے بتائے گا۔ ایک آپ ہی تو تھے جو مجھے میری شناخت دے سکتے تھے یہ بتا سکتے تھے کہ میری تاریخ کہاں کھو گئی ہے۔ میں کون ہوں، میری ماں کون تھی۔ تاریخ کے پردوں میں کیا چھپا ہوا ہے، نزائندہ سے میرا کیا رشتہ ہے، پاپا آج کون ہے، آپ کو احساس نہیں ہے کہ میں سب سے اجنبی ہو گئی ہوں۔ سب کچھ چھن گیا مجھ سے۔ پاپا آپ بھی مجھ سے چھن گئے۔ آپ کون ہیں، دیکھئے میں کتنی لاوارث ہو گئی ہوں، پاپا مجھے ڈر لگ رہا ہے، میں سمندر کے پتھوں بیچ زندگی کے لئے ترس رہی ہوں، پاپا..... پاپا.....“ میری سسکیاں ابھرنے لگیں۔

لیکن اچانک کچھ ہوا۔ کچھ عجیب۔ سامنے رکے کارٹونوں میں سے ایک چھوٹا سا کارٹن اپنی جگہ سے لڑھک گیا۔ شاید کسی نے گرتے ہوئے کارٹن کو سنبھالا۔ لیکن وہ نہ سنبھل سکا اور کارٹونوں کی ایک قطار گر گئی اور اس کے عقب میں ایک انسانی سایہ نظر آیا جو ساکت تھا۔

میری سانس جیسے رکنے لگی وہاں تاریکی تھی

جہاں سایہ نظر آ رہا تھا۔ میرے حلق سے بے اختیار رندگی ہوئی آواز نکلی۔

”پاپا۔“ کوئی جواب نہیں ملا۔ تو میرے اندر ایک عجیب سا غصہ جاگ اٹھا۔ میرے بدن میں شدید گرمی پیدا ہو گئی میں آگے بڑھ کر دوبارہ سوچ بورڈ کے پاس پہنچی اور وہاں جتنے سوچ لگے تھے سب آن کر دیئے تاکہ خوب روشنی پھیل جائے اور میں ابو کو دیکھ سکوں میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں ہزاروں شکوے دل میں ابھرتے تھے نہ جانے کیا کیا کہنے دل چاہئے لگا تھا آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کی دیوار آکھڑی ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ پاپا اس وقت کسی مشکل میں ہیں۔ مشکل میں نے دیکھا کہ اس وقت وہ بے نقص نہیں ہیں نہ ہی پیٹوں کا کوئی ڈھیر ہے۔ یہ تو ایک باقاعدہ چہرہ تھا لیکن یہ چہرہ میرے پاپا کا نہیں تھا، یہ چہرہ انہی نہیں تھا، یہ..... یہ روشاق تھا، ہاں یہ محسوس چہرہ روشاق کا تھا۔

وہ پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ کچھ لمحے اس طرح گزر گئے۔ میرا جسم ساکت تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن بصارت جیسے ختم ہو گئی تھی بس دماغ کی آنکھوں سے میں روشاق کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحات اس طرح گزر گئے پھر اچانک روشاق کے بدن میں تحریک ہوئی اور وہ چند قدم آگے بڑھ آیا۔ بھراس کی آواز ابھری۔

”شاء۔ میں تمہارے تعاقب میں یہاں تک آیا ہوں۔ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے بات کرنا پسند کرو گی۔“

میرے لب جیسے ایک دوسرے سے چپک گئے تھے۔ میں ابھی تک ہوش و حواس بحال نہیں کر سکی تھی ہارون دانش کے بجائے یہ محسوس چہرہ دیکھ کر میرے دل کو شدید دھچکا لگا تھا۔ روشاق خاموش کھڑا تھا۔ وہ میرے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ پھر بولا۔

”میرے بارے میں تمہارے ذہن کو اس

قدر زہر آلود کر دیا گیا ہے کہ اسے صاف کرنا ایک مشکل کام ہے۔ جبکہ ابھی وہ وقت نہیں رہا کہ تم جان سکو کہ میرا تمہارا رشتہ سب سے قدیم ہے آشوری مندر کا بڑا بیچارہ جو جانتا ہے وہ کوئی نہیں جانتا۔ جبکہ تاریخ کے بے شمار کردار ہمارے درمیان خلا پیدا کرنے کی سر توڑ کوششیں کرتے رہے ہیں جن میں سب سے پیش پیش احمد جنیدی ہے سمجھیں تم غور کرو احمد جنیدی پر غور کرو۔“

میرے ذہن میں چرخیاں سی چلنے لگیں۔ احمد جنیدی کے بارے میں سب کچھ سوچنے لگی۔ وقت کی کہانی وقت ہی بیان کرتا ہے۔ صدافسوس ہمیں وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔

دفعتاً جیسے میری زبان کے تالے کھل گئے۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ اس محسوس شخص سے باتیں کر کے کچھ اور معلوم کروں۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مسٹر روشاق۔“

”یہ کہ وقت نے اس کہانی کو وقت سے پہلے آگے بڑھا دیا ہے جس کو وقت پر منظر عام پر آنا تھا۔“

”کہانی۔“ ہاں۔ انا طوق کی تحریر کردہ کہانی، سیوے، نابلس، نزائندہ کی کہانی، آشوری مندر کی سب سے خوبصورت پجاری کی کہانی۔“

”ایک بات بتاؤ گے روشاق۔“

”ہاں۔ پوچھو! شاید تمہارا دل میری طرف سے صاف ہو جائے۔“

”تم لوگ آستونانی مذہب کی تلاش میں تینوں گئے تھے۔“

”ہاں۔“ ”مائیکل جون اور امیر الحنات بھی تمہارے ساتھ تھے۔“

”ہاں، بالکل۔“

”وہ دونوں کہاں گئے۔“

”ان کا تاریخ مصر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”پھر وہ کیوں وہاں گئے تھے؟“

”خزانوں کی تلاش میں۔“

”کیا کارچوک کی پہاڑیوں میں کوئی خزانہ موجود تھا۔“

”دونوں بے وقوف اسے زرو جواہر کا خزانہ سمجھتے تھے لیکن وہاں جو خزانہ مدفون تھا وہ تاریخ مصر کے کچھ گم گشتہ باب تھے۔“

”وہ دونوں اس بات کو نہیں جانتے تھے۔“

”اور..... اور پایا.....؟“

”ہارون دانش توان خزانے کی چابی تھے۔ ہم دونوں اصلیت سے واقف تھے اور بس۔“

”پھر کیا ہوا۔“

”وہی جو ہوتا ہے۔“

”یعنی؟“

”انسان کی فطری خود غرضی، ہم دو آشاء، ایک دوسرے سے مخرف ہو گئے، میں دانش ہارون کے ساتھ مل کر تاریخ کے ایک عقدے کو حل کرنا چاہتا تھا لیکن ہارون دانش کے دل میں بے ایمانی آگئی خاص طور سے اس لاش کو دیکھ کر جو..... تمہاری ہم شکل تھی۔“

”کیوں.....؟“

”اس سوال کا جواب ممکن نہیں ہے بے بی۔“

”تم اس لاش کو لے کر غائب ہو گئے۔“

”مجبوری تھی۔ ہارون دانش بھی یہی کرتے، تم نے بہت سے سوالات کر لئے۔ میں جس حد تک تمہیں بتا سکتا تھا بتا دیا۔“

”مگر میں کچھ اور پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”بتا سکتا تو ضرور بتاؤں گا۔“

”میں کون ہوں۔ میرے ماں باپ کون تھے۔ وہ لاش میری ہم شکل کیوں تھی، میری شخصیت ایک پراسرار حرم میں کیوں لپٹی ہوئی ہے۔“

روشناق ہنس پڑا، پھر بولا۔ ”اس کے بعد اور کیا

رہ جاتا ہے۔ افسوس میں ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ ہاں تم چاہو تو میں وقت کے سفر میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

میں طنزیہ انداز میں ہنسی۔ پھر میں نے کہا۔

آپ صرف میری مدد کے لئے میرا تقاب کر رہے ہیں اس جہاز پر میری وجہ سے موجود ہیں۔“

”ان میں کوئی شک نہیں ہے۔ میں اعتراض کرتا ہوں، لیکن اس میں میرا مفاد بھی ہے۔“

”وہ خوفناک بلی آپ کی ملکیت ہے؟“

”ہلی۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ تم اسے بلی کہہ دو۔ لیکن وہ ایک عظیم کردار ہے جو ہمارے ساتھ تاریخ کی اہم ترین سچائیوں کی کھوج میں میرا ساتھ دے رہی ہے، وہ سچائیاں جو تاریخ کے اوراق میں گم ہو گئی ہیں۔“

”واہ! بڑے انوکھے کردار ہیں تمہارے ساتھ۔ یہ کردار کس..... کا ہے جس نے اہر جنیدی کو موت سے ہمکنار کرنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

”وہ ایک وارنٹک تھی اس کے لئے کیونکہ وہ بہت بلند پرواز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”اور اسی عظیم کردار نے میرے ایک ملازم کو زخمی کر دیا تھا۔“

”وہ مجبور تھی۔“

”اور۔ اور آخر میں آپ نے اسے کے ہمدانی کو زندہ درگور کر دیا۔“

”رب آسوس کی قسم۔ ڈوبتے چاند کی راتوں کی قسم۔ سب سے آخر میں ڈوبنے والے ستارے کی قسم۔ ہمدانی کے ساتھ یہ سلوک میں نے نہیں کیا تھا۔“

”تو پھر.....“

”یہ اہر جنیدی نے کیا تھا۔ وہ تمہارا ذہن میرے خلاف کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جبکہ تم میرے سب سے قریب ہو۔“

روشناق کی آواز غضب ناک ہو گئی۔ اور میرے ذہن میں شدید سنسنی ہونے لگی۔ بڑا حیرت ناک انکشاف تھا لیکن اس سے زیادہ

سنسنی خیز وہ قسمیں تھیں جو روشنق نے کھائی تھیں میرا ذہن ہلک گیا مجھے اپنے چاروں طرف گھسنے اور ناقوس بچنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان کے درمیان ایک آواز بلند ہو رہی تھی۔

”تقدیس ہو رب آسوس کی۔“

”ڈوتے چاند کی مقدس راتوں کی۔“

”محافظ ستارے کی جوروشتی کے لئے قربانی دیتا ہے۔“

”تقدیس ہو، تقدیس ہو، تقدیس ہو۔“

ایک عجیب سی گونج پیدا ہو گئی تھی اس دوران میری نگاہیں روشنق کی طرف اٹھ گئیں جو بڑے پراسرار انداز میں مستعدار پاتھا جسے میری کیفیت کو سمجھ رہا ہو۔ میں ایک جھٹکے سے اس سحر سے نکل آئی۔ پھر

میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے کہا۔

”وہ کتنا میں کہاں ہیں۔“

”سو فیصدی اہر جنیدی کے قبضے میں ہیں۔“

میں تم سے آخری بات کہنا چاہتا ہوں بے بی۔“

”ہاں۔ کہو۔“ میں اب پوری طرح سنہیل گئی تھی۔

”دیکھو، کبھی کبھی وہ سب سے بڑا دوست ثابت ہوتا ہے جسے سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ میں تمہیں پیش کش کرتا ہوں کہ مجھ پر بھروسہ کرو، مجھ سے تعاون کرو۔ میں تمہیں تمہاری منزل تک پہنچاؤں گا۔ لیکن تمہیں پورے خلوص سے مجھے تسلیم کرنا ہوگا۔“

بڑی انوکھی پیش کش تھی، سب سے بڑے دشمن کی، اس شخص نے تو ساری مشکلات پیدا کی تھیں اس کی باتوں پر یقین کیسے کیا جاسکتا ہے جبکہ یہی ساری مصیبتوں کی جڑ تھا، کیسے کیسے انوکھے انکشاف کئے تھے

اس نے سب سے زیادہ سنسنی خیز یہ کہ ہمدانی صاحب کا وہ حشر اہر جنیدی نے کیا ہے، اہر جنیدی کے بارے میں خواب میں بھی یہ نہیں سوچا جاسکتا تھا۔

”یہی تو افسوس ہے بے بی۔“ ان لوگوں

کو تمہارے سلسلے میں مجھ پر برتری حاصل ہو گئی ہے۔ روشنق نے کہا، اور میں ہونچکی رہ گئی۔ ”انہوں نے تمہیں ٹریپ کر لیا ہے، انہوں نے تمہیں یقین دلادیا ہے کہ میں تمہارا دشمن ہوں۔“

پراسرار روشنق میری سوچوں سے واقف ہو رہا تھا۔ اس نے پھر مجھ پر ہم مارا اور بولا۔

”یہ صرف چہر شامی ہے، قوت مشاہدہ ہے، خبر میں نے تمہیں سوچنے کی دعوت دیدی ہے، فیصلہ تمہیں کرنا ہے ہاں ایک بات ضرور کہوں گا فیصلہ اپنی ذات سے کرنا ہے خاص طور سے وسکن ڈیزل کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ میرے سلسلے میں اس سے مشورہ کرو گی تو وہ تمہارا ذہن اور ہٹکا دے گا۔ اگر فیصلہ میرے حق میں کرو تو مجھ سے میرے کہین میں ملنا۔ نمبر تمہیں بتائے دے رہا ہوں جہاں میں دوسرے نام سے مقیم ہوں۔ اور اگر دل میری پیشکش کو قبول نہ کرے تو کوئی بات نہیں۔ وقت خود سارے فیصلے کرے گا میں چلتا ہوں اور جاتے جاتے تمہیں ایک خوشخبری سنا دوں۔“

”خوشخبری۔“

”ہاں۔ شاید تمہیں اہر جنیدی کے بارے میں معلوم ہو۔“

”کیا.....؟“

”یہی کہ وہ بھی جہاز پر موجود ہے۔“

”کیا..... میں اچھل پڑی۔“

”ہاں۔ کہین نمبر نو سو بیس میں وہ عدنان ثانی کے ساتھ موجود ہے۔ چلتا ہوں۔“ وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ لیکن میں بری طرح پکڑائی ہوئی تھی۔

میرے خدا یہ سب کیا ہے، مسٹر ڈیزل تو اچھی دانست میں بڑی رازداری سے یہ سفر کر رہے تھے اور اپنی سوچ کے مطابق انہوں نے سب کو ڈانچ دے دیا تھا لیکن یہاں تو سب اس جہاز میں جمع ہو گئے تھے۔

اور حیرت کی بات ہے کہ اب تک سب اپنے آپ کو ایک دوسرے سے چھپائے ہوئے تھے۔ اس

Dar Digest [133] March 2013

Dar Digest [132] March 2013

بستر پر دراز ہوئی، سارا یمن مل رہا تھا ایک عجیب سی گھبراہٹ دل پر طاری تھی۔ جس وقت پایا کے ساتھ ان کے ریسرچ ورک میں ساتھ ہوئی تھی ایک طمانیت ایک اعتماد، زندگی پر تھا، ماں نہیں تھی، آباں یہ شخص جنہوں نے کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی، لیکن اب میرا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

”کیوں.....؟“
 ”ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔“
 ”کیا کروں مگر باہر جا کر، لوگ شراب لہا کر بدست ہو رہے ہیں۔“
 ”ہاں، زندگی ایسی ہی چیز ہے۔“
 ”مگر تم کہاں جا چھپی تھی؟“ وہ اپنے بستر پر

”اس نے مجھے اس کے کہیں کا خبر بھی بتایا ہے اور عدنان ثنائی کے بارے میں بھی جو اس کہیں میں اس کے ساتھ ہیں۔ عدنان ثنائی کی تفصیل بھی آپ کو بتا چکی ہوں۔“

”وہاں سسر“
”سنو شاء“ کبھی کبھی دل کے فیصلے عقل کے
جھلکوں پر مسرت لے جاتے ہیں میں اس سے مخرب
میں ہوں۔ اگر ہارون دانش صاحب نے تمہیں اجین
بیجا اور سکین ڈیزل پر بھروسہ کیا تو تمہارے نئے انکل

علاوہ فرض کرو اگر احر جیندی شاطر ہے اور کوئی گہرا کھیل کھیل رہا ہے تو دانش صاحب ہمیں روشاقت کا سہارا لینے کے لئے بھی کہہ سکتے تھے۔

میں کچھ لمحے صوفی کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر ایک دم بات سمجھ میں آگئی صوفیہ بڑے دور کی کوڑی لائی تھی۔ میرے ذہن سے ایک بوجھ ہٹ گیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔

”لیکن اس کے باوجود ہمیں ایک گوشہ خالی رکھنا ضروری ہے۔“

”وہ کیا؟“

”مکن ہے احر جیندی یہاں موجود ہو۔ میرے خیال میں اب ہمیں سب سے پہلا کام یہ کرنا ہے کہ یہ ساری باتیں انکل ڈیزل کو بتادیں۔“

”بات خطرناک نہ ہو جائے۔“

”ہم جن خطرات سے گھرے ہوئے ہیں وہ کم ہیں کیا، ایک اور خطرہ پیش آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ویسے میں ایک پیش گوئی کروں۔“

”ہوں۔“

”روشاقت اب تمہارے ارد گرد پھرائے گا، وہ بے دھڑک تم سے ملاقاتیں کرے گا۔ تمہیں کوئی خاص بات نہیں کرنی اس سے، ہر جواب انکل کے مشورے سے دینا ہے کوئی غیر ضروری بات نہیں کرنی اس سے۔“

”ٹھیک ہے سسٹر۔ اب کیا کریں۔“

”میں انکل ڈیزل کو تلاش کر کے لاتی ہوں۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا اور صوفیہ باہر چلی گئی، لیکن میرے ذہن میں شدید الجھن پیدا ہوگئی، روشاقت نے کچھ باتیں ایسی کہی تھیں جن کا علم میرے سوا کسی کو نہیں تھا، آشنائی مندر کی پچارن، سیوے اور زائلہ یہ باتیں روشاقت جانتا اور کوئی نہیں۔ وہ سب سے زیادہ پراسرار اور اوقات شخصیت ہے اگر اسے اغراض ہوا تو۔۔۔۔۔

انکل ڈیزل شاید آسانی سے صوفیہ کو مل گئے تھے، کچھ لمحوں کے بعد ہی وہ دونوں کیمین میں داخل

ہو گئے۔

”ہیلو نشاء۔۔۔۔۔ کیا ہنگامے ہو رہے ہیں۔“

”آپ کے لئے دلچسپ کہانیاں تیار ہیں انکل۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ گڈ، کیا کہانی ہے بھئی۔“

”میں بتا دوں نشاء۔۔۔۔۔؟“ صوفیہ نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ تب صوفیہ نے پوری داستان من و عن سادی اور خود انکل ڈیزل حیران رہ گئے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر انہوں نے کہا۔

”میرے خدا۔ ہو شر با کہانی ہے۔ ہم نے تو بڑی طرح مار کھائی ہے، جہاز پر اتنا بڑا اجتماع ہے اور ہمیں خبر بھی نہیں۔ احر جیندی اور عدنان شاکر پر ہے۔“

”اب ہم کیا کریں انکل۔“ میں نے پوچھا۔

”سکن ڈیزل کے ہوتوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے پر خیال لہجے میں کہا۔“میرے خیال میں روشاقت سے غلطی ہوگئی۔“

”کیسے۔۔۔۔۔؟“ صوفیہ نے چونک کر پوچھا۔

”ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ڈیزل پر خیال انداز میں بولے۔“

”بتائیے انکل اب ہم کیا کریں۔“

”ہمیں ان حالات میں کچھ اور کرنا ہوگا، عمدہ موقع ہاتھ آ رہا ہے۔“

”پلیز۔۔۔۔۔ کچھ بتائیے انکل۔“

”سنو نشاء، تم روشاقت سے ملو، اپنے آپ کو اس کے اعتماد میں دیدو۔ اسے پوری تفصیل بتاؤ نیولان والے گھر کے بارے میں بھی۔ البتہ چند باتیں صفیہ راز میں رہیں۔“

”وہ کیا انکل۔“

”نیولان والے گھر میں تم نے جو تابوت دیکھے تھے ان میں دو میاں تھیں، لیکن بے جان، ان میں کوئی تحریک نہیں تھی۔“

”اوہ، لیکن انکل، اس عورت کی شکل میں

روشاقت اور اس کی بیٹی۔“

”مجھے یاد ہے، لیکن تم فکر مت کرو، اور ہاں، اپن آنے کے بارے میں تم اسے بتا سکتی ہو کہ جنہیں ایک کال کے ذریعہ اس کی ہدایت ملی تھی جو ہارون دانش کیا واز میں تھی۔ مزید یہ کہ تم مجھ سے پڑاری کا اظہار بھی کرو۔“

”انکل میں اس سے خوف زدہ ہوں۔“

”نہیں میری جان، بالکل فکر مت کرو۔“ میں جنہیں بتاؤں وہ بہت چالاک ہے، اس لئے گارساں کوششے میں اتار کر خود کو محفوظ کر لیا ہے اس بات کو خاص طور سے ذہن میں رکھنا ہے۔“

”مجھے بتائیے انکل۔“

”کیا۔۔۔۔۔“

”میں کل اس سے ملوں۔“

”ہاں ضروری ہے۔“

”اور احر جیندی؟“

”ابھی اس پر غور نہ کرو۔ اسے میں دیکھوں گا۔“

”سکن ڈیزل تھوڑی دیر تک میرے پاس رکے پھر جانے کے لئے اٹھ گئے۔“

”میں چلتا ہوں بے بی، ویسے میرا خیال ہے کہ گارساں بہت جلد جہاز کی روانگی کا اعلان کر دے گا۔“

”دوسری صبح میں بہت دیر تک سوئی رہی تھی۔ میں اور سسٹر صوفیہ دونوں ساتھ ہی جاگے تھے میں واش روم سے فارغ ہوئی تو صوفیہ واش روم چلی گئیں ابھی وہ باہر ہیں آئی تھیں کہ کیمین کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو ایک نوجوان نظر آیا۔ اس کے پیچھے کوئی اور بھی تھا۔“

”ناشتہ لے لیجیے میڈم کیا آپ اس کیمین میں تباہ ہیں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں، ہم دو ہیں، میں اور میری ساتھی۔“

”وہ بھی خاتون ہیں۔“

”ہاں!“

”براہ کرم اپنا نام بتادیں، کیپٹن گارساں

سروے کر رہے ہیں تاکہ سفر کرنے والوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔“

میں نے اپنا اور صوفیہ کا نام بتایا جو اس نے کیمین نمبر کے ساتھ نوٹ کر لیا، پھر میں نے نے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میرا نام قلب موگن ہے۔ میں بھی جہاز کا مسافر ہوں، لیکن ہم رضا کارانہ طور پر خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔“

”کیا خواتین کو بھی ذمہ داریاں دی گئی ہیں۔“

”کپتان گارساں کا کہنا ہے کہ یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے۔“

”شکریہ“ میں نے کہا اور ناشتہ لے کر رکھ لیا۔ ناشتہ کرتے ہوئے میں نے صوفیہ کو اس بارے میں تفصیل سنائی تو وہ ہچکے انداز میں مسکرا دی، پھر بولی۔

”مب لوگ نکتے خوش ہیں نشاء زندگی کتنی عجیب ہوتی ہے۔“

”وہ تو ہے سسٹر اس وقت آپ یہ کس لئے کہہ رہی ہیں۔“

”جہاز کے انجن ٹھیک ہوتے ہیں لیکن کپاس ٹوٹ گئے ہیں کوئی منزل، کوئی راستہ نہیں ہے جہاز کہاں جائے گا۔ آگے آگے کیا ہوگا کچھ معلوم نہیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، لیکن ایک اور بات ہے۔“

”وہ کیا۔“

”اس وقت کا کپتان، بحری قزاق ہے، سمندروں کا کیڑا، ممکن ہے وہ راستہ تلاش کر لے۔“

”ہاں، اچھا سوچا تم نے۔ صوفیہ نے انحراف کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے فیصلہ کیا کہ عرشہ پر چلا جائے۔ مختصر تیاریوں کے بعد ہم عرشہ پر چل پڑے یہاں خوب رونق تھی، نوجوان بڑی مستعدی سے سارے کام کر رہے تھے۔ برج آباد تھا۔ گارساں کے ساتھی جہاز کے افسران کی وردیاں پہنے سارے امور کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہم لوگ اسپتال کی طرف چل

آسیب

شائستہ سحر - راولپنڈی

چاندنی رات میں ہر سو عجیب سرور چھایا ہوا تھا کہ اچانک غراٹھیں سنائی دیں جب نوجوان نے اس طرف دیکھا تو دھل کر رہ گیا، ایک بوڑھی عورت نے ایک نوجوان کا گلا دبوچ رکھا تھا اور پھر اس عورت نے نوجوان کا گلا بھنبھوڑنا شروع کر دیا اور پھر.....

دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتی اور سطر سطر روٹنے لگے کھڑے کرتی دہشت ناک حقیقت

محسن اپنا سر پکڑتے ہوئے بولا۔ ”فرید! تم نہیں جانتے وہ خوف ناک بڑھیا میرے حواسوں پر سوار ہو چکی ہے اس قدر ہیبت ہے اس کے چہرے اور اس کی زرد آنکھوں میں کہ میں دیکھ کر لرز جاتا ہوں۔“
میں گہرا سانس لے کر بولا۔ ”تم نے آس پاس سے پتہ کیا اس بوڑھی عورت کا کہ وہ کون ہے اور آئی کہاں سے ہے؟“
محسن اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں کیا ہے مگر کسی بھی شخص کو پتہ نہیں اس عورت کے متعلق! وہ بالکل خاموش رہتی ہے کسی سے بات نہیں کرتی بس ہر وقت سر کو جھکائے بیٹھی رہتی ہے مگر میں جب بھی اس کے پاس سے گزرتا ہوں لازمی سر اٹھا کر اپنی خوف ناک آنکھوں سے مجھے گھورتی ہے اس وقت مجھے اس بوڑھی عورت سے جس قدر خوف آتا ہے میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔“

”یہ بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ تیرا گھر بھی اسی گلی میں ہے۔“ میں کچھ سوچتے ہوئے بولا محسن میری بات کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ ”ہاں یاد میرا گھر بھی اسی گلی میں ہے جہاں وہ منوس بڑھیا ایک کھلے میدان میں بیٹھی ہوئی ہوتی ہے وہ جگہ کئی سالوں سے خالی اور ویران ہے اور اگر میرے بس میں ہوتا تو میں وہاں سے گزرتا ہی چھوڑ دیتا۔“

”یاد وہ آج بھی میرے راستے میں بیٹھی تھی اور بس مجھے ہی گھورے جا رہی تھی۔“ محسن پریشانی کے عالم میں بولا۔
”کون..... وہ حسین؟“ میں نے مزاحیہ انداز میں بے ساختہ کہا تو وہ ناگواری سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔
”کچھ خوف خدا کرو! وہ اور حسین استغفار۔“ محسن نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔
میں اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”یاد وہ کبھی نا کبھی اپنے دور میں حسین تو ہو گئی نا! اس سے کیا فرق پڑتا ہے اب وہ ستر اسی سال کے لگ بھگ ہے اور سونے پر سہا کہ کہ وہ کبھی بھی ہے۔“
”تو اب میرا مذاق اڑا رہا ہے۔“ محسن غصے سے سر پٹا کر بولا۔

میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”اب اس کا کوئی حل بھی نہیں اس کے سوا کہ تو اس بوڑھی حسین کو اٹھا کر کہیں دور پھینک دے۔“
”تو اپنی بکواس بند کرے گا کہ نہیں۔“ محسن غصے سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔
میں کچھ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”مجھے غلط مت سمجھو مگر تم جس کے سامنے بھی یہ باتیں کہو گے وہی انہیں مذاق میں لے گا مگر خیر تمہاری پریشانی اپنی جگہ ہے۔“

اور عدنان ثنائی موجود ہیں۔ عدنان ثنائی لنگڑا رہے ناں۔“
”ہاں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔“
”دونوں موجود ہیں، ہاں تم رومانق سے دوبارہ کب ملو گی۔“

”جب آپ کہیں۔“
”جلدی نہ کرو۔ انتظار کرو کہ وہ خود تم سے رجوع کرے۔ ہاں اور اگر وہ کوئی پیش کش کرے تو قبول کر لینا۔ تھوڑا سا انتظار کرو۔“
”ٹھیک ہے اگل۔“

دن کو سوا گیا رہ بجے کے قریب جہاز میں ایک اجنبی آواز ابھری اور پھر تھراٹ پیدا ہو گئی۔ اس کے انجن اشارت ہو گئے پھر لنگڑاٹھائے جانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی آہٹیکروں پر گارساں کی آواز ابھری۔
”جہاز کے معزز مسافروں کو زندگی کی مبارکباد، مارشل اپنے سفر کا آغاز کر رہا ہے اپنا تعاون اسی طرح جاری رکھیں اور میرے بتائے ہوئے اصولوں پر قائم رہیں جو مذہ داریاں آپ کو دی گئی ہیں انہیں انجام دیتے رہیں آپ کا کپتان آپ کو آپ کی منزل تک پہنچائے گا۔ شکریہ۔“

مسافر خوشی سے تاپنے لگے۔ موسم خوشگوار تھا دھوپ نکلی ہوئی تھی دور سے ہمیں عسکری نظارہ آیا اور نہ جانے کیوں مجھے ہنسی آ گئی صوفیہ نے چونک کر مجھے، پھر میری نظروں کا تعاقب کر کے عسکری کو دیکھا۔ پھر بولیں۔

”کیا ہوا۔ کیوں ہنسی آئی؟“
”بہت سی باتوں پر سسر..... مارشل پر کتنی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ صرف میں اکیلی اندھے پن میں سفر کر رہی ہوں، کچھ نہیں جانتی۔ آپ اخلاق کی قیدی ہیں اور یہ بہت سے سر بھرے، سر زمین مصر کے سرشتہ رازوں کی نقاب کشائی اور عسکری کاروباری عاشق، دولت کی ہوس کا شکار، انکل ڈیزل اور..... اور نہ جانے کیا کیا۔“

(جاری ہے)

پڑے۔ ہر جگہ شاندار کارکردگی کا مظاہرہ ہوا تھا جہاز بالکل پہلے جیسی شکل میں نظر آ رہا تھا۔
سسر صوفیہ نے متاثر لہجے میں کہا۔

”دیکھ رہی ہو، کیا شاندار کام ہو رہا ہے۔ جبکہ جب وہ قیدی کی شکل میں نظر آیا تھا تو ایک وحشی درندہ نظر آ رہا تھا۔“
”ہاں.....!“ میں نے تھکی تھکی آواز میں کیا۔
اور سسر صوفیہ چونک کر مجھے دیکھنے لگیں۔ پھر بولیں۔
”کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

”ہاں بس ایک عجیب سا احساس ہوا ہے آخرا انسان کیا ہے، میں دنیا کو کیوں نہیں سمجھ پاتی سسر؟“

”واقعی سب کچھ بہت عجیب ہے۔“ صوفیہ نے اچھے لہجے میں کہا۔ ہم اسپتال کا جائزہ لیتے رہے۔ مٹی کا شکار افریدستور زیر علاج تھا اس کے ساتھی اس کی نگہداشت کر رہے تھے۔ پھر ہماری نگاہ انکل ڈیزل پر پڑی وہ بھی وہیں موجود تھے ہم ان کے پاس پہنچ گئے وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔
”کیوں کیا محسوس کر رہی ہو؟“

”عجیب۔“
”ہاں، سب کچھ عجیب ہے۔ واسکوڈی کو دیکھا۔“

”جی۔ کیا ہے وہ۔“
”بہتر ہے، وہ کہتا ہے کہ اسے گارساں نے نہیں ایک کینے مسافر نے نقصان پہنچایا ہے۔ اور اب وہ رومانق کا دشمن بن چکا ہے۔“

”جہاز کب روانہ ہوگا انکل؟“
”میرا خیال ہے زیادہ دیر نہیں، گارساں واقعی اعلیٰ درجے کا کپتان اور انجینئر ہے۔ اس نے نئے لاؤڈ اسپیکر لگوائے ہیں جن پر وہ روٹنگ کا اعلان کرے گا۔“
”اور کوئی خاص بات انکل۔“

”ہاں ہے۔“ ڈیزل نے کہا اور ہم چونک پڑے ڈیزل نے کہا۔ ”کبین نمبر نو سوئیں میں اصر جینیوی

میں حسن کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”پریشان مت ہووہ بے چاری کوئی مصیبت کی ماری ہوگی تم خواہ مخواہ اس سے ڈر رہے ہو۔“

حسن خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”تم نے ابھی اس عورت کو دیکھا نہیں تم بھی دیکھو گے تو میری طرح ہی اس سے ڈرنے لگو گے۔“

مجھے اس کی بات سن کر پھر بھی آگئی اور میں اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ پہلے ہی تم پر فریفتہ ہو چکی ہے۔“

حسن مجھے کھانے والی نظروں سے گھورتا ہوا اٹھا اور غصے سے میری دکان سے باہر نکل گیا۔

حسن اور میں یعنی فرید بچپن سے ہی بہت گہرے دوست تھے۔ ہم نے میٹرک تک ایک ساتھ پڑھا تھا مگر بد قسمتی سے میرے والد صاحب نے مجھے میٹرک سے آگے پڑھنے نہیں دیا اور اپنے ساتھ دکان پر کام پر لگالیا۔ ہماری اپنی کپڑے کی دکان تھی۔ میں بھی اپنے والد صاحب کے ساتھ پوری دلچسپی سے کام کرنے میں لگن ہو گیا مگر میری اور حسن کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا تھا ہمارا یہ دوستی کا رشتہ کسی خونی رشتے سے کہیں زیادہ گہرا اور مضبوط تھا۔ حسن اب بی ایس سی کا طالب علم تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا وہ خوبصورت اور وجہیہ ہونے کے علاوہ بہت ذہین بھی تھا۔ مگر چند ماہ سے وہ عجیب صورت حال کا شکار تھا، ایک بڑھیا ہر وقت اس کی گلی میں بیٹھی رہتی تھی حتیٰ کہ جب وہ رات گئے بھی گھر لوٹتا تو وہ گلی میں موجود ہوتی۔ حسن کا خیال تھا وہ بڑھیا ضرور کوئی آسیب ہے جبکہ میں اس کی باتوں کو محض اس کا وہم خیال کرتا تھا۔

کیونکہ میرا یہی خیال تھا وہ عورت کوئی مصیبت زدہ ہوگی کیا پتا اس کی کیا مجبوری تھی جو وہ رات گئے تک لاوارثوں کی طرح گلی میں پڑی رہتی تھی۔ حسن تقریباً روز ہی آکر اس بڑھیا کے متعلق اپنے خوف کا اظہار کرتا تھا مگر میں نے اس کی باتوں کو اتنا سنجیدہ نہیں لیا تھا۔ چند ماہ سے میرا بھی حسن کے گھر چکر نہیں لگتا تھا میں خود بھی

دوستوں کی طرف اتنا جانا پسند نہیں کرتا تھا جبکہ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی کیونکہ سب ہی مجھ سے دکان پر آکر مل لیتے تھے حسن کی بات الگ تھی وہ میرے گھر میں بھی آ جاتا تھا میرے گھر والے اسے گھر کا ایک فرد ہی سمجھتے تھے۔ حسن کو اس بڑھیا کے حوالے سے میں خوب چھیڑا کرتا تھا اور جان بوجھ کر اسے کوئی ناگوئی فقرہ کس کر چڑایا کرتا تھا۔ وہ بے چارہ اکثر غصے سے آگ بگولا ہو جاتا کرتا تھا۔

میں آج تک نہیں بھولا اس رات کو جب حسن مجھ سے ملنے میرے گھر آیا تھا اس رات سردی بہت زیادہ تھی رات کا کوئی دس بجے کا وقت تھا اسے اس وقت اپنے مرکزی دروازے پر دیکھ کر میں حیران رہ گیا اس وقت پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی اس کا جسم کانپ رہا تھا رنگ بالکل زرد ہو رہا تھا، میں فوراً اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا اور صوفے پر اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ ”کیا ہوا تم ٹھیک تو ہو؟“ میں اس کا جائزہ لے کر بولا۔ حسن کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔ ”ہاں..... ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں بدستور اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”بالکل نہیں ہوتم ٹھیک بتاؤ کیا بات ہے؟“

وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یار چند روز سے میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں اکثر سو تے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں قبرستان میں پڑا ہوں قبر کی مٹی کی بو اپنی سانسوں میں جاتے ہوئے محسوس کرتا ہوں میں! اور..... اور میرے ارد گرد قبرستان کے ہولناک سنانے میں جھینگروں کی کان کے پردے پھاڑ دینے والی آوازیں سنائی دیتی ہیں میں تجھے کیا بتاؤں مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ اپنا سر پکڑ کر بولا۔

میں اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”پریشان مت ہوا یہ خوابوں سے تمہاری عمر لمبی ہوگی۔“

حسن بے چینی سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کیسے پریشان نہ ہوں آج تمہارے پاس آنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ تمہیں ان دوسووں کا ہتھکڑوں جو ہر وقت میرے دماغ پر سوار رہتے ہیں آج میں ایک

نجومی کے پاس گیا تھا اس نے میرے متعلق بہت سی ایسی باتیں بتائیں جن کو سن کر میں حیران و پریشان رہ گیا۔“

میں حیرت اور دلچسپی کے ساتھ اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس نے مجھے بتایا کہ میرے ہاتھ سے زندگی کی لکیر مٹ چکی ہے اور میں سرجاؤں گا، اس نے مجھے یہ بھی بتایا میرے اوپر ایک خطرناک آسیب کی نظر ہے اور یہ کہ.....“ وہ گھبراہٹ کے عالم میں اپنی بات مکمل نہ کر پامیات جیسے اس کے حلق میں ہی انک گئی تھی میں محل سے بولا۔ ”اور کیا بتایا اس نے؟“

وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ”اور یہ کہ وہ آسیب مجھے مار ڈالے گا۔“ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ خوف سے کانپ اٹھا۔

”اوہ میرے خدایا۔“ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ”ایک تو تم پہلے ہی وہی ہوا اور پھر تجھے لوگ بھی ایسے ملتے ہیں جو تجھے طرح طرح کے دوسووں میں مبتلا کر دیتے ہیں میرا بس چلے تو ایسے لوگوں کا بہت براشر کروں۔“

”اس نے کچھ غلط نہیں کہا فرید وہ بڑھیا وہی آسیب ہے اور وہ مجھے مار ڈالے گی۔“ حسن یوں غلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا جیسے کسی ان دیکھی آفت کو اپنی طرف بڑھتا ہوا محسوس کر رہا ہو۔

”سب بکواس ہے۔“ میں غصے سے چیخ پڑا۔

میرا یقین کرو یہ سب بکواس ہے۔“

حسن نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں خوف اور ہیبت سی تھی۔ ”میں کیا واقعی سرجاؤں کا فرید؟“

”تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا مت مجھے دیکھی کرو ایک باتیں کر کے۔“ میں پریشانی سے بولا۔

مگر اس نے جیسے میری بات کو سنائی نہیں۔ ”میں مرنا نہیں چاہتا پلیز میری مدد کرو۔“ وہ رو دینے والے انداز سے بولا میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا یہ سب نجومی فراڈ ہوتے ہیں

مت یقین کرو ان کی باتوں کا۔“

میری بات سن کر حسن نے مزید کچھ نہ کہا بس چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا پھر واپس چلا گیا۔ حسن کے جانے کے بعد میں رات کافی دیر تک جاگتا رہا پھر جب مجھے نیند آئی تو میں نے خود کو ایک ویران کھلے میدان میں پایا وہاں ہر طرف خاموشی اور ویرانی کا راج تھا دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا رات کا چہرہ تھا اندھیرا میرے چاروں طرف تھا مگر اس کے باوجود میری آنکھیں ہر چیز کو واضح طور پر دیکھ رہی تھیں میں پریشانی کے عالم میں آگے بڑھنے لگا یکدم میری نظر ایک بڑی چادر میں لپٹے ہوئے وجود پر پڑی جو اپنے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس وجود کے پاس پہنچا تو دفعتاً میں ٹھٹک گیا۔ ”آگئے تم۔“ ایک خوف ناک بوڑھی آواز سنائی دی۔

”تت.....“ تم کون ہو؟ میں حیرت سے اس میلی کچی چادر میں لپٹے ہوئے وجود کو دیکھ کر ہلکا یا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا تو میں ایک لمحے کے لئے سٹپٹا کر رہ گیا وہ سترای سال کی بوڑھی عورت تھی سر اٹھاتے ہوئے اس کی چادر سر سے کھسک گئی تھی اس کی زرد آنکھوں اور بے تحاشہ بھریوں زدہ چہرے کو دیکھ کر مجھے جھمبھری سے آگئی اس کے چھوٹے سے سر پر ایک بال بھی نہ تھا۔

”کون ہوتم؟“ میں نے اپنا سوال پھر دہرایا اس کی ہولناک آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”حسن کی موت“

اس کا جواب سن کر میں چونک گیا اسی ساعت مجھے چند غرا نہیں سنائی دیں میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو خوف سے لرز گیا وہی بوڑھی عورت ایک نوجوان کی گردن کو دوپٹے اس کا زرخہ بٹھنھوڑنے میں مصروف تھی اور وہ نوجوان کوئی اور نہیں حسن تھا میں تڑپ اٹھا ”رک جاؤ۔“ میں نے چیختے ہوئے اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ ”کیسا خوف ناک خواب تھا۔“



نیلی کوٹھی

صابر مضان - پنڈو داغ خان

اچانک لڑکی کو اپنی گردن میں یک بیک ہزاروں سوئیاں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں اور پھر اس کی گردن بائیں سمت کو گھومی اور کڑک کی آواز کے ساتھ ہی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی اور فضا دلخراش چیخوں سے.....

لفظ لفظ خوف و دہشت میں مبتلا کرتی خوفناک ڈراؤنی دہشت ناک اور تیراگیز خونی کہانی

کسی لئے بھٹے قافلے کی مانند ہر اسان نظروں سے ارد گرد بکھڑی آگے بڑھ رہی تھی اس کے پیر زخموں سے چور چور تھے۔ سانس بھی اپنے توازن پر نہ تھا۔ ہر قدم آگے کی طرف بڑھانے کیلئے اسے منوں ہمت کرنا پڑ رہی تھی۔ آنکھوں میں نیم مدہوشی لئے ارد گرد ڈوبتی ہوئی وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی وہ چاند کو شرمادینے کی حد تک حسین تھی مگر اب اس کے چہرے

صبح کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ہری ہری گاس پر جمی اوس بہت خوشگوار تارو دے رہی تھی۔ فضا میں عجیب طرح کی دلکش تھی سرسوں کے پھولوں سے لکرا ہوا اپنے ساتھ لائی پھولوں کی خوشبو ہر سو بکھیر رہی تھی۔ مٹی کے کچے مکانوں سے بکریوں کے ریوڑ کے ریوڑ نکل کر چراگاہ کی جانب گامزن تھے۔

کیا ہو رہا ہے۔“ میں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے روتے ہوئے بولا۔ ”تم نے خود کشی کیوں کی؟“ وہ تکلیف دہ لہجے میں بولا۔ میں نے خود کشی نہیں اس رات میرا دل گھبرا رہا تھا میں چھت پر تازہ ہوا میں گیا جب میں چھت سے نیچے دیکھ رہا تھا تب مجھے لگا کسی نے اچانک مجھے اٹھا کر نیچے کی طرف دھکا دے دیا اور..... جب میرا جسم زمین سے ٹکرایا تو تب میں نے بڑی مشکل سے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو مجھے ایک ہیولا سا وہاں کھڑا دکھائی دیا پھر وہ غائب ہو گیا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔“

میں نے کال اٹینڈ کی تو دوسری طرف محسن کے بھائی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”فردی بہت برا ہوا ہے محسن نے خود کشی کی کوشش کی ہے۔“

”کیا۔“ میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ”مگر کیوں..... اب آپ کہاں ہیں؟“ محسن کا بھائی تیزی سے بولا۔ ”ہسپتال میں ہیں ہم سب تم بس جلدی سے یہاں پہنچو ہسپتال کا نام نوٹ کرو۔“ ہسپتال کا نام سنتے ہی میں فوراً ہسپتال پہنچا میری گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ میں جس چلیے میں سو کر اٹھا تھا اسی میں ہسپتال چلا آیا تھا محسن کے تقریباً سب ہی گھر والے اس وقت وہاں موجود تھے اور پریشانی کے عالم میں خدا سے محسن کی زندگی کی دعا مانگ رہے تھے محسن کی حالت کافی سربس تھی اس نے اپنے تین منزلہ مکان سے کوڑ کر خود کشی کرنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں اس کے سر پر شدید چوٹیں آئیں تھیں اور بتایا جا رہا تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر بہت گہری اور خطرناک چوٹ آئی تھی ڈاکٹر ز محسن کو بچانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے مگر ساتھ ڈاکٹر نے یہ بھی خدشہ ظاہر کیا تھا۔ ”اگر محسن بچ گیا

پھر بھی ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ کی وجہ سے وہ معذور ہو سکتا ہے۔“ یہ خبر انتہائی افسوس ناک تھی۔ مگر ابھی ہم سب تمام انڈیشیوں سے بالاتر ہو کر محسن کے بچ جانے کی دعا مانگ رہے تھے۔ شام تک محسن کو کچھ ہوش آیا ہوش میں آتے ہی اس نے مجھے اپنے پاس بلایا محسن کا سارا سر بیٹوں سے لپٹا ہوا تھا اور اس کا رنگ نیلا پڑ گیا تھا میں اس کی حالت دیکھ کر رو پڑا۔

وہ بامشکل بولا۔ ”تم نے دیکھ لیا میرے ساتھ



پرویرانی اور ایسا و محرومی کا راج تھا وہ اپنے حواس سے بیگانہ آگے بڑھی کے دفعتاً اسے راہ میں پڑے ایک بڑے سے پتھر کی ٹھوکری اور وہ چکرا کر وہیں گر گئی۔ جانے لتی ہی دلیر وہ بے سہدہ پڑی رہی۔

کافی دیر بعد اس کے پاس سے ایک گڈریا اپنی بکریوں کو چراتا ہوا وہاں سے گزرا تو اس کی نظر اس اول جلول حلیئے والی زخمی لڑکی پر پڑی جس کے رستے زخموں پر اب بھوری چوٹیاں جمع ہو رہی تھیں۔ اس کی سانس بری طرح سے لڑکھڑاہٹ کا شکار تھی جیسے اس کا آخری وقت قریب آن پہنچا ہو۔ گڈریا ایک پل کے لئے جھکا اور اس کے زندہ ہونے کا یقین کر کے، اپنے کندھے سے لگی چھانگل اتاری اور اس میں سے پانی کے لڑکی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ لڑکی کی ٹوٹی سانسوں کا سلسلہ جیسے ایک دم جڑنے لگا اور اس نے دھیرے سے اپنی نیم بے جان آنکھیں کھول دیں۔ وہ کوڑا کرکٹ کے ایک بڑے سے ڈھیر پر پڑی تھی۔ ساتھ ہی ایک بڑا سا پتھر پڑا تھا جو غالباً اس کی ٹھوکرنے کا موجب بنا تھا۔ لوگوں کے چھینٹے گئے سبزیوں اور پھلوں کے گلے سڑے چٹکے اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے اور آوارہ کتے ان پر منہ مارتے پھرتے تھے۔

وہ چاروں طرف سے بندوبستی تیز سڑاٹھ میں بسی ہوئی تھی کچھ لاپرواہ لوگ صبح کے پہلے سرمئی اندھیرے میں، کوڑے کے ڈھیر پر پڑے اس انسانی وجود سے بالکل بے خبر اپنی کوڑے کرکٹ کی ٹوکریاں اس پرالت کر چلے گئے تھے جس کی وجہ سے اس کی آدھی ٹانگیں کوڑے کرکٹ کی غلاظت میں مکمل طور پر ڈھکی ہوئی تھیں۔

”کون ہوتا؟ تمہارا نام کیا ہے؟“ کچھ کے ڈھیر میں دھنسی لڑکی کے وجود سے اشتی ناقابل برداشت بدبو سے تنگ آ کر گڈریا اب ناک پر ہاتھ رکھے اس سے پوچھ رہا تھا۔

لڑکی نے اپنی نیم بے جان آنکھیں کھولیں تو اس کے چہرے پر بے رحمی نکھیاں ایک دم سے اڑ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں ویرانیت اور اجڑے پن کی

وہ ہزار داستان رقم تھی، جسے گاؤں کا یہ معصوم گڈریا پڑھنے سے قاصر تھا۔

☆.....☆.....☆

”ارے دیکھو یہ حیاء کا موڈ کیوں آف لگ رہا ہے؟“ ملالہ نے اپنے بالوں سے روٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ”ہیشہ کی طرح چھوٹی سی بات پر منہ بنا رکھا ہے، خیر چھوڑو! اب وہ سونے چلی گئی ہے صبح ہونے تک خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“ افتی نے قبل سر تک تانتے ہوئے کہا اور کروٹ بدل کر سو گئی۔

اگلی صبح وہ دونوں سوکر اٹھیں تو حیران پریشان ایک دوسرے کو کتنی رہ گئیں۔ ان کے وہم و گمان تک میں یہ بات نہ تھی کہ حیاء ہاسٹل چھوڑ کر جا چکی تھی۔ اور اب یہ بات ان کے ہوش اڑ دینے کے لئے کافی تھی کہ حیاء گھر نہیں لوٹی تھی۔ ”وہ آخر گئی تو کہاں گئی؟ کیسی حالت میں ہوگی؟“

ملالہ اور افتی نظروں نظروں میں ایک دوسرے کو قصور وار ٹھہرا رہی تھیں ”میرے خیال میں ہم ایک دوسرے کو مجرم کر دانا بند کر دیں ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔“ افتی نے خاموشی کا سکوت توڑا تھا۔

”ہمارا قصور بلکہ ہمارا قطعی قصور نہیں ہو سکتا۔“ ملالہ بے خود ہو کر ہنسنے کی مگر افتی کے گھورنے پر اچانک ہی بوجید ہو کر بولی۔ ”ہمارا فالٹ ہو بھی نہیں سکتا بس ایک رانگ نمبر سے ہی تو دوستی کرنے کا کہا تھا اسے..... اب یہ ایسی کون سی بڑی بات ہے کہ وہ ہاسٹل چھوڑ کر ہی چلتی بنے۔ جانی ہے تو جائے۔ اسے روکتی ہے میری جوتی۔“ ملالہ نے پیر میں اڑی ہوئی پرانی چپل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو کثرت استعمال کی وجہ سے گھس گھس کر اپنی اصل رنگت کھو چکی تھی۔

حیاء کا ارادہ یہاں سے واپس گھر جانے کا تھا۔ مگر اس کے گاؤں جانے والی بس چھوٹ چکی تھی اور دوسری بس کے آنے میں ابھی کافی تاخیر تھا وہ اسٹاپ پر موجود بیٹھ کر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی اور ہاتھ میں پکڑے سم سے عاری موبائل کو بے بسی سے دیکھنے لگی۔ ملالہ

اور افتی نے جس شخص کو اس کا نمبر دیا تھا وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا تقریباً ہزاروں کی تعداد میں ایس ایم ایس اور پھر ڈھیر ساری کالز..... یہ الگ بات تھی کہ وہ کال ریسیو نہیں کرتی تھی موبائل چوبیس بجھنے آف بھی نہیں کیا جا سکتا تھا گاؤں پہنچنے پر اس بات کا خاصا ایویشن ہو سکتا تھا لہذا اس نے سم نکال کر ضائع کی اور پھر ایک گندے نالے میں پھینک دی۔

وہ دل ہی دل میں بس کے جلدی آنے کی دعائیں کر رہی تھی کہ اچانک ہی اس نے کچھ بے ربطی آوازیں سنی شام کے سرمئی اندھیرے آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے پرندے آشیانوں کی جانب رواں دواں تھے جس کی وجہ سے آسمان پر خاصی رونق لگ رہی تھی اس نے بے ربط آوازوں کی سمت میں گردن اٹھا کر دیکھا تو کانپ کر رہ گئی وہ کوئی دوشربا تھے جو نشے میں دھت لڑکھڑائے قدموں سے اسی کی طرف آرہے تھے۔

”آئے او..... یہ لڑکا یہاں کیا کر رہا ہے؟“ ایک شرابی نے اپنی ڈولتی گردن کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا۔

”رورہا ہو گا بے چارہ..... مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں اسے چاند پر پلاٹ دلا دوں۔ میں نے انکار کر دیا..... چاند پر پلاٹ تو میں نے امریکہ کو نہیں بیچا..... حالانکہ وہ اور روس میری بڑی مٹیں کرتے ہیں..... پھر یہ لڑکا کیا چیز ہے؟“

”ارے نہیں..... دیکھ بیچارا اکیلا بیٹھا ہے..... اداس بھی لگ رہا ہے..... تو یوں کر، جو میرا پلاٹ ہے ناں چاند پر..... وہ اس کو دے دے..... میں سورج پہ کوئی زمین خرید لوں گا۔“

نشے میں دھت ڈرگاتے ہوئے شرابی اب اس کی طرف تیز تیز بڑھ رہے تھے۔ تیز چلنے کی کوشش میں وہ بار بار گر رہے تھے۔

وہ پھرتی سے اٹھی اپنی چادر سنبھالی اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی ہوش مند انسان، ایک نشی کے مقابلے میں زیادہ تیز بھاگ سکتا ہے۔ لہذا وہ جلدی ان

دونوں سے آگے نکل گئی اب وہ اپنے پیچھے معدوم ہوتی آوازیں سن رہی تھی۔

”وہ تو بھاگ گیا..... چل، ہم واپس چلتے ہیں۔“ مگر وہ ایسی ڈری تھی کہ اپنے قدم روکے نہیں، اور بھاگتی رہی، شام اب رات میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اسے راستوں کی سمت کا یقین نہ تھا بس اندھا دھند بھاگتی جا رہی تھی۔

اچانک سے اسے روشنی کے ننھے ننھے بلبس نظر آنے لگے تھے وہ ہمت کر کے ان کی جانب بڑھتی گئی بالآخر وہ روشنیوں کے اس مسکن تک پہنچی ہی گئی۔

وہ ایک بہت بڑی عمارت تھی جس کا نقشہ اہرام مصر کی طرز پر بنایا گیا تھا کونوی ساز کی یہ عمارت روشنیوں میں نہانی ہوئی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ کہ اس عمارت پر گہرے نیلے رنگ کا پینٹ کیا گیا تھا۔ سفید دودھیا روشنیوں میں نہانی ہوئی نیلے کالچ جیسی عمارت..... بہت پر وقار منظر پیش کر رہی تھی۔ اس عمارت کے مین گیٹ کے آگے کھڑی ہوئی وہ ایک حقیر سا کیڑا لگ رہی تھی ابھی وہ اندر داخل ہونے پر غور ہی کر رہی تھی کہ ایک کان پھاڑ دینے والی چرچاہٹ کے ساتھ رنگ آلود گیٹ کھلنا شروع ہو گیا۔

اچانک کئی بھیڑیوں کی منخوس آوازوں نے فضاء میں خوف کا رس گھولنا شروع کر دیا۔

وہ گیٹ کے عین سامنے کھڑی تھی اور گیٹ بالا خرہ کھل گیا عمارت کا اندرونی منظر اور زیادہ سحر انگیز تھا اندر ایک بہت بڑا والو کے ساز کا فورہ نصب تھا جس کے چوچ اور آنکھوں سے پانی کی موٹی موٹی دھاریں نکل رہی تھیں۔ عمارت میں کسی ذی روح کا وجود تک نہ تھا وہ دے قدموں راہدار یوں سے ہوئی ہوئی آخر کار عمارت کے اندرونی حصوں تک آگئی۔ جہاں کروں کی لمبی قطاریں تھیں تمام کرے ویل فریڈ تھے زندگی کی تمام تر آسائشات ان کروں میں موجود تھیں دیز قالینوں پر اس کے پیر دھتے جارہے تھے اتنے خوبصورت گھر کے کلین آخر کہاں تھے؟

چنگھاڑ ماری تھی۔

☆.....☆.....☆

”کیا.....؟ بارش تیز ہوگئی ہے؟ تم فوراً کسی چیز کی اوٹ میں ہو جاؤ۔ اگر تمہیں فیور ہو گیا تو ہمارے کنسرٹ کا تو ستیاناس ہو جائے گا۔“ مشہور پاپ سٹار ذوالقرنین اپنے میوزیکل گروپ کی ساتھی ”آیوٹی“ سے بات کر رہا تھا۔

”ایک منٹ رکو آیوٹی! مجھے دور کہیں سے کوئی مکان سا نظر آرہا ہے شاید مجھے وہاں کوئی پناہ مل سکے۔“ ذوالقرنین نے فون بند کیا اور چھتری سنبھالتا ہوا مکان کی سمت بھاگنے لگا۔ بارش بھی آج خوب جی بھر کر برس رہی تھی۔

مکان تک پہنچتے پہنچتے بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اور مکان کے اندر داخل ہونے تک بارش بالکل ہی ختم ہو چکی تھی۔ تاہم ہر چیز ابھی بھی گیلی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کا ہر اچانک پھسلا اور وہ اوندھے منہ زمین پر جا گرا۔ لان کی گیلی ٹی نے اس کے کپڑوں کا حشر نشر کر دیا تھا اس کے گلے میں موجود سونے کی چین میں بھی کچھڑ میں لٹ پت ہوگئی تھی۔ یہ چین انتہائی مہنگی تھی سونے کی زنجیر میں ہیروں سے بنا ہوا چھوٹا سا گٹار لٹک رہا تھا۔

ذوالقرنین نے بے بسی سے اپنی لاکھوں کی مالیت چین کو کپڑوں میں لٹ پت دیکھا اور اسے صاف کرنے کی غرض سے پانی کی تلاش میں ارد گرد نگاہ دوڑائی وہ ایک نیکون عمارت تھی۔ جس پر گہرے نیلے رنگ سے روغن کیا گیا تھا اس کے وسط میں ایک بہت بڑے الو کا مجسمہ فوارے کے طور پر نصب کیا گیا تھا جس کی آنکھوں اور منہ سے پانی کی موٹی موٹی دھاراں نکل رہی تھیں۔

ذوالقرنین اٹھ کر تیزی سے اس جانب آیا اور اپنی چین فوارے کے پانی سے دھوئے لگا اچان چین اس کے ہاتھوں سے پھسل کر فوارے کے پانی میں غائب ہوگئی وہ بالگوں کی طرح پانی میں ہاتھ مارنے لگا۔ اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ فوارے کی زمین اس کے ہاتھوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے اس کے

جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی مگر اب پھر گھٹا ٹوپ اندھیرا سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ وہ سست کے اندازے لگاتی ہوئی کمرے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئی گئی۔ باہر بھی ہولناک اندھیرا اس کا منظر تھا۔ ڈر کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ پالوں کی آواز کا دوبارہ ظہور پذیر ہونا اس پر مزید افتادہ کر رہا تھا۔

اب وہ آواز اس کے قریب تر ہوتی جا رہی تھی گھبرا کر اس نے ریڈنگ پر ہاتھ رکھا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اوپر کی سیڑھیاں چڑھنے لگی کیونکہ چھن چھن کی آواز نیچے کی جانب سے آرہی تھی۔ اس کے میڑھیوں پر قدم رکھتے ہی آواز آنا بھی بند ہوگئی تھی میڑھیاں ختم ہوتے ہی اس نے اس عمارت کی دوسری منزل پر قدم رکھا اور وہیں بیٹھ کر، سر جھکا کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ کسی سرسراہٹ کی آواز پر اس نے جونہی اوپر سر اٹھا کر دیکھا تو اس کی روح فنا ہوگئی وہی پراسرار لڑکی اس کے اوپر بھگی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ حیاہ فوراً ہی کھڑی ہوئی اور پیچھے ہٹی۔

”کیو آئی ہے تو یہاں؟“ لڑکی غصے سے دھاڑی حیرت انگیز طور پر اس کے صرف ہونٹ مل رہے تھے چہرے کے تمام عضلات بالکل ساکت تھے۔ ”مم..... میں..... میں یہاں۔“ حیاہ کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ اس کا حلق بالکل خشک ہو گیا تھا وہ اٹل قدموں چلتے لگی کہ اچانک ہی اسے اپنی گردن پر کسی شے کا احساس ہوا وہ کوئی غیر انسانی پنجہ تھا..... سیاہ گتھے بالوں سے بھرا ہوا..... دیکھتے ہی دیکھتے اس غیر مرئی پنچے کی گرفت حیاہ کی گردن پر سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔

حیاہ کی آنکھیں باہر کو اٹلنے لگی تھی پراسرار لڑکی بے تاثر چہرہ لئے، زندگی کی آخری سانسیں لیتی حیاہ کو تنگے جا رہی تھی عین اسی لمحے گہرے سیاہ بادل چاند پر چھا گئے اور چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا بھیڑیوں نے نیند کی وادی میں جانے سے قبل آخری بار اپنی نخوس

وہ ابھی اسی شش و پنج میں تھی کہ لائٹ ایکدم آف ہوگئی اور پوری عمارت اندھیرے میں ڈوب گئی چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ اس نے اچانک باہر نکلنے کی کوشش کی تو اندھیرے کی وجہ سے کارز میں رکھے گلدان سے ٹکرائی گئی گلدان اس کے سر سے اس زور کا ٹکرایا کہ اسے اپنے چاروں طرف تارے سے نظر آنے لگے۔ بالوں سے بہتی ہوئی نمی سے احساس ہو رہا تھا کہ چوٹ گہری ہونے کی وجہ سے خون بھی بہہ رہا ہے۔ اور پھر گھٹا ٹوپ اندھیرے کی وجہ سے اسے کمرے سے باہر نکلنے کا رستہ بھی نہیں مل رہا تھا خوف کی وجہ سے اس کے سانس دھنکی کی طرح چلنے لگی۔

کانی دیر بعد چاند اپنے پورے جون پر تھا کھڑکی سے چاندنی چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ باہر چلنے والی ہلکی ہوا سے مغلوب ہو کر کھڑکی پر لگے سفید باریک پردے ادھر ادھر لہرا رہے تھے ہمت کر کے وہ کھڑکی ہوئی اور کھڑکی تک آئی چاند کی چاندنی میں باہر کا ماحول بہت پراسرار لگ رہا تھا۔ وہ کھڑکی کی طرف پشت کر کے کھڑکی ہوئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

محالے چھن چھن کی آواز آنے لگی۔ وہ بہت بھاری آواز تھی۔ جیسے کسی نے بہت بڑے بڑے اور بھاری گھٹکھ دبانہ رکھے ہو۔ ابھی وہ اسی بات پر غور کر رہی تھی کہ اسے اپنے پیچھے کھڑکی کے دوسری طرف کسی اور وجود کا احساس ہوا۔ اس نے اپنا رخ کھڑکی کی طرف پھیرا تو جیسے اس کی آنکھیں پتھر اگئی وہ کوئی فریبی مائل لڑکی تھی جس نے اپنے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی لمبی تھی وہ میکانی انداز میں کھڑکی سے ہوتی ہوئی گزر رہی تھی چلتے ہوئے جونہی اس کا شالہ کھڑکی کے شیشے سے مس ہوا تو شیشے میں وہیں باریک سی دراڑ پڑ گئی جیسے وہ اس لڑکی کے وجود کا احساس سمجھ نہ سکا ہو۔ وہ لڑکی حیاہ کی موجودگی سے یکسر لاعلم تھی۔ حیاہ کے تو جیسے کاٹو بدن میں ابوبئیں..... وہ

ڈرڈا انجسٹ کا مشہور و معروف سلسلہ

نمبر 5 اور 6

رولوکا

پراسرار قوتوں کا مالک

مکمل اور طویل ترین داستان حیرت کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

قسط نمبر 47 سے قسط نمبر 58 تک

قسط نمبر 59 سے قسط نمبر 70 تک

تحریر: اے وحید قیمت فی کتاب = 150

نادیدہ قوتوں کی زور آزمائی، کالی دنیا کی بدروحوں کی شرانگیزی، جنات کی دیدہ دلیریاں، بخونی آتماؤں کی تھیر انگیز اور حیرت انگیز ناقابل فراموش ہاتھ پائی اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے خونچکاں بھونچکاں معرکہ جیسے پڑھ کر پڑھنے والے مہبوت اور انگشت بدنداں رہ جائیں گے اور طویل ترین عرصہ تک یہ تمام کہانیاں ذہن کے پردے پر جھلماٹائی رہیں گی۔

ڈرڈا انجسٹ

کتاب مارکیٹ لیو اردو بازار اکرچی

Ph: 32744391

ساتھ ہی کسی کھلونے کی طرح اس کی ٹانگیں اوپر فضاء میں معلق ہو گئیں اور پل بھر میں چھ فٹ کا یہ انسان فوارے کی عامی گہرائی والے پانی میں غرق ہو گیا تھا۔ فضاء میں پہلے جیسا سکون چھا گیا تھا۔ البتہ الو کے مجسے کے منہ اور آنکھوں سے پانی کی موٹی دھاروں کی بجائے اب تازہ تازہ گاڑھا خون باریک دھاروں میں نکل رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

تارکول کی سڑک پر دو رنگ بھیکے مسلے ہوئے پتے بکھرے پڑے تھے۔ اس کے قدم ٹھنڈی نم سڑک پر جیسے پڑنے لگے تھے ایک بوڑھی راہزور عورت گدھا گاڑی پہ گھاس کے گھڑ رکھے گدھے کو ہانپتی آرہی تھی کھیتوں کے کنارے ویران پڑے سفید پھولوں کے جھنڈ تھے آسمان پر گھنے بادل منڈلا رہے تھے۔ سنبل کے درختوں کا طویل سلسلہ آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا بیگی ہوا کی شرارت سے سنبل کے لائے درخت ذرا سا جھکتے تو روٹی کے سفید گالوں سے فضاء بھر جاتی۔

گر مارگم کافی کاگ باتھ میں پکڑے وہ کوئی باررڈا بجسٹ پڑھنے میں مگن تھی۔ لان میں ہر سو چاندی چمکی تھی سب روٹی سے چلتی ٹھنڈی ہوا سے گل بوٹے سرشاری بھرے انداز میں جھومتے گویا وحدہ لاشریک کی حمد و ثناء میں مصروف تھے دور کہیں سے لاؤڈ اسپیکر میں پڑھائی جانے والی تراویح میں کی جانے والی قرأت کی خوش الحان آواز ایک تواتر سے سماعتوں میں تقدس بھرا سر گھول رہی تھی

”بی بی جی! کھانا لگا دیا ہے۔“ ان کی خاندانی ملازمہ ”رضیہ“ نے آکر بتایا اور واپس پلٹنے ہی لگی تھی کہ اسے رکنا پڑا۔

”جی افق بی بی!“ رضیہ اب اپنے ہاتھ، میلے دوپٹے سے پونچھ رہی تھی۔

”تم نے کبھی کوئی ایسا گھر دیکھا ہے؟ جہاں بھوتوں کا بئیرا ہوا اور وہاں آنے والے ہر بندے کو مار دیتے ہوں۔“ افق اب ڈائجسٹ بند کر کے رضیہ

سے پوچھ رہی تھی۔

”فضول باتیں ہوتی ہیں یہ ساری، کسی اور کے سامنے مت کہنا ورنہ لوگ تمہیں خطبی سمجھنے لگیں گے۔“ رضیہ کی بجائے افق کی بڑی بہن ماہین نے جواب دیا اور اٹھ کر اندر کی طرف چل دی یہ دیکھتے ہوئے افق نے بھی ڈائجسٹ میز پر رکھا اور ماہین کے پیچھے چل پڑی۔

”میں نے ایسا گھر دیکھا ہے بی بی جی۔“ رضیہ کی آواز پر افق کے چلتے قدم رک گئے

”اوہ ریٹلی.....؟ مجھے لے چلو گی وہاں؟“ افق نے اشتیاق سے کہا۔ جس پر رضیہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

عید الفطر سے فارغ ہو کر افق اب رضیہ کے آبائی گاؤں میں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے رنگ میں قدیم طرز کی ٹکنوئی عمارت تھی۔ جو نیلے رنگ سے مکمل طور پر ڈھکی ہوئی تھی۔ ”یہ تو اہرام مصر کی طرز کا کوئی شاہکار لگ رہا ہے۔“ افق نے عمارت کی خوبصورتی کو سراہا۔ ”جی! یہ ہمارے گاؤں کے وڈیرے چوہدری گھڑا خان کی کوٹھی ہے۔ انہوں نے بڑے چاؤ سے یہ کوٹھی بنوائی تھی نیلا رنگ ان کی لاڈلی بیگم ”زرقا“ کا پسندیدہ رنگ ہوا کرتا تھا اسی لئے انہوں نے اس کوٹھی پر بھی نیلا رنگ کروایا تھا۔ اس کے فرشوں پر تمام قالین نیلے رنگ کے ہی بچھائے گئے تھے فرنیچر بھی نیلے رنگ کا تھا غرض کہ اس کوٹھی کی ہر چیز کو نیلے رنگ میں نہلا دیا گیا تھا سوائے پردوں کے..... پردے وڈیرا سائیں نے اپنی پسند کے رکھوائے تھے۔

تیز ہوا چلنے کے سبب جب سفید پردے نیلے فرنیچر اور نیلی دیواروں والے کمروں پر لہراتے تو یہ منظر بہت خوف ناک سا لگتا مگر افسوس..... کہ خوابوں کا یہ محل وڈیرا سائیں اور ان کی بیگم کو نصیب نہ ہو سکا اور وہ دونوں اس سپنوں کے محل کے کبھی باسی نہ بن سکے۔ رضیہ سانس لینے لگورکی۔

”کیوں.....؟ آخر کیا ہوا تھا؟“ افق نے استفسار کیا۔

”وہ ایک روشن دن تھا زرقا بڑے چاؤ سے شیشے کے سامنے کھڑی تیار ہو رہی تھی۔ اس نے نیلے خفیون کی بھڑکیلی ساڑھی پہن رکھی تھی جس پر سلور رنگ کا جڑاؤ کیا گیا تھا۔ سلور رنگ کے بڑے بڑے ستارے نقشی دہکی اور سلور گونے کناری کا کام، اس گہری نیلی ساڑھی کو ایک جلا بخش رہا تھا۔ سیاہ گھوڑا نکھیں اور شکرنی لہا، دبا پتلا نازک سراپا اور صبیح ملکوتی نقوش سے سجا چہرہ۔ وہ اتنی خوبصورت تھی، جتنی اس دنیا کی کوئی بھی لڑکی ہونا چاہتی تھی۔ اس کی جلد اتنی شفاف اور بے داغ تھی کہ لگتا تھا دو دھیا موم سے اس کا سانچا ڈھالا گیا تھا۔ ذرا سا بھی کسی نے چھوا تو مٹی ہو جائے۔

ایک پل کیلئے بھی جو سارکت ہو کر بیٹھتی تو اس پر کسی مصور کی حسین تصویر کا گمان ہونے لگتا۔ اس دنیا میں دلکش چہروں کی کمی نہیں ہے مگر اس میں بلاشبہ کچھ ایسا ضرور تھا جو الگ تھا..... اور ضرور تھا۔

وہ..... اور وڈیرا سائیں، خواہوں کے اس نیلے محل میں رہائش کی پہلی رات ہی مردہ پائے گئے تھے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے بے جان زرد جسموں کے پیچھے کیا ہوا تھا؟ اب تو بس سب لوگ اتنا ہی جانتے ہیں کہ جو کوئی بھی اس نیلی کوٹھی میں جاتا دیکھا گیا۔ دوبارہ وہ اس دنیا میں نظر نہیں آیا۔ ”رضیہ نے سر جھکا لیا۔“

”ان بلیو سائیں.....“ افق ناقابل یقین انداز میں بولی۔

”زرقا بیگم کو نیلے رنگ سے عشق تھا..... جنون تھا..... وہ ہر وقت نیلے رنگ کو کسی نہ کسی صورت میں پاس رکھتی تھیں۔ کبھی نیلی انگوشی نیلے ننگن، نیلے کپڑے، نیلے پتھر کی چوڑیاں، حتیٰ کہ نیلے جوتے بھی انہیں دیوالگی کی حد تک نیلے رنگ سے عشق تھا۔ گاؤں کے کچھ لوگ تو یوں بھی کہتے تھے کہ ”زرقا جیسی حسین مورت بنی ہی نیلے رنگ کیلئے ہے۔“ انہوں نے اپنی وصیت میں کہہ رکھا تھا ”مرنے کے بعد اسے کفن بھی نیلے رنگ کا دیا جائے اور اس کی قبر پر نیلے ماربل کے پتھر لگائے جائیں۔“

میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی میت کو نیلے

رنگ کے کفن میں دیکھا تھا۔ خوبصورتی میں چاند کے مقابلے پر اتر آنے والی زرقا، اس وقت نیلے رنگ کے کفن میں بہت عجیب لگ رہی تھی۔ اسے ایسی بھونڈی وصیت نہیں کرنی چاہیے تھی جس کی اس نے سزا بھی پائی۔ ”رضیہ کو افق کی آواز پر اچانک چپ ہونا پڑا۔“

”کیسی سزا؟ کیا مرنے کے بعد زرقا کے ساتھ کچھ ہوا تھا؟“ افق کو لگ رہا تھا کہ رضیہ من گھڑت کہانی سنارہی ہے۔

”وڈیرا سائیں کو دفنانے کے بعد جب لوگ زرقا بیگم کی میت کو قبر کی طرف لے جا رہے تھے کہ نہ جانے کہاں سے بھیڑیوں کی خونخوار فوج نمودار ہو گئی۔ چونکہ قبرستان گاؤں سے کچھ فاصلے پر ہے اس لئے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بھیڑیے جنگل کی طرف سے آئے ہوں گے بھیڑیوں کی اچانک افتاد سے گھبرا کر لوگوں نے زرقا بیگم کی میت کو وہیں چھوڑا اور اگلے قدموں بھاگ نکلے۔

اگلی صبح اس جگہ لوگوں نے دیکھا تو میت کی ہڈیاں تک غائب تھیں بس کفن کی نیلی چادروں کے حصے اس جگہ بکھرے پڑے تھے۔ لوگوں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور توبہ توبہ کرنے لگے۔ وہ عذاب خداوندی تھا۔“ رضیہ دور خلاؤں میں گھورتی ہوئی بولی۔

”نہیں..... وہ عذاب خداوندی نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے کفن کے لئے سفید کپڑا ہونا کوئی شرط تو نہیں..... لوگ تو اپنے مردوں کیلئے یہ رنگ محض اس لئے چنتے ہیں کہ ”سفید“ پاکیزہ رنگ ہے۔ ورنہ کفن کیلئے کپڑے کا سفید ہونا کوئی شرط تو نہیں ہے۔“ افق کو رضیہ کی سنائی گئی کہانی پر ذرا برابر بھی یقین نہیں آیا تھا۔

”اگر آپ کو لگتا ہے کہ کفن کے لئے کپڑے کا سفید ہونا شرط نہیں ہے تو آپ بھی اپنے لئے نیلا کفن سلوا لیجئے گا۔ ورنہ میرے خیال میں تو پروردگار کے سامنے جانے کے لئے پاکیزہ ترین رنگ سفید کا ہی انتخاب کرنا چاہئے۔“ رضیہ نے سر دلچے میں

کہا اور واپس لوٹ گئی۔

”تم..... دو ٹکے کی نوکرانی..... تجھے تو میں چھوڑ دینی نہیں..... بڑی آئی کیٹ ملڈن کی ہم شکل.....“

”افق مارے غصے کے بے قابو ہوئے جاری تھی۔ اور جو منہ میں آیا بول رہی تھی جبکہ رضیہ اس کی باتوں سے بے نیاز دور نکل گئی تھی۔

جنون خیر بے رحم تلاطم لہریں جب سمندر کے سینے پر اوجھم مچانی شور برپا کرتی ادھر سے ادھر بھاگتی پھرتی ہیں تو یوں لگتا ہے، کوئی ان کے طوفانی تیوروں پر بند نہیں باندھ سکا..... کسی انہونی کا پیش خیمہ بنی سرسراہٹ ہو انیس اور خوفناک جواد بھانا، پچھاڑیں کھاتے سمندر کو ہیبت ناک بنا دیتا ہے۔ پھرے ہوئے پانی کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے جیسے دنیا پر پ کر جائے گا مگر کچھ دیر بعد اس طوفان کا نام و نشان تک نہیں ہوتا اور سمندر کی مفتوح کی طرح چپ چاپ قصور وار نظر آنے لگتا ہے۔ تجسس اور خوف کا ایک ایسا ہی طوفان افق کے دل میں اٹھا اور اس نے نیلے رنگ کی اس کوٹھی میں جانے کی ٹھان لی۔

اس نے وکٹوریہ بیگم فیشن لائن کا وہ ٹاپ پہنا تھا جو اس کی وارڈروب میں سب سے زیادہ مہنگا تھا اور شان دار بھی..... ٹاپ شوئرز لیس تھا شوئرز کو کر کرنے کے لئے اس نے ٹاپ کی ہم رنگ سفید آدھی آستینوں والی جیکٹ پہنی۔ وائٹ ٹاپ کے اوپری حصے پر گولڈن نگینوں کا ستاروں جیسا چھڑکاؤ تھا اور یہی اس ٹاپ کی دلکشی تھی وہ ایک بہترین مغربی لباس تھا جو گھٹنوں تک تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سفید ٹائٹس پہنا۔ ہائی ہیل اور گلے میں قیمتی نیگلے..... یہ ڈریس اسے اس کی کزن انوری نے برطانیہ سے بھجوا یا تھا۔

نیلے کوٹھی میں جانے کے لئے وہ بالکل کسی پارٹی کی طرح تیار ہوئی تھی کچھ ہی دیر میں وہ اپنی مطلوبہ جگہ تھی گیٹ ہلکا سا زور لگانے پر کھلتا چلا گیا۔ اندر ہو کا عالم طاری تھا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھتی گئی الو کی ساخت پر بنے فوارے سے نکلتا پانی بہت دلکش لگ رہا تھا۔ اس کوٹھی کے حسن کو دیکھ کر وہ حیران ہوئے

جاری تھی رضیہ کی بتائی گئی سب باتیں سچ معلوم ہو رہی تھیں۔ اندر ہر چیز نے نیلے رنگ کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اتنے بیش قیمت ڈریس میں چلتی ہوئی وہ کوئی شہزادی لگ رہی تھی۔ دفعتاً اسے اپنے کندھوں پر بہت سارا بوجھ محسوس ہوا جیسے کسی نے ٹٹوں کے حساب سے اس پر بوجھ لاد دیا ہو بوجھ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ وہ وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ اس کے بعد بھی بوجھ کم ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ سفید ٹاپ میں لمبوں، گولڈن بال کمر پر بکھرائے اس وقت وہ دنیا کی حسین ترین لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

بوجھ کی شدت میں مزید اضافہ ہوا اور اس کے منہ سے کراہ سی نکلی یہ مشکل اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا تو اسے آسمان گھومتا ہوا محسوس ہوا اس کے کندھے پر ایک چھپیں ستائیس سالہ لڑکی بیٹھی تھی۔ اس لڑکی کی ٹانگیں لنگ کرافٹ کے سینے پر آ رہی تھیں افق کے منہ سے جیجی سی نکلی۔ اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہوئی وہ بھیانک لڑکی آنا فنا غائب ہو گئی۔ سارا بوجھ بھی یک لخت ہٹ گیا تھا۔

افق ایک بہادر لڑکی تھی۔ اس کی یہی عادت اسے یہاں تک لائی تھی اس نے خوف زدہ ہونے کی بجائے وہاں سے بھاگنے کی ٹھانی۔ وہ فوراً وہاں سے اٹھی اور سر ہٹ دوڑ لگا دی۔ ابھی وہ دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ چھت سے لکڑی کا ایک بہت بڑا شہیر اس پر آگرا، مگر وہ خوش قسمت تھی کہ بچ نکلی۔ اور شہیر محض اس کی کمر کی جلد کو چھیلے ہوئے نکل گیا تھا۔ وہ سانسوں سانس تھی کمر پر شدید جلن کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس نے اپنے قدم آگے بڑھائے اور کمرے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

اب وہ ایک تنگ سی راہداری میں تھی۔ دروازے میں لگی کیلوں کی وجہ سے اس کا قیمتی سفید ٹاپ اب چھتروں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ چہرے پر بھی جگہ جگہ خراشیں تھیں اب وہ کوٹھی کے بیرونی حصے میں آ گئی تھی جہاں اسے، اس کی پرانی کلاس فیلو ”حیاء“ نظر آئی۔ وہ بھاگ کر گئی اور حیاء سے لپٹ گئی۔

”حیاء تم یہاں کیسے؟ ہمیں یہاں سے فوراً نکلتا ہو گیا۔“ وہ اب رو بانی ہو کر کہہ رہی تھی۔

”مالا کیسی ہے؟ کیا کرتی ہے وہ اب؟ میں بھی بھٹک کر یہاں آ گئی ہوں۔ بس دونوں یہاں سے بھاگ نکلتے ہیں۔“ حیاء نے افق کا ہاتھ پکڑا۔ اور دونوں تیزی سے باہر کی طرف بھاگنے لگیں۔ باہر پہنچ کر الو کی ساخت والے فوارے کے پاس پہنچ کر حیاء ایک دم رک گئی اور الو کو دیکھنے لگی۔ افق کو بھی مجبوراً کرنا پڑا تھا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں موجود حیاء کا ہاتھ اچانک بہت سرد ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ اکڑتا بھی جا رہا تھا۔ بالآخر افق کو یوں لگا کہ اس نے ہاتھ میں لکڑی پکڑ رکھا ہے۔

اس نے حیران ہو کر حیاء کو دیکھا۔ حیاء کے نقوش اب بگڑ چکے تھے اور اب وہ غیر انسانی آوازیں نکالتے ہوئے افق کے چہرے پر پل پڑی۔ وہ اپنے لمبے اور نوکیلے دانتوں سے افق کے چہرے کو کھرچنے لگی۔

ماند پڑی سانسوں کے ساتھ افق نے ٹاپ کی پاکٹ سے لائٹر نکالا اور اسے فوراً آن کیا۔ لائٹر سے آگ نکلنے کی دھیمی کہ حیاء کی روح چنگھاڑتی ہوئی غائب ہو گئی۔

افق کا چہرہ لبو لہان تھا۔ اسے ٹھیک سے نظر بھی نہ آ رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس نے ہمت نہ ہاری اور لڑکھڑاتے قدموں سے بھاگتی ہوئی بالآخر گیٹ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

افق حال سے بے حال ہو گئی تھی۔ اس کے پیروں کی طرح لبو لہان ہو گئے تھے۔ مرکز زندگی کی چاہ اسے دوڑائے جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

گڈریا نے ہمت کر کے کوڑے کرکٹ میں دبی اس لڑکی کو باہر نکالا۔ لڑکی میں ابھی سانس باقی تھی۔ وہ گڈریا کے بازو کا سہارا لے کر یہ مشکل چل رہی تھی ”تمہارا نام کیا ہے۔“ گڈریا لڑکی کے بارے میں کچھ جانتا چاہ رہا تھا۔

”اف..... افق.....“ لڑکی بہ مشکل گویا ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے جان ہو کر گڈریا کے بازوؤں میں جھول گئی۔ گڈریا ایک دم گرتے گرتے سنبھلا وہ ٹکٹکی باندھ لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا۔

کافی دیر بعد افق ہوش آیا تھا۔ اس نے مندی مندی آنکھیں کھولیں پانی کی تیز دھاریں مسلسل اس کے اوپر گر رہی تھیں۔ وہ الو کے جسم سے نیچے پڑی تھی وہ مجسمہ ایک طرح کا فوارہ تھا۔ افق گھبرا کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر موت کے دہانے تک آئی تھی اس کے چاروں طرف کوٹھی کے نیلے درود پوار تھے۔

”اس کوٹھی کی حدود پھلانگنے والا آج تک زندہ نہیں بچ سکا، تو پھر تم زندہ کیسے بچ سکتی تھی۔“ عقب سے آنے والی آواز پر افق نے مرکز دیکھا تو سامنے وہی گڈریا کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

”تم بہت ہوشیار ہو۔ مگر تم اب کی بار نہیں بچ سکتی۔ پہلے ہی اس چوہدری کے بچے نے ہماری جگہ پر یہ کوٹھی تعمیر کروا کر غلطی کی تھی۔ اس کی خوبصورت بیوی اور وہ خود، اس کوٹھی میں رہائش کی پہلی رات ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

یہ جگہ ہماری ہے..... صرف ہماری..... وہ آواز اس لڑکی کی تھی جسے ایک بار افق نے اپنے کندھوں پر سوار دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی افق کو اپنے جسم میں ہزاروں سونیاں چھپتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ افق کی گردن غیر ارادی طور پر بائیں طرف کو گھوٹی اور ٹکڑ کی آواز کے ساتھ ہی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

کئی موسم آئے اور گزرے۔ نیلی کوٹھی آج بھی اپنے جاہ و جلال کے ساتھ اسی طرح موجود ہے۔ لوگ آج بھی وہاں جانے سے گریز کرتے ہیں اب وہاں جنگلی کیوتروں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اور اللہ کی بنائی پیدا کردہ آتشیں مخلوق وہاں پوری شان و شوکت سے راج کرتی ہے۔



بدروحوں کا مسکن

صفر شاہین - ملتان

رات کے سناٹے میں بدروحوں کے قہقہے قیامت ڈھانے لگے وہاں پر موجود لوگوں کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی تیز لہر دوڑ گئی اور پھر ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک پراسرار ہیبت ناک اور خوفناک آواز گونجی۔

دل و دماغ کو خوف و ہراس کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی اپنی نوعیت کی ایک ناقابل یقین کہانی

شاہدہ پولیس اسٹیشن میں میری تعیناتی کو ابھی پندرہ سولہ دن ہی گزرے تھے کہ مجھے ایک خوفناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا، ہوا یوں کہ ایک دن میں پولیس ہیڈ کوارٹر لاہور کی کام سے گیا۔ وہاں سے بارہ بجے واپس آیا تو تھانے کے احاطے میں پندرہ بیس افراد بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو کھڑے ہو کر سلام کرنے لگے۔ میں سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ پی کیپ اتار کر میں کرسی پر بیٹھا اور گھنٹی بجائی، فوراً ہی میرا دل اندر آ گیا۔

”گل محمد..... باہر کون لوگ ہیں۔ کیا معاملہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”صاحب۔ یہ لوگ نیگم کوٹ سے آئے ہیں۔ چوری کا کیس ہے۔ تفصیل کا علم نشی صاحب کو ہوگا۔“ گل محمد نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ نشی کو بھیج دو.....“ میں نے اسے ہدایت کی تو گل محمد باہر نکل گیا۔

مجھے حیرت تھی کہ چوری کی رپورٹ درج کرانے کے لئے پندرہ بیس افراد کیوں آئے تھے جبکہ اس مقصد کے لئے تین چار افراد بھی کافی تھے۔ اتنے

میں نشی محرز ظفر اندر آ گیا اور اس نے مجھے سلام کیا۔ ”ظفر۔ تم نے ان لوگوں کی چوری کی رپورٹ درج کر لی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”کیسے درج کرتا سر..... یہ کوئی عام چوری نہیں ہے.....“ ظفر نے کہا۔

”کیا مطلب.....“ میں نے بے اختیار چونک کر کہا۔ ”کیا اب چوریاں بھی خاص اور عام ہونے لگی ہیں؟“

”جی ہاں۔ اسی لئے میں نے آپ کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔“ ظفر نے کہا۔ ”یہ لوگ صبح ساڑھے نو بجے سے یہاں بیٹھے ہیں۔“

”بے وقوف آدمی۔ ان بے چاروں کو اتنی دیر بٹھائے رکھنے کا کیا فائدہ تھا۔ تم رپورٹ درج کر لیتے۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”لیکن صاحب کس کے خلاف رپورٹ درج کرتا۔ نہ وہ چور کو جانتے ہیں اور نہ کسی پر شک کا اظہار کرتے ہیں۔“ ظفر نے کہا۔

”کمال ہے۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”کیا تم نہیں جانتے کہ ایسی رپورٹ نامعلوم افراد کے خلاف درج کی جاتی ہے؟“



”مجھے معلوم ہے صاحب۔ لیکن چوری کسی مکان یا دکان میں نہیں ہوئی بلکہ قبرستان میں ہوئی ہے۔“ ظفر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اوہ.....“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”کیا قبرستان سے کسی چور نے درخت کاٹے ہیں یا کسی کافکن چرایا ہے؟“

”نہیں صاحب۔ کفن کے بجائے پوری لاش ہی چوری کر لی گئی ہے.....“ ظفر نے تیزی سے کہا۔

”کیا.....“ میں بے ساختہ اچھل پڑا۔ ”لاش چوری کر لی گئی ہے؟“

”لیس سر! اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ عام چوری نہیں ہے۔“ ظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اسی لئے رپورٹ نہیں لکھی کہ ہو سکتا ہے کہ آپ مدعی سے کچھ پوچھنا پسند کریں.....“

”مدعی کون ہے.....“ میں نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

”لاش کا بھائی..... میرا مطلب ہے مرنے والے کا بھائی۔ دوسرے لوگ اس کے رشتے دار اور پڑوسی ہیں۔“ ظفر نے جواب دیا۔

”یہ کب کا واقعہ ہے.....“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”گزشتہ رات کا.....“ ظفر بولا۔ ”کل شام لاش دفنائی گئی اور رات میں کوئی اسے قبر سے نکال کر لے گیا۔“

یہ حیرت انگیز اور دلچسپ کیس معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ظفر سے کہا۔ ”مدعی اور اس کے رشتہ داروں کو بلاؤ.....“

”ظفر سر کو جنبش دیتا ہوا باہر چلا گیا۔ میرے لئے یہ امر حیرت کا باعث تھا کہ چوروں نے نقب چوری کرنے کے بجائے پوری لاش چوری کر لی تھی۔ بھلا ایک بے جان لاش سے کیا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ نہ وہ کھانے کی نہ پہننے کی۔ میں نے سوچتے ہوئے سگریٹ ساگایا۔ چند تھوئیں بعد تین افراد ظفر کے ساتھ

اندر آئے۔ انہوں نے مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب دیتے ہوئے انہیں سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گئے۔ ان میں دو ادیب عمر تھے جبکہ تیسرا جوان آدمی تھا۔ اس کی عمر تیس اور پچیس کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔

”صاحب جی..... یہ مدعی ہے۔“ ظفر نے جوان آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ اس کا ناموں اور یہ پچا ہے۔“

”آپ کا نام.....؟“ میں نے مدعی سے پوچھا۔ ”کیا کام کرتے ہیں.....؟“

”جی میرا نام اکبر ہے.....“ اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ ”بیگم کوٹ میں میری پسند کی دکان ہے اکبر جنرل اینڈ پسنار اسٹور۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ بتائیں کہ کیا قصہ ہے۔ بلا جھجک ہر بات مکمل اور تفصیل سے بیان کریں۔“

پھر میں نے ظفر سے کہا کہ وہ کاغذ قلم لائے اور مدعی کا بیان نوٹ کرتا جائے۔ ظفر واپس آیا تو اکبر بیان دینے لگا۔

☆.....☆.....☆

اکبر کے بیان کے مطابق اصغر اس سے آٹھ برس چھوٹا یعنی چوبیس برس کا خوب صورت اور صحت مند نوجوان تھا۔ لاہور میں واقع ایک پرنٹنگ پریس میں کام کرتا تھا۔ وہ روزانہ صبح کام پر جاتا اور شام سات بجے تک واپس گھر آیا کرتا تھا۔ دودن پہلے یعنی مرنے سے ایک دن قبل وہ صبح کام پر جاتے ہوئے گھر میں بتا کر گیا تھا کہ وہ آج رات فلم دیکھنے کا اس لئے دیر سے گھر واپس آئے گا۔ چنانچہ اس روز گھر والے اس کا انتظار کئے بغیر بی سو گئے۔ لیکن ماں کو اصغر کی فکر میں نیند نہ آئی۔ اکبر نے اس رات کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

”رات کے ساڑھے بارہ بج گئے تو ماں نے مجھے جگا کر پریشان لہجے میں کہا۔“ اکبر، تمہارا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔“

میں نے گھڑی پر وقت دیکھ کر کہا۔ ”ممکن ہے اس نے آخری شو دیکھا ہو۔ اس وقت شو ختم ہو چکا ہوگا اور اصغر واپس آ رہا ہوگا آپ فکر نہ کریں۔“

میری ماں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے دوبارہ نیند نہ آئی۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا مگر اصغر واپس نہ آیا تو مجھے بھی فکر ہوئی اتنے میں ماں دوبارہ میرے پاس آئی۔

”کبر بیٹے۔ اصغر ابھی تک نہیں آیا۔ خدا خیر کرے۔ تم اس کا پتا کرو۔“

”ماں۔ آپ خواہ خواہ پریشان نہ ہوں۔ وہ کوئی بچہ تو نہیں ہے جو راستہ بھول گیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ممکن ہے اسے سواری نہ ملی ہو اور وہ پیدل آ رہا ہو۔ گزشتہ گرمیوں میں بھی تو اسے ایک دوسرے پیدل آنا پڑا تھا۔“

”مگر بیٹے وہ گرمیوں کا موسم تھا۔ لوگ گھروں سے باہر سوتے تھے۔“ ماں نے کہا۔ ”آج کل سردیاں ہیں، لوگ گھروں میں لٹائوں میں دیک کر سوتے ہیں اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ باہر کوئی حادثہ یا واقعہ رونما ہوا ہے۔ سڑکیں گلیاں آٹھ فوٹ بجے ہی سنسان ہو جاتی ہیں۔“

”اچھا.....“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں بس اسٹاپ تک اسے دیکھنے جاتا ہوں۔“

میں نے اپنی بانیہ کل لٹائی اور باہر نکل آیا۔ ہمارا گھر بیگم کوٹ کی آبادی کے آخری سرے پر ہے۔ وہاں سے بس اسٹاپ کا فاصلہ ایک میل ہے۔ بس اسٹاپ سے دو گز لانگ آگے مین روڈ سے ایک چھوٹی سڑک ہمارے گھر کی طرف آتی ہے۔ لیکن اس راستے پر آبادی کے بجائے کھیت ہیں یا پھر قبرستان۔ اس کے علاوہ ادھر سے مین روڈ کا فاصلہ بھی زیادہ ہے۔ بہر حال میں سائیکل پر سواری کر بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔ لیکن راستے میں مجھے کہیں بھی اصغر نظر نہ آیا۔ بس اسٹاپ بھی ویران پڑا تھا۔ رات کے اوقات میں وہاں سے لاہور یا شیخوپورہ جانے والے ٹرک ٹرالیاں گزرتے ہیں۔ ایک بجے کے

بعد کوئی بس سواری ادھر نہیں آئی۔

میں چند منٹ وہاں ٹھہر کر سوچتا رہا کہ اصغر کیوں نہیں آیا۔ پھر میں واپس چل دیا۔ گھر پہنچ کر میں نے صحن میں سائیکل کھڑی کی تو میری ماں باہر نکل گئی۔ میں صحن کا دروازہ بند کر کے برآمدے میں آیا۔

”کچھ پتا چلا اصغر کا.....؟“ ماں نے بے قراری سے پوچھا۔

”نہیں ماں۔ بس اسٹاپ تک دیکھ آیا ہوں۔ شاید وہ آج پریس میں ہی سو گیا ہے۔ ورنہ اب تک آ چکا ہوتا۔“ میں نے کہا۔

”ماں کی تسلی نہ ہوئی۔ میں اس کے ساتھ کمرے میں آیا یہی تھا کہ اچانک باہر کا دروازہ زور زور سے پٹیا جانے لگا۔ میں چونک کر پلٹا۔ نہ جانے کون تھا، اصغر تو ہمیشہ آرام سے دستک دیا کرتا تھا۔

”کون ہے.....؟“ میں نے برآمدے میں آ کر بلند آواز سے پوچھا۔

اسی لمحے باہر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بھاری شے زمین پر گر رہی ہو۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے دوبارہ پوچھا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے باہر کا دروازہ کھولا تو سامنے میرا بھائی اصغر زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر میں گھبرا گیا۔

”اصغر..... اصغر..... کیا ہوا۔“ میں اسے سیدھا کرتے ہوئے چلایا۔

لیکن اصغر پر بے ہوشی طاری تھی اور جسم اس کا بہت ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میری آواز سن کر میری ماں اور بیوی دوڑتی ہوئی باہر آئیں۔ اصغر کی حالت دیکھ کر ماں کی چیخ نکل گئی۔ میں نے جلدی سے اصغر کو اٹھایا اور کمرے میں لا کر بستر پر لٹادیا۔ اصغر کی آنکھیں اس طرح پٹی ہوئی تھیں جیسے اس نے کوئی خوفناک چیز دیکھی ہو۔ میری ماں اور بیوی رونے لگیں۔ میں نے اسے تسلی دی۔ اصغر کو مکمل اور لحاف اوڑھایا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ چند منٹ بعد اسے ہوش آیا۔ ہم نے اسے گرم دودھ پلایا۔ اسے ہوش میں

دار Digest [155] March 2013

دار Digest [154] March 2013

دیکھ کر ماں کو کچھ اطمینان ہوا۔ اصغر کو تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی دیر کہاں رہا ہے اور بے ہوش کیوں ہوا تھا تو وہ کہنے لگا۔

”فلم کا شوساڑھے بارہ بجے ختم ہوا۔ میں یادگار چوک پر پہنچا اور راولپنڈی جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ جب شاہدرہ موڑ پر بس سے اترا تو اس طرف آنے والی کوئی گاڑی وہاں موجود نہ تھی۔ کچھ دیر بعد لاہور سے ایک ٹرالر آیا جو شیخوپورہ جا رہا تھا میں نے اسے روک کر ڈرائیور کی منت سماجت کی تو اس نے مجھے پیچھے بٹھالیا۔ بیگم کوٹ کا اسٹاپ آیا تو میں نے ڈرائیور کو پکارا اور کہا کہ مجھے یہاں اتار دے۔ اس وقت ٹرالر فل رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ ہوا کے زبردست شور میں پھیل تو ڈرائیور میری آواز نہ سن سکا اور جب میں نے دروازے پر ہاتھ مار کر اسے متوجہ کیا تو میرا مطلب سمجھ کر وہ بریک لگانے لگا۔ اتنی دیر میں بس اسٹاپ کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ میں ٹرک سے اترا اور ٹرک آگے بڑھ گیا۔

میں بس اسٹاپ کی طرف جانے کے بجائے قبرستان والے راستے پر ہولیا۔ جو نبی میں قبرستان کے قریب پہنچا مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو خوف سے میرے روٹنے لگے ہو گئے۔ قبرستان میں ایک قبر کے پاس تین کفن پوش کھڑے تھے۔ ان کے کفن ہوا سے لہرا رہے تھے۔ لیکن مجھے ان کے چہرے نظر نہ آئے۔ کیونکہ ستاروں کی روشنی بہت مدھم تھی۔ میں نے خوفزدہ ہو کر اپنی رفتار بڑھا دی۔ شاید وہ مردے تھے۔

”اصغر بھائی..... ادھر آؤ یا رہ.....“ اسی لمحے ان میں سے کسی نے مخاطب کر کے کہا۔

اپنا نام سن کر خوف سے میرے پسینے چھوٹنے لگے۔ میں نے جواب دینے کے بجائے اپنی رفتار بڑھا دی۔

”اصغر..... یار بات تو سنو..... ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور تم ہو کہ پروا نہیں کر رہے

ہو۔“ مجھے دوبارہ وہی آواز سنائی دی۔

یہ سن کر میں نے ان کفن پوشوں کی طرف دیکھا۔ تو وہ تینوں میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں دہشت زدہ ہو کر دوڑنے لگا۔ مجھے پیچھے سے ان کے قہقہے سنائی دیئے۔

”لو..... وہ تو بھاگ رہا ہے۔ جلدی کرو..... اسے پکڑو.....“ ایک کفن پوش مردے کی آواز بلند ہوئی۔

”رہنے دو۔ یہ کل رات ہمارا مہمان ہوگا۔ ہم نے اس کے ساتھ دوتی کا آغاز کر دیا ہے۔“ دوسرے کفن پوش کی آواز سنائی دی۔

میں اتنا دہشت زدہ تھا کہ دوبارہ ان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا اور اندھا دھند دوڑتا ہوا یہاں آ پہنچا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے پوری قوت سے دروازے پر ہاتھ مارے تھے۔“

اصغر کی بات سن کر ماں فوراً اس پر آیت الکرسی دم کرنے لگی اور اصغر چند منٹ بعد سو گیا۔ لیکن صبح تک اس کا بخار بہت تیز ہو گیا۔ بخار کی غشی کے دوران وہ بڑبڑاتا رہا۔ میں اسے بیگم کوٹ کے سرکاری اسپتال لے گیا۔ لیکن ڈاکٹر کے معائنہ کرنے سے پہلے ہی اصغر مر گیا۔“ اکبر نے کہا تو اس کی آنکھیں پھرا آئیں اور اس کے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اکبر دوبارہ کہنے لگا۔

”ہم نے شام مغرب سے پہلے اسے قبرستان میں دفنا دیا۔ آج صبح میں اس کی قبر دیکھنے گیا کہ کہیں کسی جانور نے کچھ قبر کو نقصان نہ پہنچایا ہو۔ میں قبرستان پہنچا تو اصغر کی قبر پوری طرح کھلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے کسی نے کدال یا پھوڑے کی مدد سے قبر کھودی ہو۔ میں نے قبر میں جھانکا تو اس میں اصغر کی لاش موجود نہیں تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بڑی احتیاط سے اندرونی حصے کی اینٹیں ہٹا کر لاش نکالی تھی۔ کیونکہ اگر یہ کسی جانور کی کارروائی ہوتی تو وہ قبر میں ایک سمت سے سوراخ کرنا

اور قبر سے لاش کا کوئی ٹکڑا اور کفن کی دھجیاں ملتیں۔ میں نے فوراً رشتے داروں اور پڑوسیوں کو اطلاع دی۔ وہ لوگ میرے ساتھ قبرستان آئے۔ سب کی رائے تھی کہ لاش کسی انسان نے نکالی ہے۔ چنانچہ ہم وہاں سے سیدھے یہاں چلے آئے تاکہ رپورٹ درج کر سکیں اور پولیس میرے بھائی کی لاش تلاش کرے۔“

اکبر خاموش ہو گیا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی اور میں دل میں سوچنے لگا کہ پولیس اصغر کی لاش کو کہاں تلاش کرے گی۔ بہر حال میں نے ان لوگوں کو تسلی دی۔

”پولیس پوری کوشش کرے گی۔ آپ کو کسی پر شک ہے تو بتائیں تاکہ اسے پکڑ کر پوچھ گچھ کی جائے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”ہمیں صرف انہی کفن پوش بدروحوں پر شک ہے جو اصغر کو قبرستان میں نظر آئی تھیں۔“ اکبر کے ماموں نے کہا۔

”کیا پہلے بھی اس قبرستان سے کوئی لاش چوری ہوئی ہے.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں جناب۔“ اکبر کے چچا نے جلدی سے کہا۔ ”گزشتہ پچاس برسوں میں تو وہاں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا اور نہ کسی نے سنا۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ لوگ جائیں۔ میں تھوڑی دیر بعد قبر کا معائنہ کرنے آؤں گا۔“ میں نے ان لوگوں سے کہا۔ ”وہاں قبر کے آس پاس قدموں کے نشانات تو ہوں گے۔“

”پہلے تو ہمیں خیال بھی نہیں آیا تھا۔“ اکبر نے کہا۔ ”جب خیال آیا تو وہاں محلے داروں کے قدموں کے نشانات پڑ چکے تھے۔ اتنے نشانات میں سے لاش چوری کرنے والوں کے قدموں کے نشانات کیسے معلوم کئے جاسکتے ہیں۔“

منشی ظفر اکبر کا بیان نوٹ کر چکا تھا۔ چنانچہ میں نے ان لوگوں کو رخصت کیا اور خود بھی بیگم کوٹ جانے کی تیاری کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر تین بجے میں اپنے ماتحتوں عادل اور نازک جو کہ بالترتیب حوالدار اور سب انسپکٹر تھے۔ اور دو سپاہیوں کے ساتھ بیگم کوٹ کے قبرستان میں پہنچا تو وہاں کچھ لوگ ایک میت کو دفنارہے تھے۔ اصغر مرحوم کا بھائی اکبر بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ جیب سے اترا تو اکبر جلدی سے ہمارے قریب آ گیا۔ ہم اس کے ساتھ اصغر کی قبر پر پہنچے۔ میں نے قبر کا جائزہ لیا۔ قبر کھدی ہوئی تھی۔ ایک طرف مٹی کا ڈھیر اور قبر سے نکالی گئی چکی اینٹیں پڑی تھیں۔ بلاشبہ وہ انسانی کارنامہ تھا۔ کسی نے بڑی احتیاط سے قبر کشائی کی تھی۔ چند منٹ بعد میں نے اکبر کو ہدایت کی کہ وہ قبر بند کروائے تو اس نے گورن کو بلا کر قبر بند کرنے کو کہا۔

”کسی کی میت دفنائی جا رہی ہے.....؟“ میں نے اکبر سے پوچھا۔

”ہمارا ایک محلہ دار تھا۔ آج دس بجے انتقال کر گیا تھا۔“ اکبر نے کہا۔ ”بے چارہ نو جوان تھا۔ دو ماہ پہلے ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔“

مجھے خیال آیا کہ لاشیں چرانے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے تو ہوسکتا ہے کہ آج رات اس نئی لاش کو بھی چرایا جائے۔

”ٹھیک ہے۔ آج رات پولیس یہاں پہرا دے گی۔ لیکن یہ بات خود تک محدود رکھنا کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اکبر سے کہا۔

”واپسی تھانے آ کر میں شام تک ذہن میں پروگرام دیتا رہا۔ رات آٹھ بجے میں نے سب انسپکٹر نازک کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ وہ وردی اتار کر سادہ لباس پہن لے۔ میں نے اسے اپنا پروگرام بتایا۔ نازک کافی جی دار اور ہم جوشم کا نو جوان تھا۔ وہ سادہ لباس پہن کر آیا تو اتنی دیر میں میں بھی سادہ کپڑے پہن چکا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے ہم نے جرسیاں اور مفلر لے لئے تھے۔ سرکاری ریوالور بھی ہمارے پاس تھے جبکہ میری ہدایت پر نازک نے ایک ٹارچ بھی لے لی تھی۔

نوبت ہم بیگم کوٹ کے بس اسٹاپ پر پہنچے۔ سرکاری جیب ہماری نشاندہی کر سکتی تھی کہ ہم پولیس والے ہیں۔ اس لئے ہم وہاں ٹیکسی میں آئے تھے۔ چائے کے قہر ماس ہمارے پاس تھے۔ ہم نے وہاں ایک ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا اور قہر ماس میں چائے بھر واکر پیدل ہی سڑک کے کنارے آگے بڑھنے لگے۔ دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے ہم اس جگہ پہنچے جہاں سے ایک پچی سڑک بیگم کوٹ کی آبادی کے آخری حصے کی طرف جاتی تھی۔ اس کے راستے کے دونوں جانب سبز یوں کے کھیت تھے۔ قبرستان کا فاصلہ دو ڈھائی فرلانگ کے قریب تھا جبکہ قبرستان سے آبادی بھی اتنے ہی فاصلے پر تھی۔

سردی کل کی نسبت کچھ زیادہ ہی تھی اور اس کا سبب سہ پہر کے بعد چلنے والی تیز ہوا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل بھی موجود تھے۔ میں نے نازک سے کہا کہ چادریں اوڑھ لیتی چائیں۔ اس نے سامان کے تھیلے میں سیاہ اوئی چادریں نکالیں اور ایک مجھے دے دی۔ ہم نے چادریں اوڑھیں اور چہروں کو سدرہ ہوا سے بچانے کے لئے چہرے پر ناک تک مفلر لپیٹ لئے۔ پھر ہم کچے راستے پر چل پڑے۔ میں آج دفنائے جانے والے نوجوان کی قبر پر پہرہ دینا چاہتا تھا۔ اصولاً تو مجھے چاہئے تھا کہ وہاں چند سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا دیتا۔ لیکن میں ایڈونچر پسند ہوں اور مشکل کاموں میں ہاتھ ڈالنا میرا مشغلہ ہے۔ اسی لئے میں نے خود ہی اس نئی قبر کی نگرانی کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اصغر کی لاش چرانے والے اس نئی میت پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کریں گے اور میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہیں عام انسان یا بدرویں جنہیں اصغر نے دیکھا تھا اور جنہوں نے کہا تھا کہ آئندہ رات اصغر ان کا مہمان ہوگا۔ چادریں اوڑھ لینے سے ہم دیہاتی باشندے لگ رہے تھے۔ اول تو اس وقت سڑک پر دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یہی سمجھتا کہ ہم اس علاقے کے رہنے والے

ہیں۔ سب انپکٹر نازک نے چادر کے نیچے تھپلا بغل سے لٹکا رکھا تھا جس میں چائے کا قہر ماس، دو کپ اور چھیل والی نارنج تھی۔ ہم بڑے اطمینان سے چل رہے تھے۔ تاریکی میں ہم زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہمیں روشنی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ ہمیں خود کو دوسروں کی نگاہوں سے ہر ممکن طور پر پوشیدہ رکھنا تھا۔ جب ہم قبرستان کے قریب پہنچے تو میری رست واضح پر ساڑھے دس بجے رہے تھے۔ قبرستان تین اطراف سے گھنی جھاڑیوں اور درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ صرف سڑک کی جانب سے کھلا تھا اور لوگ ادھر سے ہی قبرستان میں آتے جاتے تھے۔ قبروں کی ابتداء سڑک کے کنارے سے ہو رہی تھی۔ میں نے چند قدم پیچھے سے ہی رخ بدلا اور دائیں جانب چلنے لگا۔ اس جانب ایک کھیت تھا۔ قبرستان کا اس طرف شمال پہلو تھا اور ادھر درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ سامنے سے قبرستان میں داخل ہونے میں یہ خطرہ تھا کہ اگر قبرستان میں کوئی موجود ہوا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ پندرہ بیس قدم مغرب کی جانب چلنے کے بعد ہم نے قبرستان کی طرف رخ کر لیا۔ چند لمحوں بعد ہم قبرستان کے بیرونی درختوں کے پاس پہنچ گئے۔ درختوں کے ساتھ گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ بیگم کوٹ کا قبرستان دور تک پھیلا ہوا تھا۔ میری معلومات کے مطابق مغل شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں بیگم کوٹ آباد ہوا تھا۔ اس لحاظ سے یہ قبرستان بھی تقریباً چار سو سال پرانا تھا۔ ماضی میں یہ قبرستان کئی بار سیلاب سے پیوند زمین ہوا تھا۔ میں نازک کے ساتھ گھنی جھاڑیوں میں احتیاط سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ پندرہ سولہ قدم چلنے کے بعد ہم قبرستان میں پہنچ گئے مزید آگے بڑھنے کے بجائے ہم اس جانب کی پہلی قبروں کے پاس رک گئے۔ یہ قبریں زمین سے تین چار فٹ بلند اور پختہ تھیں۔ ہم دونوں ایک قبر کی آڑ میں رک کر قبرستان کا جائزہ لینے لگے۔

قبرستان پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ نازک بھی میرے پیچھے چو پاپوں کی طرح چل رہا تھا۔ امجد کی قبر کے سرہانے کی جانب دس پارہ قدم کے فاصلے پر ایک بلند چوڑے والی قبر نظر آرہی تھی جس کا کتبہ کافی چوڑا اور بڑا تھا۔ میں نے ادھر کا رخ کیا۔ جلد ہی ہم اس قبر کے سرہانے کی جانب پہنچ گئے۔ قبر کے سرہانے چند فٹ کے فاصلے پر ایک جھاڑی تھی۔ جس کی شاخیں قبر پر جھکی ہوئی تھیں۔ یہاں ہمیں پشت کی جانب سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ جبکہ سامنے قبر کا بلند اور کشادہ کتبہ تھا۔ یہاں سے ہم بہ آسانی امجد کی قبر کی نگرانی کر سکتے تھے۔

نازک نے قہر ماس والا تھملا زمین پر رکھا اور نارنج نکال لی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ جب تک میں نہ کہوں وہ نارنج نہ چلائے۔ ہم دونوں کتبے کی آڑ میں کھڑے ہو کر دائیں بائیں سے امجد کی قبر اور اس کے آس پاس کی نگرانی کرنے لگے۔ گیارہ بج چکے تھے۔ قبرستان پر سناٹے اور تاریکی کا راج تھا۔ ہلکی سرورہوا سے ہمارے ہاتھ ٹھٹھر رہے تھے۔ ہماری آنکھیں جلد ہی تاریکی سے مانوس ہو گئیں۔ پھر آسمان بھی بادلوں سے صاف ہو گیا تھا اس لئے ہم دور تک دیکھ رہے تھے۔

”سر..... کیا یہ ضروری ہے کہ اصغر کی لاش چوری کرنے والے امجد کی لاش بھی نکالے آئیں۔“ نازک نے آہستہ سے مجھے مخاطب کیا۔ لیکن سناٹے میں مجھے

اس کی آواز بھی بہت تیز محسوس ہوئی۔ میں نے اسے مزید آہستہ بولنے کی ہدایت کی اور کہا۔

”نہیں۔ ضروری نہیں۔ لیکن ہمیں اس کیس کو حل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ آج نئی لاش نہ بھی دفنائی جاتی تب بھی میں حقیقت معلوم کرنے کے لئے یہاں آتا۔ مجھے پختہ فیصلہ امید ہے کہ امجد کی لاش نکالنے کی کوشش کی جائے گی۔“

”فرض کیا کہ چور لاش نکالے آجائیں تو کیا ہم انہیں روکیں گے؟“ نازک نے سوال کیا۔

”نہیں.....“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”پہلے ہم دیکھیں گے کہ وہ لاش نکالنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر وہ لاش نکال کر لے گئے تو ہم احتیاط سے ان کا پیچھا کریں گے اور ان کے ٹھکانے تک پہنچیں گے کیونکہ ہمیں ان سے امجد اور اصغر کی لاش برآمد کرنی ہے۔“

اجا تک عقب سے ایک آواز ابھری اور نازک بے اختیار اچھل پڑا۔ وہ آواز ایسی ہی تھی جیسے کوئی چو پایا کوئی جانور دوڑ کر وہاں سے گزرا تھا اور خشک پتے چمرا رہے تھے، نازک پلٹ کر دیکھنے لگا۔ لیکن جھاڑی کے نیچے گہری تاریکی کے سبب کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔

”سر..... یہ کیا ہوا تھا؟“ نازک نے مجھے مخاطب کیا تو اس کے لہجے سے خوف نچک رہا تھا۔

”کوئی چو پایا نیولا گزرا ہوگا۔ ایسے جانور قبرستانوں میں عام ہوتے ہیں۔“ میں نے نازک کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو نازک کا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ لیکن قبرستان کا ماحول ہی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی خود خواہ گھبرا جاتا ہے۔

”حواس قابو میں رکھو نازک۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ چائے نکال کر پیو اور مجھے بھی پلاؤ۔“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

نازک بیٹھ گیا۔ اس نے دو پیالیوں میں چائے ڈالی اور ایک مجھے دی۔ میں چائے پیتے ہوئے سامنے کی جانب دیکھنے لگا۔ امجد کی قبر کے آس پاس کئی پختہ

اور بلند تعویذوں والی قبریں تھیں لیکن دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چائے پینے کے بعد نازک پھر کھڑا ہو گیا۔

”سر۔ آپ چند منٹ بیٹھ جائیں۔ تھک جائیں گے۔ میں مگرانی کرتا ہوں۔“ نازک نے مجھ سے کہا اور میں بیٹھ گیا۔ وہ امجد کی قبر کی مگرانی کرنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں میرا اندازہ غلط نہ نکلے۔ بارہ بج گئے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا اور ہم دونوں باری باری کھڑے ہو کر اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ نازک کے حلق سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ ”سر.....!“

”کیا ہوا.....؟“ میں نے چونک کر تیزی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

نازک کچھ نہ بولا۔ میں نے سامنے کی جانب دیکھا تو ایک تمہ کے لئے میرے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ امجد کی قبر سے دس بارہ قدم دور سفید لباس میں کوئی چل رہا تھا۔ اس کا رخ امجد کی قبر کی طرف تھا۔ وہ سفید لباس کفن معلوم ہوتا تھا۔ جس میں اس کا سر اور چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر میں کانپ گیا کہ وہ زندہ انسان کے بجائے کوئی بدروح یا لاش ہے۔

”سر..... سر..... یہ تو کوئی بدروح ہے.....“ نازک نے کانپتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

”شاید۔ مگر تم حوصلہ رکھو..... ڈرو مت۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اپنا ریا اور نکال کر ہاتھ میں لے لو۔“

اسی لمحے میری نظر بائیں جانب اٹھی اور میں چونک پڑا اس طرف سے دو کفن پوش بدرویں امجد کی قبر کی سمت بڑھ رہی تھی۔ نازک سمٹ کر میرے قریب ہو گیا۔ اس کا کندھا میرے کندھے سے ٹکرا رہا تھا اور وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی آواز نکل رہی تھی۔ شاید وہ آیت الکرسی پڑھ رہا تھا۔ میں نے بھی اپنے بنگلی ہولسٹر سے ریا اور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ مگر یہ احتیاطی تدبیر تھی۔ ورنہ میرا گولی چلانے کا کوئی

ارادہ نہ تھا۔ میں نے دائیں جانب دیکھا تو دوسرے ایک بدروح آ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ چاروں کفن پوش بدرویں امجد کی قبر کے پاس پہنچ گئیں۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا اور میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ تمام تر بہادری کے باوجود مجھے پسینہ آ رہا تھا۔

”کام شروع کیا جائے.....؟“ اچانک ان میں سے ایک بدروح کی آواز بلند ہوئی۔ مجھے وہ آواز غیر انسانی محسوس ہوئی۔ بالکل ساٹ اور کسی تاثر کے بغیر۔ یقیناً وہ قبر کھودنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

”غھبرو۔ یہاں۔ کوئی اور بھی ہے.....“ دوسری بدروح کی آواز سنائی دی اور وہ چاروں اور احرار دیکھنے لگے۔

نازک بری طرح کپکپا رہا تھا۔ اسی لمحے ہمارے پیچھے جھاڑی سے پروں کی پھر پھر اڑت بلند ہوئی اور نازک کے حلق سے دبی دبی سی خوفزدہ چیخ نکل گئی۔ میں نے جلدی سے اسے سنبھالا تو وہ میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ دہشت کے مارے اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ میں نے سرگھما کر بدرویں کی طرف دیکھا تو بے اختیار اچھل پڑا۔ وہ غائب ہو چکی تھیں اور دور تک ان کا نام و نشان نہ تھا۔ میں نے نازک کو زمین پر لٹا دیا۔ مجھے اس پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ نہ جانے اس کی چیخ سن کر بدرویں کہاں غائب ہو گئی تھیں میں دوبارہ قبر کی آڑ سے امجد کی قبر کی طرف دیکھنے لگا کہ شاید وہ کفن پوش بدرویں دوبارہ نمودار ہوں۔

”انسپکٹر کاشف.....“ دفعتاً مجھے عقب سے کسی نے پکارا اور میں بے اختیار اچھل پڑا۔ پلٹ کر دیکھا تو مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ جھاڑی کے نیچے گہری تاریکی تھی۔ میں نے جھک کر نازک کے ہاتھ میں دبی ہوئی نارنج نکالی اور سیدھا ہوا سی تھا کہ مجھے وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

”نارنج روشن مت کرنا انسپکٹر۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“ اس آواز نے کہا۔

”کون ہو تم..... سامنے آؤ.....“ میں نے ہمت کر کے کہا۔

”میں سامنے آ گیا تو دہشت کے مارے تمہارا کپکپ بھٹ جائے گا۔“ جواب میں آواز ابھری۔ ”تم اسے بہادری نہیں ہو جتنا بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ دیکھو تمہارے ہاتھ میں ریا اور کیسے بری طرح کانپ رہا ہے۔“

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ خوف کے مارے میرا ہاتھ ہی نہیں پورا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے ریا اور پر گرفت مضبوط کر لی۔

”انسپکٹر کاشف۔ جاؤ، یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اپنے ساتھی کو بھی لے جاؤ، ورنہ صبح تمہیں اس کی لاش بھی نہیں ملے گی۔“ آواز پھر سنائی دی۔ ”تمہارا زندہ انسانوں پر بس چلتا ہے۔ لیکن ہم مادی جسم سے آزاد رو ہیں۔ نہ ہمیں گرفتار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ہم پر کوئی اثر کر سکتی ہے۔ میں تمہیں یہاں سے نکلنے کے لئے پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر اس وقفے میں تم یہاں سے دفع نہ ہوئے تو مجبوراً ہمیں امجد کے بجائے تمہارے خون پر گزرا کر مار دینگے۔“

بدروح کی دھمکی سن کر دہشت کی شدت سے میرا بدن پسینے میں تر ہو رہا تھا اور میرے بدن پر لرزہ طاری تھا۔

☆.....☆.....☆

کئی لمحے گزر گئے مگر وہ پراسرار آواز دوبارہ نہ سنائی دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ بدروح کے حکم کی تعمیل یا اپنے فرض کی ادائیگی؟ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے فورس کے بغیر وہاں آ کر غلطی کی تھی۔ اگر میں چھ سات سپاہیوں کو ہمراہ لے آتا تو شاید نازک خوف سے بے ہوش بھی نہ ہوتا اور بدروح کو بھی مجھ سے مخاطب ہونے کی جرأت نہ ہوتی۔ میں اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید بدروح وہاں سے چلی گئی تھی۔ میں نے پلٹ کر امجد کی قبر کی سمت دیکھا تو وہاں کفن پوش بدرویں دوبارہ نمودار ہو چکی تھیں۔ لیکن اس مرتبہ ایک بدروح کے پاس ایک کمال دکھائی دے رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ کمال سے امجد کی قبریں کھودیں گے۔

”چلو۔ شروع ہو جاؤ.....!“ ایک بدروح کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ ”شاید انہیں اب میرا خوف نہیں رہا تھا۔ یا پھر انہیں یقین تھا کہ میں قبرستان سے چاچکا ہوں۔ حالانکہ بدروح کی طرف سے دی گئی مہلت میں سے ابھی دو منٹ ہی گزرے تھے۔ کمال بردار بدروح امجد کی قبر کے سر ہانے کی جانب آئی اور پھر کمال سے قبر کھودنے لگی۔ نازک بے ہوش پڑا تھا اور میں تنہا ان کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا کہ ان کے ٹھکانے تک جا پہنچتا۔ چنانچہ ضروری تھا کہ میں انہیں امجد کی لاش چوری کرنے سے روکتا۔ میں نے فوراً ہی نارنج کا رخ ان کی طرف کر کے نارنج روشن کر دی۔ طاقتور فلیش لائٹ کا دائرہ امجد کی قبر اور بدرویں پر پڑا تو وہ بدرویں فوراً ہی چیختی ہوئی دائیں بائیں بھاگنے لگیں۔ ٹھیک اسی لمحے عقب سے کوئی بھاری چیز میری پشت سے آ ٹکرائی۔ میرا سر قبر کے سگی کتبے سے ٹکرایا اور میں کراہتے ہوئے گر گیا۔ نارنج میرے ہاتھ سے چھوٹ کر بجھ گئی اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

آنکھ کھلی تو صبح کا اجالا بھیل رہا تھا۔ میرے سر میں شدید درد تھا۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہاں گومڑا بھرا ہوا تھا۔ میں نے تیزی سے اٹھ کر امجد کی قبر کی طرف دیکھا تو قبر کھدی ہوئی تھی۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ میں نے نارنج اٹھائی اور دوڑتا ہوا امجد کی قبر کے پاس پہنچا۔ قبر میں تاریکی تھی۔ میں نے قبر میں نارنج کی روشنی ڈالی اور طویل سانس لے کر رہ گیا۔ قبر خالی پڑی تھی۔ اور اس میں سے امجد کی لاش غائب تھی۔ یقیناً میرے بے ہوشی کے دوران بدرویں وہاں سے لاش نکال کر لے گئی تھیں۔ میں پریشان ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ سورج نکلنے ہی امجد کے عزیز اس کی قبر دیکھنے آئیں گے اور اگر انہوں نے مجھے دیکھ لیا تو پولیس پر سے ان کا اعتماد ختم ہو جائے گا کہ پولیس کی موجودگی میں لاش چوری کر لی گئی تھی۔ چنانچہ میں جلدی سے واپسی آیا جہاں نازک بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کی تو چند لمحوں بعد ہی وہ ہوش میں آ کر بیٹھا۔

”کیا ہوا سر.....“ وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا بولا۔

”فی الحال تو یہاں سے نکل چلو۔ راستے میں بتا دوں گا.....“ میں نے تیزی سے کہا۔

چند لمحوں بعد ہم جس طرف سے قبرستان میں داخل ہوئے تھے اس طرف سے باہر آئے اور مین روڈ کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے راستے میں نازک کو بتایا کہ کس طرح امجد کی لاش چوری کر لی گئی ہے۔

”تمہاری بزدلی کے سبب یہ سب کچھ ہوا ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اگر تم نہ چیختے تو بدروحوں کو ہمارا پتہ نہ چلتا کہ ہم یہاں ہیں۔“

”سوری سر.....“ نازک نے غجالت سے کہا۔ ”مگر میں کیا کرتا سر۔ بدروحوں نے ہماری بوسونگھ لی تھی۔“

”بس۔ بس۔ چپ رہو۔ تمہاری حماقت نے ساری محنت ضائع کر دی۔“ میں نے جل کر کہا۔

”ہم بس کے ذریعے واپس شاہدرہ پہنچے۔“

تھانے پہنچ کر میں نے منشی ظفر کو ہدایت کی کہ لاش چوری کا کیس آئے تو وہ رپورٹ درج کر لے۔ پھر میں نے اپنے کوارٹر میں آکر غسل کیا اور ناشتہ کر کے کچھ دیر کے لئے سو گیا۔ گیارہ بجے میں تیار ہو کر آفس پہنچا تو منشی ظفر سے پتہ چلا کہ امجد کے لواحقین لاش چوری کی رپورٹ درج کرائے آئے تھے۔ شام کے وقت میں نے ایک سپاہی کو بیگم کوٹ بھیجا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کوئی نئی مرگ تو نہیں ہوئی۔ ایک گھنٹہ بعد اس نے آکر بتایا کہ ایک عورت کا انتقال ہوا جو دو بچوں کی ماں تھی اور چار دن پہلے ٹریفک حادثے میں شدید زخمی ہوئی تھی اس کا نام بانو اور عمر اکیس برس تھی۔ جب وہ یہاں بیگم کوٹ پہنچا تو بانو کا جنازہ قبرستان کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی لاش چوری ہونے کے خدشہ کے پیش نظر اس کا شوہر فیصل چند افراد کے ہمراہ آج رات بانو کی قبر پر پہرہ دے گا۔

اس اطلاع کے بعد میں نے نازک کو طلب

کر کے کہا میں آج رات پھر بیگم کوٹ جا رہا ہوں۔ وہ تیاری کر لے۔ اگرچہ نازک نے گزشتہ رات ہمت سے کام نہیں لیا تھا۔ لیکن میرے ہاتھوں میں اس سے زیادہ مناسب اور کوئی نہ تھا۔ رات کے گیارہ بجے ہم بیگم کوٹ کے قبرستان میں اسی جانب سے داخل ہوئے جدھر سے گزشتہ رات آئے تھے۔ قبرستان کے تقریباً وسط میں ایک قبر پر چار افراد پہرہ دے رہے تھے۔ قبر کے بائیں جانب الاؤ روشن تھا جبکہ قبر کے تعویذ پر جلتی ہوئی لالٹین رکھی تھی۔ آگ اور لالٹین کے سبب وہاں خاصی روشنی تھی۔ لیکن ہمیں ان سے چھپ کر قبر کی نگرانی کرنا تھی۔ چنانچہ ہم دبے پاؤں اور قبروں کی آڑ لیتے ہوئے بانو کی قبر کے بائیں طرف ایک اونچے تعویذ والی قبر کے پہلو میں پہنچ کر بیٹھ گئے۔ وہاں سے بانو کی قبر تقریباً پندرہ قدم کے فاصلے پر تھی۔ پہرہ دینے والے افراد قبر کی دوسری جانب الاؤ کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

آسمان پر شام سے ہی گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش کا امکان تھا، اس لئے ہم اپنی چھتیاں ساتھ لائے تھے، الاؤ کی روشنی میں پہرہ دینے والے چاروں افراد کی شکلیں واضح نظر آ رہی تھیں۔ وہ صحت مند اور بٹے کئے نوجوان تھے اور ان کی عمریں بھی تیس برس سے کم تھیں۔ ان میں سے ایک بانو کا شوہر فیصل تھا جس کا حلیہ مجھے سپاہی نے بتایا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ چاروں وہاں سے چلے جاتے یا چھپ کر پہرہ دیتے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ بدروحوں آگ سے ڈرتی ہیں۔ اس لئے مجھے اندیشہ تھا کہ آگ کی موجودگی میں بدروحوں آج نہیں آئیں گی۔ جبکہ میری خواہش تھی کہ وہ بدروحوں آئیں تاکہ میں ان سے اپنی گزشتہ رات کی شکست کا بدلہ لے سکوں یا ان کا تعاقب کر کے ان کے ٹھکانے تک پہنچوں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ چاروں پہرہ دار قبر سے دور ہٹ جاتے اور آگ بھی بجھا دیتے لیکن میں انہیں وہاں سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح ان لوگوں کو ہماری موجودگی کا پتہ چل

انسان کی حقیقت؟

Genetic Engineering کی تحقیقات

انسانی جسم کے ہر خلیے میں اتنی گنجائش ثابت کر چکی ہیں، جہاں ”ڈس کروڈ“ صفحات کے برابر معلومات تحریر کی جاسکیں۔ بغیر خوردبین کے نظر نہ آسکنے والا معمولی خلیہ اپنے اندر اتنی وسیع دنیا لئے ہوئے ہے۔ ”روز آ خر اللہ رب العزت کے حکم پر انسانی جسم کا ہر خلیہ اپنی ساری سرنوشت زبان حال سے سنائے گا اور انسان کا سب کیا دھرا اس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب کر دے گا۔

(الیس حبیب خان - کراچی)

ٹارچ تھی۔ ہم دبے پاؤں درختوں سے گزر کر دوسری طرف پہنچے تو ہمارے سامنے ایک قدیم عمارت تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ انگریزوں کے دور کا کوئی ریٹ ہاؤس یا فوجی چوکی تھی۔ درختوں سے عمارت کا فاصلہ دس بارہ قدم سے زیادہ نہ تھا۔ عمارت کے آس پاس کسی ذی روح کا نام و نشان نہ تھا۔ سامنے کی جانب عمارت کا چولی دروازہ تھا جو بند نظر آ رہا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ وہی عمارت بدروحوں کا مسکن تھی۔ میں نے نازک کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دبے پاؤں عمارت کے دروازے کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر میں نے دروازے پر ہاتھ سے دباؤ ڈالا تو چرچاہٹ کی تیز آواز بلند ہوئی اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اندر گہری تاریکی تھی۔ میں دروازے کے پہلو میں رک کر دروازہ کھلنے کے رد عمل کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحے گزر گئے لیکن کچھ نہ ہوا۔ تب میں نے اللہ کا نام لے کر دروازے کے اندر قدم رکھ دیا۔ لیکن ابھی میرا دوسرا پاؤں باہر ہی تھا کہ اچانک عمارت سے تیز اور پراسرار آوازیں بلند ہونے لگیں اور میرا دل دہل گیا۔

یوں لگتا تھا جیسے عمارت کے اندر بیسیوں بدروحوں مل کر بین کر رہی ہوں۔ میں اپنی جگہ ساکن ہو کر رہ گیا۔ عمارت سے ابھرنے والی پراسرار اور خوفناک چیخ

بدروحوں جلد ہی اس جانب واقع جھاڑیوں اور گھنے ریتوں میں داخل ہو کر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ ہم بھی اور گہری زمین پر احتیاط سے قدم بجاتے ہوئے ان درختوں کے پاس پہنچے۔ یہ جگہ اس مقام سے تقریباً تیس قدم پر تھی جہاں بدروحوں جھاڑیوں میں داخل ہوئی تھیں۔ ہم دونوں بھی جھاڑیوں میں گھس گئے۔ جھاڑیوں سے گزر کر ہم کھلی جگہ پر آئے تو وہ بدروحوں کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر چل رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا میں ان کے کفن لہرا رہے تھے۔ ہمارے سامنے قد آدم جوار کے کھیت تھے۔ ہم ان کھیتوں کے پہلو میں بدروحوں کے متوازی چلنے لگے۔ میں نازک سے ایک قدم آگے تھا۔

”سر..... وہ کہاں جا رہی ہیں.....؟“ نازک نے چلے چلے پوچھا۔

”معلوم نہیں..... لیکن جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

جوار کے کھیتوں کی آڑ میں چلتے ہوئے بدروحوں نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن جب کھیت ختم ہو گئے تو کچھ فاصلے پر اندر سے میں ڈوبی کسی عمارت کا ہیولا دکھائی دینے لگا۔ بدروحوں اسی عمارت کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ شاید وہی عمارت ان کی منزل تھی۔ عمارت تک راستے میں کوئی فصل نہیں تھی۔ اسی لئے ہم محتاط ہو کر چلنے لگے۔ دس منٹ بعد وہ بدروحوں عمارت کے گرد موجود درختوں کی آڑ میں پہنچ کر ٹنگا ہوں سے اوجھل ہو گئیں تو میں نے اپنی رفتار بڑھادی۔ نازک بھی تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔ اس خیال سے خوشی کے مارے میرا دل بیلیوں اچھل رہا تھا کہ میں نے بدروحوں کا مسکن معلوم کر لیا تھا۔ وہ بلند عمارت ان درختوں کے دوسری جانب تھی۔ جن میں بدروحوں غائب ہوئی تھیں۔ جلد ہی ہم ان درختوں کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے احتیاطاً اپنی رفتار کم کر دی تاکہ آہٹ پیدا نہ ہو۔ میں نے نازک کو روک لیا اور ہاتھ میں لینے کی ہدایت کی اور اپنا ریوالتور بھی نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں

”سر..... یہ تو وہی ہیں۔ کل رات والی۔“ نازک نے سرگوشی کی۔

”ہاں۔ مگر تم کل رات والی حرکت مت کرنا۔“ میں نے اسے تنبیہ کی۔ ”ڈر لگ رہا ہو تو ان کی طرف مت دیکھو۔“

”بہت ڈھیٹ آدمی تھا بانو کا شوہر۔“ اچانک بدروحوں میں سے ایک کی آواز بلند ہوئی۔

”ہاں۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ چلا گیا۔“ دوسری بدروح نے ہنس کر کہا۔ ”ورنہ ہمیں دیکھ کر اس کا دم نکل جاتا۔“

”شکر ہے آج انکسپر کا شفع نہیں آیا۔ ورنہ کافی دیر ہو جاتی۔“ ایک بدروح نے کہا۔

”وہ بے چارہ ہماری دہشت سے بخار میں پھنک رہا ہوگا۔“ کدال بردار کفن پوش نے کہا۔

”خیر۔ تم اپنا کام کرو۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔“ پہلی بدروح نے کہا تو کدال بردار بدروح قبر پر کدال چلانے لگی۔

مجھے اپنے قریب نازک کی تیز سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ یقیناً وہ خوفزدہ تھا۔ ایک بدروح قبر کھود رہی تھی اور تین بدروحوں اپنے ہاتھوں سے مٹی ایک طرف ہٹانے میں مصروف تھیں۔ میں بڑی بے تابی سے ان کا کام مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ پندرہ منٹ بعد بدروحوں قبر میں اتر گئیں۔ انہوں نے قبر میں سے کفن میں لپیٹی ہوئی لاش نکال کر باہر کھڑی بدروحوں کے سپرد کی اور پھر خود بھی قبر سے نکل آئیں۔ نازک اور میں دم سادھے ان کی نقل و حرکت دیکھ رہے تھے۔ ایک بدروح نے بانو کی لاش اپنے کندھے پر ڈالی پھر وہ پانچوں بدروحوں مغرب کی سمت چل دیں۔

”بدروحوں کو جاتے دیکھ کر میں نے نازک سے سرگوشی کی۔ ”آؤ ہمیں احتیاط سے ان بدروحوں کا پیچھا کرنا ہے۔“

ہم اپنی جگہ سے اٹھے اور قبروں کی آڑ چلے ہوئے مغرب کی سمت میں بڑھنے لگے۔ کفن پوش

جاتا اور بدروحوں آج بھی لاش نکال لے جانے میں کامیاب ہو جاتیں تو سارا الزام پولیس پر آ جاتا۔ اتفاق سے ایک گھنٹہ بعد ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ہم نے فوراً چھتریاں کھول کر تان لیں۔ بارش سے آگ بجھنے لگی اور پھر لائین بھی بجھ گئی۔ لیکن وہ چاروں وہاں بیٹھے رہے۔ چند لمحوں بعد آگ پوری طرح بجھ گئی اور وہاں اندھیرا پھیل گیا۔ بارش تیز ہونے لگی۔ بارش کی بوندیں قبر کے تعویذ پر گر کر نے سے ہم پر بھی چھینے پڑ رہے تھے اور ہماری گرم چادریں کیلی ہوئی جا رہی تھیں۔

”فیصل بھائی۔ بارش میں چوروں کے آنے کی امید نہیں ہے۔ ہمیں چلنا چاہئے۔“ فیصل کے ایک ساتھی کی آواز سنائی دی۔

”ہاں یار۔ چوروں نے آنا ہوتا تو اب تک آچکے ہوتے۔“ دوسرے نے کہا۔

”تم لوگ جانا چاہو تو بے شک چلے جاؤ۔“ میں تنہا پرہو ہوں گا۔“ فیصل نے کہا۔

”پاگل تو نہیں ہو یا۔“ ایک اور آدمی بولا۔ ”یہاں بارش میں کب تک بھیگتے رہو گے صبح تک تو تمہیں نموینا ہو جائے گا۔“

میں اور نازک خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ چند لمحوں کی بحث کے بعد فیصل وہاں سے جانے پر راضی ہو گیا۔ انہوں نے بھی ہوئی لائین اٹھائی اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد نازک اور میں تھریاس میں لائی ہوئی چائے پینے لگے۔ بارش کم ہونے لگی تھی۔ ایک بچے بوندا باندی رک گئی تو ہم نے چھتریاں بند کر کے تیلے میں ڈال لیں۔ پھر میں چادر اتارنے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ میری نگاہیں بانو کی قبر کی طرف اٹھ گئیں اور میں جلدی سے دوبارہ بیٹھ گیا۔ میں نے قبر کے تعویذ سے ڈرا بلند ہو کر دوبارہ اس طرف دیکھا تو نازک نے بھی میری تقلید کی۔ بانو کی قبر کے پاس پانچ کفن پوش بدروحوں موجود تھیں۔ ایک کے پاس کدال تھی۔

ڈھانچے مسلسل آگے ہی آگے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور درختوں کی طرف دوڑنے لگا۔ درختوں میں پہنچ کر میں ایک درخت کی آڑ میں رکا اور ہانپتے ہوئے عمارت کے دروازے کی طرف دیکھا۔ مگر اسی لمحے دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے چند لمحوں میں اپنے سانس پر قابو پایا۔ میں ڈھانچوں کی گرفت میں آنے سے بچ گیا تھا۔ لیکن میں وہاں سے ناکام واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

میں نے اپنی کھڑی پر نظر ڈالی۔ تین بج چکے تھے۔ میں نے چند منٹ انتظار کیا۔ پھر دبے پاؤں آگے بڑھا اور نازک کے پاس پہنچ گیا جو زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور درختوں کی دوسری طرف لا کر زمین پر لٹا دیا۔ پھر میں دوبارہ ادھر گیا اور وہ تھیلا اٹھا لیا جس میں چائے کے تھرماس کے علاوہ میرا سرکاری موبائل فون بھی تھا۔ میں نے تھیلے سے فون نکالا اور تھیلا نازک کے پاس چھوڑ کر عمارت کی مخالف سمت چلنے لگا۔ وہاں سے تقریباً سو قدم دور آ کر میں رک گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بدروحوں سے آج ہی نمٹوں گا تاکہ وہ آئندہ کسی کی لاش چوری نہ کر سکیں۔ میں نے موبائل پر اپنے تھانہ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی اور جلد ہی رابطہ قائم ہو گیا۔

”ہیلو..... شاہدہ پولیس اسٹیشن.....“ دوسری طرف سے حوالدار مٹھی ظفر کی آواز سنائی دی۔

”کاشف بات کر رہا ہوں ظفر.....“ میں نے بتایا! ”اوہ..... السلام علیکم سر.....“ ظفر کا لہجہ مودبانہ ہو گیا جس میں حیرت کی آمیزش تھی۔

میں نے اسے چند ہدایات دیں اور آخر میں کہا۔ ”تم لوگوں کی ذرا سی کوتاہی سے کام بگڑ سکتا ہے اس لئے انتہائی محتاط رہنا۔“

”آپ بے فکر ہیں سر..... آپ کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا جائے گا.....“ ظفر نے کہا۔

میں نے موبائل آف کیا اور درختوں کی طرف چل دیا۔ وہاں نازک بدستور بے ہوش پڑا تھا۔ عمارت

کی طرف سے کسی قسم کی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ میں نے تھرماس سے چائے نکال کر پی اور درختوں میں سے گزر کر عمارت کی جانب آ گیا۔

☆.....☆.....☆

خونفک عمارت کا صدر دروازہ بدستور بند تھا۔ میں عمارت کے ساتھ ساتھ دائیں جانب بڑھنے لگا۔ میں عمارت کا جائزہ لیتا چاہتا تھا کہ اس میں داخل ہونے کا کوئی اور راستہ بھی ہے یا نہیں۔ عمارت کے گرد گھوم کر میں عقبی جانب پہنچا تو ادھر میری ایک چھوٹی سا دروازہ تھا مگر وہ بند تھا۔ میں دروازے کے پاس آیا اور اس سے کان لگا کر سن گئی۔ لینے کی کوشش کی لیکن اندر سے کوئی آواز نہ سنائی دی میں نے احتیاط سے دروازے پر ہاتھ رکھ کر باؤ ڈالا لیکن دروازہ نہ کھلا۔ یقیناً وہ اندر سے بند تھا۔ دروازے کے سامنے کی جانب درختوں کا ایک جھنڈ واقع تھا۔ میں ان درختوں کی طرف بڑھا اور جھنڈ سے گزر کر میں دوسری طرف پہنچا تو بے ساختہ اچھل پڑا۔ جھنڈ کے عقب میں ایک کار کھڑی تھی اور وہاں سے ایک کچا راستہ مغرب کی سمت جا رہا تھا۔

بدروحوں کے ممکن کے پاس کار کی موجودگی سے میرے دماغ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور میں سوچنے لگا کہ کار کا وہاں کیا کام؟ یہ تو زندہ اور مادی جسم رکھنے والے انسانوں کے استعمال کی چیز ہے جبکہ بدروحوں مادی جسم سے آزاد ہیں۔ میں دبے پاؤں کار کے پاس پہنچا۔ آخری راتوں کا چاند طلوع ہو چکا تھا۔ جس سے تاریکی کی شدت کم ہو گئی تھی۔ میں نے کار کا جائزہ لیا۔ وہ بانوے ماڈل کی ٹیوٹا کرول تھی۔ اس کی کھڑکیاں اور دروازے مقفل تھے۔ میں نے کچھ سوچا اور حوالدار ظفر کو دوبارہ فون کرنے کے لئے وہاں سے کچھ دور پہنچ گیا۔ میں نے تھانے کے نمبر ملائے تو فوراً ہی رابطہ قائم ہو گیا۔ میں نے ظفر کی آواز سن کر اسے پروگرام میں تھوی سی تبدیلی کی اطلاع دی پھر فون بند کیا اور اس سمت چل دیا جہر نازک بے ہوش پڑا تھا۔

میں واپس پہنچا تو مجھے ایک بار پھر حیرت کا جھٹکا

لگا۔ سب انسپکٹر نازک اپنی جگہ سے غائب تھا۔ تھرماس والا تھیلا ابھی نظر نہ آ رہا تھا حالانکہ دس منٹ پہلے تک وہ یہاں موجود تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید میری غیر موجودگی میں نازک کو ہوش آیا ہوگا اور وہ تھیلا اٹھا کر سڑک کی جانب روانہ ہو گیا ہوگا۔ میں نے عمارت کی مخالف سمت نظریں دوڑائیں۔ لیکن حدنگاہ تک مجھے نازک یا اس کا ہیولا نہ دکھائی دیا۔ شاید وہ اتنی دیر میں جوار کے کھیتوں کی آڑ میں پہنچ چکا ہوگا۔ میں نے سوچا مگر میرا ذہن مطمئن نہ ہو سکا۔ مجھے یقین تھا کہ نازک مجھے وہاں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ میں نازک کے بارے میں اندازے قائم کرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے میری غیر موجودگی میں بدروحوں نے باہر آئی ہوں اور نازک کو اٹھا کر اندر لے گئی ہوں۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اگر بدروحوں نے اسے لے جانا ہوتا تو اس وقت لے جاتیں جب میں عمارت میں پھنسا ہوا تھا۔ مجھے دوسرا خیال آیا کہ شاید نازک ہوش میں آنے کے بعد میری تلاش میں عمارت کی طرف گیا ہو۔ چنانچہ میں درختوں سے گزر کر دبے پاؤں عمارت کے دروازے کی طرف آیا۔ لیکن دروازہ بند تھا اور نازک اس طرف بھی موجود نہ تھا۔ میں پریشان ہو کر واپس اس جگہ آ گیا جہاں سے نازک غائب ہوا تھا۔ وہاں بیٹھ کر میں نازک کے بارے میں سوچتا ہوا وقت گزارنے لگا۔

چار بجے تو میں اٹھا اور باہر ہی باہر عمارت کے عقب کی جانب بڑھنے لگا جہاں میں نے ٹیوٹا کا روکھی تھی۔ وہاں پہنچ کر میں ایک درخت کی آڑ میں رکا اور مغربی جانب دیکھنے لگا جہر کچی سڑک جاتی تھی۔ چند منٹ بعد اسی راستے پر چند ہیوے دکھائی دینے لگے۔ جلد ہی وہ ہیوے قریب آ گئے، مجھے انہی کا انتظار تھا۔ میری ہدایت کے مطابق حوالدار ظفر بارہ مسلح سپاہیوں کے ہمراہ وہاں آ پہنچا تھا۔ میں درختوں کی آڑ سے نکل کر راستے پر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ میرے قریب آ رکے۔ میری ہدایت کے مطابق انہوں نے موبائل گاڑی وہاں سے کافی دور چھوڑی تھی اور پیدل ہی یہاں تک آئے تھا۔ میں نے حوالدار ظفر سے تاراج لی اور

اسے ہدایات دینے لگا۔

”تم چھ آدمیوں کے ساتھ مشرقی جانب عمارت کے صدر دروازے کے سامنے درختوں کی آڑ میں پوزیشنز لے لو۔ ادھر سے جو بھی آئے، اسے بھون ڈالنا، کوئی بچ کر نہ جانے پائے۔“ میں نے کہا۔

”سر..... مجرم کون ہیں.....“ حوالدار ظفر نے پوچھا۔

”میں نے سوچا کہ اگر میں بدروحوں کا نام لوں تو وہ لوگ خوف کے سبب اپنے فرائض انجام نہ دے سکیں گے۔“ چنانچہ میں نے کہا۔

”وہ اسمگلرز ہیں۔ انہوں نے پولیس سے بچنے کے لئے سفید کفن جیسے لباس پہنے ہوئے ہیں۔ ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کوشش کرنا کی فائرنگ سے ان کی صرف ٹانگیں چھلنی ہوں تاکہ وہ زندہ ہاتھ آئیں۔“ حوالدار ظفر چھ سپاہیوں کے ساتھ عمارت کے سامنے کی طرف چلا گیا تو میں نے ایک سپاہی کو کار کے پاس متعین کیا اور ہدایت کی کہ مجرم کار کے ذریعے فرار ہونا چاہیں تو فائر کر کے کار کے نائز برسٹ کر دینا۔ پھر میں نے بقیہ پانچ سپاہیوں کو ہدایت کی کہ میرے اشارے کے بغیر کوئی نہیں چلائیں گے اور کسی مجرم کو فرار بھی نہ ہونے دیں گے۔ اس کے بعد میں انہیں ساتھ لے کر عمارت کے مغربی دروازے کی طرف چل دیا۔

☆.....☆.....☆

ہم دبے پاؤں درختوں کے جھنڈ سے گزر کر عمارت کے دروازے کے سامنے پہنچے۔ میرے اشارے پر سپاہی رک گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے سے لگان لگایا تو اندر سے قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ وہ آہٹیں دروازے کی طرف آ رہی تھیں۔ آہٹیں ایک ہی افراد کی معلوم ہوتی تھیں۔ میں دروازے کے پہلو میں دیوار سے لگ گیا اور سپاہیوں کو کبھی سامنے سے ہٹا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ آہٹیں قریب آتی چلی گئیں۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک کفن پوش بدروح باہر آئی۔ میں نے پھرتی سے ایک ہاتھ اس کے منہ پر جماتے ہوئے

دوسرے ہاتھ میں موجود ریوالبور کا دستہ پوری قوت سے اس کے سر پر رسید کر دیا۔ بدروح کے حلق سے نکلنے والی چیخ منہ میں ہی گھٹ گئی اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گئی۔ میں نے اسے تھکیت کر دیوار کے برابر ڈالا اور پھر سپاہیوں کو اپنے پیچھے آ کر اشارہ کرتا ہوا دے پاؤں عمارت میں داخل ہو گیا۔

اندر تاریکی تھی۔ میں نے حوالدار ظفر سے لی ہوئی نارنج روشن کر کے اس کی مدد و روشنی میں وہاں کا جائزہ لیا۔ یہ ایک چھوٹی سی راہداری تھی جس میں آنے سامنے چار کمرے تھے۔ لیکن ان کے دروازے نہیں تھے۔ فرش پر گھاس اگی ہوئی تھی۔ میرے سپاہی بھی اندر آ گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک کمرے میں روشنی ڈالی۔ وہ خالی تھا اور اندر خود گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں آگے بڑھا اور اگلے دو کمرے بھی دیکھ ڈالے۔ لیکن وہ بھی پہلے کمرے کی طرح ویران تھے۔ پھر میں چوتھے کمرے کی طرف بڑھا۔ قریب آ کر میں نے اندر روشنی ڈالی اور چونک پڑا۔ وہ کمرہ بھی خالی ہی تھا۔ لیکن اس کے وسط میں فرش پر ایک خلا نظر آ رہا تھا۔ خلا کے آس پاس خود گھاس اگی ہوئی تھی۔ اس خلا کے اندر روشنی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید نیچے کوئی تہہ خانہ تھا۔

میں نے سپاہیوں کو کمرے سے باہر ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ کسی سیاہ جانور نے بائیں جانب سے مجھ پر چھلانگ لگائی اور میرے ہاتھ سے نارنج چھوٹ کر نہ جانے کہاں جا گری۔ میں لڑکھڑایا اور اسی لمحے اس جانور نے دروازے سے باہر چھلانگ لگادی۔ باہر سے کسی سپاہی کی خوفزدہ سی چیخ بلند ہوئی۔ میں نے جلدی سے سنبھل کر فرش کے خلا کی طرف دیکھا تو اس میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ جس کے سبب مجھے خلا نظر نہ آیا۔ دوسرے ہی لمحے عمارت بدروحوں کی بھینک جیج و پکار سے گونجنے لگی۔ میں نے تیزی سے دروازے کی طرف رخ کرتے ہوئے سپاہیوں سے کہا کہ وہ نارنجیں روشن کر لیں۔ لیکن ان میں سے صرف ایک

کے پاس نارنج تھی۔ اور وہ بھی پٹیل نارنج تھی۔ اس نے نارنج روشن کی اور میں باہر آ گیا۔ میں نے اس سے نارنج لی۔ وہ سب خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ بدروحوں کی چیخ و پکار دل دہلا رہی تھی۔ ”گھبراؤ مت.....“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”دیوار کے ساتھ پوزیشن لے لو۔ جو بھی اس کمرے سے باہر آئے اسے بھون ڈالو۔“

پھر میں نے نارنج بجھادی اور انتظار کرنے لگا۔ پانچ منٹ بعد بدروحوں کی چیخ و پکار بند ہو گئی اور عمارت پر موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ میں دیوار سے لگ کر کمرے میں جھانکنے لگا۔ چند لمحوں بعد اندر خلا میں دوبارہ روشنی ہو گئی۔

”معلوم کرو۔ اوپر کون ہے۔ جو بھی ہونٹ کر نہ جانے پائے۔ شاید وہ اتحق انسپکٹر پھر آ گیا ہے۔“ ایک آواز سنائی دی۔

وہ آواز اسی خلا سے بلند ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد خلا سے ایک کفن پوش بدروح باہر آئی تو میں نے جلدی سے اپنا چہرہ پیچھے ہٹالیا۔ پھر جو بھی اس بدروح کے قدموں کی چاپ دروازے کے قریب آئی، میں نے ایک دم نارنج کارخ اس کی جانب کر کے نارنج روشن کی اور ریوالبور کی نال اس کے سینے سے لگادی۔

”خبردار.....“ میں نے تھکامانہ لہجے میں سرگوشی کی۔ ”ہاتھ بلند کرلو۔ ورنہ سینے میں سوراخ ہو جائے گا۔“ اس بدروح کے حلق سے خوفزدہ سی چیخ نکلی اور اس نے ایک ہاتھ بلند کرتے ہوئے دوسرا ہاتھ میری نارنج پر مارا۔ میرے ہاتھ سے نارنج گر گئی اور میں نے بے اختیار فائر کر دیا۔ بدروح کے حلق سے بھینک جیج نکلی اور وہ تڑپتی ہوئی گر گئی۔ ایک مرتبہ پھر عمارت کے مختلف گوشوں سے پراسرار خوفناک چیخ و پکاری آوازیں ابھرنے لگیں۔ ہمارے پاس مزید نارنج نہیں تھی۔ گرنے والی نارنج گرتے ہی بجھ گئی تھی۔ اس لئے اسے تلاش کرنا دشوار تھا۔ میں اس کمرے میں داخل ہوا اور خلا میں جھانکنے لگا۔ خلا میں نیچے جانے کے لئے زینے تھے

اور زینوں کے اختتام پر دائیں بائیں راہداریاں تھیں۔ وہاں چند کفن پوش بدروحیں کھڑی تھیں۔ وہ بھی اوپر کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ خلا سے آنے والی ہلکی ہلکی روشنی میں انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔

”انسپکٹر کاشف..... مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اب تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔“ ان میں سے ایک بدروح نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”کیواس بند کرو.....“ میں ریوالبور کارخ ان کی طرف کرتے ہوئے غرایا۔ ”پولیس نے چاروں طرف سے اس عمارت کو گھیرے میں لے لیا ہے۔“

”ہا ہا ہا..... ہا ہا ہا.....“ مجھ سے مخاطب بدروح نے قہقہہ لگایا۔ ”پولیس ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ ہم تو صرف روحیں ہیں جنہیں نہ پکڑا جا سکتا ہے اور نہ مارا جا سکتا ہے۔“

”بدروح کے بچے۔ میں تمہاری ڈرامے بازی سمجھ چکا ہوں۔ تمہارا ایک ساتھی ہماری گرفت میں ہے ہوش پڑا ہے اور دوسرا اہلاک ہو چکا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”زندگی چاہتے ہو تو تم سب ہاتھ بلند کر کے اوپر آ جاؤ۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔“

میری دھمکی سن کر اس بدروح نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں چیخ و پکار کی آوازیں بند ہو گئیں۔ میں نے سپاہیوں کی طرف منہ کر کے کہا۔ ”تم لوگ اندر آ جاؤ۔ جو بھی فرار ہونے یا مقابلہ کرنے کی کوشش کرے اسے چھلنی کر دو۔“

یہ کہہ کر میں نے تہہ خانے میں جھانکا تو بدروحیں غائب ہو چکی تھیں۔ ٹھیک اسی لمحے باہر سے فائرنگ کی آواز بلند ہونے لگی۔ شاید بدروحوں نے صدر دروازے کی طرف سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور میرے ماتحتوں نے ان پر فائرنگ کر دی تھی۔

☆☆☆☆

میں نے سپاہیوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خلا میں زینے پر اترنے لگا۔ نیچے کوئی نہ تھا۔ راہداری میں چار کمرے تھے جن کے دروازے سلامت تھے۔

راہداری کے اختتام پر زینے تھے جو اوپر چارہ تھے۔ ان زینوں کے اختتام پر ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ راہداری کی بائیں دیوار کے ایک طاقے میں پیٹرومیکس لیپ جل رہا تھا۔ کمروں میں بھی روشنی تھی۔ میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا تو حیرت سے میرا منہ کھل گیا۔ اندر لیپ کی روشنی میں ایک آپریشن تھیمز کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے میں ایک میز پر ایک نوجوان عورت کی لاش رکھی تھی۔ یقیناً وہ بانو کی لاش تھی جو میرے سامنے قبر سے نکال کر یہاں لائی گئی تھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ مختلف میزوں پر شیشے کے بڑے بڑے مرتبان رکھے تھے جن میں مختلف انسانی اعضا نظر آ رہے تھے۔

میں نے جلدی سے دوسرے کمرے بھی دیکھ ڈالے، ان میں سے دو بیڈروم تھے جبکہ چوتھا کمرہ کچن تھا۔ ایک بیڈروم میں سب انسپکٹر نازک بستر پر بے ہوش پڑا تھا اور اس کے ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے۔ تلاشی کے دوران مجھے ایک نارنج بھی مل گئی۔ میں نے دو سپاہیوں کو وہاں چھوڑا اور تین سپاہیوں کے ساتھ راہداری کے اختتام پر واقع زینوں کی طرف چل دیا۔ زینے طے کر کے میں کھلے دروازے سے باہر آیا تو اس جانب وہ راہداری تھی جس کے سرے پر عمارت کا صدر دروازہ تھا اور دروازہ کھلا تھا۔

”ظفر.....“ میں نے باہر نکلنے سے پہلے حوالدار کو آواز دی۔ ”فائرنگ مت کرنا۔“

پھر ہم باہر آ گئے۔ باہر چار کفن پوشوں کی لاشیں پڑی تھیں جبکہ ایک کفن پوش میرے ماتحتوں کے گھیرے میں ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ وہی بدروح تھی جس نے تہہ خانے میں مجھ سے بات کی تھی۔

اگلی صبح دس بجے شاہدرہ تھانے میں میرے سامنے لاہور کے ممتاز اخبارات کے تین رپورٹرز بیٹھے تھے۔ میں انہیں بدروحوں کا قصہ سنارہا تھا۔ جبکہ زندہ گرفتار ہونے والی بدروح کفن میں ملبوس میرے بائیں



قوم جنات

حافظ محمد ہاشم ہوت۔ میر پور خاص

دیکھتے ہی دیکھتے اچانک ہوانہ جھکڑ کی شکل اختیار کرلی اور پھڑ ہوا سمٹتے سمٹتے ایک جگہ ٹھہر گئی پھر ہوا میں ایک عجیب و غریب ہیولہ ظاہر ہونے لگا، جب وہ ہیولہ مکمل ہوا تو اسے دیکھ کر.....

کیا یہ حقیقت ہے کہ قوم جنات کی عمریں ہزاروں سال ہوتی ہیں۔ ثبوت کہانی میں موجود ہے

پاس رہتی ہے۔ لیکن وہ ہمیں دکھتی نہیں۔ اور وہ مخلوق ہے۔ ”قوم جنات“.....

ویسے تو اللہ نے بے شمار مخلوقات پیدا کی ہیں جس کا شمار اس ذات الہی کے علاوہ کسی کے علم میں نہیں ہے۔ رات کے دس بج رہے تھے رضوان، کاشف اور کاشف کا چھوٹا بھائی آصف یہ تینوں دوست آج گاؤں سے تھوڑا دور ایک پتیل کا درخت تھا۔ اس کے نیچے بیٹھے

اس کا مطلب ہے کہ ”نعوذ باللہ“ تو قرآن پاک کا منکر ہے۔ کیونکہ قرآن پاک نے تو واضح طور سے یہ بتا دیا ہے کہ انسان کے علاوہ بھی اللہ نے ایک ایسی مخلوق پیدا کی ہے جس کا انسانوں کی طرح آخرت میں حساب کتاب ہوگا اور جیسے انسانوں میں قوم اور قبیلے اچھے برے ہیں۔ اس طرح اس مخلوق میں یعنی اس مخلوق میں بھی قوم اور قبیلے ہیں اور وہ مخلوق ہمارے آس

روز میں نے اس بات پر غور کیا کہ وہ بدروہیں مجھ سے کیوں خوفزدہ تھیں۔ اگر انہیں میرا ڈنٹیں تھا تو میری پرواہ کئے بغیر اپنے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ مجھے گمان ہوا کہ وہ اصل روہیں نہیں ہیں۔

پھر دوسری رات جب انہوں نے بانو کی لاش نکالی تو انہیں میری اور سب انکسٹر نازک کی موجودگی کا احساس نہ ہوسکا حالانکہ روہیں دور تک اور ٹھوس اشیاء کے پار تک دیکھ سکتی ہیں۔ ہم نے ان کا تعاقب کیا تب بھی انہیں ہمارا پتہ نہ چلا جس سے میرے شبہ کو تقویت ملی۔ عمارت کے دروازے میں داخل ہوتے وقت اور پھر رابداری میں کیے بعد دیگرے جو مختلف پر اسرار آوازیں سنائی دی تھیں، ان سے میں خوفزدہ تو ضرور ہوا تھا لیکن بعد میں غور کرنے پر مجھے احساس ہوا کہ آوازیں اس طرح بلند ہوتی یا بند ہوتی تھیں جیسے کسی ٹیپ ریکارڈ کا مٹن آن کرنے سے یکدم آواز آتا شروع ہو جاتی ہے اور مٹن آف کرنے سے فوراً بند ہو جاتی ہے۔

بس انہی محسوسات نے میرا شبہ یقین میں بدل دیا کہ بدروہیں اصلی نہیں ہیں اور میں نے آپریشن کے لئے تھانے سے فورس طلب کر لی۔ تلاشی کے دوران وہاں سے بانو کی لاش سلامت ملی۔ میری طرف متوجہ ہونے کے سبب انہیں لاش کو چہرے نہ بھاننے اور دل گردے کیجی وغیرہ نکالنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اصرار اور احمق کی لاشوں سے نازک اعضاء نکالنے کے بعد انہیں عمارت کے اندر ہی دفنایا گیا تھا۔“

پھر میرے اشارے پر سپاہیوں نے ڈاکٹر مارٹن کے سر اور چہرے سے کفن ہٹایا اور اخباری فوٹو گرافرز اس کی تصویریں بنانے لگے۔ اگلے دن اخبارات کی ہیڈ لائن اس واقعہ کے متعلق تھی۔ اس آپریشن کا ہیرو مجھے یعنی انکسٹر کا شف لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر مارٹن کو عدالت میں پیش کیا گیا اور عدالت نے اسے پھانسی کی سزا سنائی۔



جانب کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں سرکاری زیور تھے اور دو سپاہی اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ اس بدروح نے کفن کے نیچے انگریزی سوٹ پہنا ہوا تھا۔

”اس بدروح کا نام ڈاکٹر مارٹن ہے اور یہ دیسی عیسائی ہے۔“ میں نے رپورٹرز کو بتایا۔ ”اس کا گھر نیگم کوٹ میں ہے۔ اس نے انسانی اعضاء کی اسمگلنگ کا منصوبہ بنایا اور اس ویران ریٹ ہاؤس کے تہہ خانے میں آپریشن تھیٹر قائم کیا۔ پھر اس نے اپنے مذہب کے چھ سات آدمیوں کو ساتھ ملا دیا اور اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ اس کے لئے انہوں نے قبرستان سے تازہ دفن شدہ لاشیں چوری کرنا شروع کر دیں۔ یہ رات کے وقت کفن پہن کر بدروہوں کی مانند قبرستان میں جاتے اور وہاں سے تازہ لاش نکال کر قبر کو بند کر دیتے۔ ریٹ ہاؤس کی عمارت میں انہوں نے ایک بیکر نصب کر رکھے تھے جن کے ذریعے ٹیپ شدہ چیخ و پکار نشر کی جاتی تھی۔ گزشتہ دنوں انہوں نے وقت بچانے کے لئے اصغر کی لاش نکالنے کے بعد کھلی چھوڑ دی تھی جس سے لوگوں کو پتہ چل گیا کہ لاش چوری کر لی گئی ہے۔ معاملہ ہم تک پہنچا تو ہمارے لئے یہ کیس ایک چیلنج بن گیا۔“

میں نے صحافیوں کو اپنی تحقیقات سے آگاہ کیا اور مجرموں کے اڈے پر جو واقعات پیش آئے تھے، وہ بھی بیان کر دیئے۔ ”آپ کو کس مرحلے پر احساس ہو ا کہ بدروہیں اصل نہیں ہیں یا یہ کفن پوش زندہ انسان ہیں؟“ ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

”اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں نے قبر کھودنے والے کے ہاتھ میں کدال دیکھی۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”ہم سب سمجھتے ہیں اور بزرگوں سے بھی سنتے آئے ہیں کہ روح کا کوئی مادی جسم نہیں ہوتا اور جسم سے نکلنے کے بعد وہ دنیاوی ضروریات اور مسائل سے بے نیاز ہو جاتی ہیں۔ اسے کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ قبرستان میں پہلی رات بدروہوں نے مجھے مخاطب کیا اور مجھے قبرستان سے بھاگ جانے کا حکم دیا تھا۔ دوسرے

تھے۔ اور یہ لیکچر آج رضوان کاشف کو دے رہا تھا۔ جو اس بات کو مانتا ہی نہ تھا کہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی یہ جن بھوت یا چڑھیلں وغیرہ ہیں۔ بلکہ کاشف تو جن بھوت کے وجود سے ہی منکر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ جن بھوت قصے کہانیوں میں ٹھیک لگتے ہیں۔ ان چیزوں کا اس دور میں وجود ہے ہی نہیں۔

کاشف رضوان کی بات پوری ہونے کے بعد بولا۔ ”یہ بات نہیں کہ میں قرآن پاک کا منکر ہوں۔ لیکن یہ تو بھی سوچ کہ اس زمانے میں جبکہ انسان نے اتنی ترقی کی ہے کہ اب تو ماشاء اللہ سائنس دان چاند پر پہنچ رہے ہیں۔ اور اتنے ترقی یافتہ دور میں کون پاگل کا بچہ ایسی بات اپنے منہ سے نکالے گا کہ میں نے جن بھوت یا چڑھیلں کو دیکھا ہے۔ اور ہاں تجھے تو پتا بھی ہے کہ میں تقریباً روزانہ رات کو ویرانوں میں پھرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا کام یہ کچھ ایسا ہے کہ کبھی کبھتوں میں پانی لگانا، کبھی پہرا دینا۔ تو بھائی میں نے آج تک ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔ اس سے یہ اندازہ لگاؤں کہ یہاں جنوں بھوتوں یا چڑھیلوں کا بئیرا ہے۔“ یہ بات کاشف رہ رہا تھا۔ جس سے تقریباً دو گھنٹوں سے رضوان مغز ماری کر رہا تھا۔

اور اس کا مطلب ہے کہ تو اس بات کو بالکل نہیں مانے گا کہ قوم جنات کا وجود آج بھی ہے۔ لیکن بھی بات تو یہ ہے کہ میں اس قوم کو مانتا ہوں۔ کیونکہ ایک مشہور واقعہ جو میں نے.....“

”ہاں ہاں پتا ہے! اب تو یہ کہے گا کہ یہ واقعہ مجھے میرے ماموں یا میرے دوست نے سنایا ہے۔ بھئی اگرچہ مانے تو تیری کوئی بھی جھوٹی کہانی نہیں سنوں گا، اور اگر یہ سناؤں گا تو پھر بھی میں اعتبار نہیں کروں گا.....“ کاشف نے رضوان کی بات کو بیچ میں کاٹ کر کہا۔

کاشف کا بھائی آصف جو ابھی تک ان دونوں کی گفتگو کے درمیان بت بنا بیٹھا تھا۔ ایک دم بول پڑا۔ اور کہنے لگا۔ ”یار! رضوان تو مجھے سنا کر کوئی واقعہ تیرے ذہن میں ہو۔ اور رضوان تجھے پتا بھی ہے کہ بڑے بھائی

کبھی بھی تیری بات کا اعتبار نہیں کریں گے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہے کہ بھائی کاشف جب بھی اپنی ضد پر آجاتا ہے تو پھر اس پر کسی کی بات کا اثر نہیں پڑتا۔ حالانکہ قرآن پاک میں تو اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ..... میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اتنے بڑے ثبوت کے بعد جب کہ قرآن پاک میں اور بھی اللہ تعالیٰ کے کافی ارشاد اس کی گواہی دے رہے ہیں کہ اس زمین پر قوم جنات کا وجود ہے اور سورۃ جن میں دیکھو کیا بتایا گیا ہے۔ اگر اب بھی کوئی اور نہ مانے تو بھی سوائے اس کے ایمان پر شک کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ اور اتنے بڑے ثبوتوں کے بعد بھی کوئی نہ مانے تو اس کا اللہ حافظ ہے۔“

”تو سنائیں سنوں گا۔ سچ مجھے برا مزہ آتا ہے۔ ایسے پر اسرار قصے اور کہانیاں سن کر.....“ کاشف نے کہا۔ ”بھئی میں تو چلا۔ تم جانو تمہارا کام جانے۔ مجھے نہیں سننی ایسی اٹنی سیدھی باتیں۔ اور ہاں رضوان صاحب اگر ہو سکے تو آخر میں بھائی آصف کو ایک پری بھی دکھا دیتا۔“ اتنا کہہ کر کاشف جیسے ہی اٹھنے لگا تو آصف نے کاشف سے کہا۔ ”کاشف بھائی اگر آپ کو یقین نہیں تو ناسی کی کم از کم میری خاطر ہی بیٹھیں ساتھ چلیں گے۔ مجھے ڈر لگے گا۔ اکیلے جاتے ہوئے.....“ اور پھر کاشف نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے چھوٹے بھائی آصف کی خواہش پر بیٹھ گیا۔ اور رضوان سے کہنے لگا رضوان ذرا جلدی لیکن مجنوں کی داستان ختم کرنا کیونکہ ابھی مجھے کھیتوں میں بھی جانا ہے۔“

رضوان نے کہا۔ ”کاشف مجھے پتا ہے۔ بلکہ یقین ہے کہ تو میری باتوں پر اعتبار نہیں کرے گا۔ پھر بھی ایک بات میں بتاؤں کہ یہ مخلوق جو ہمارے آس پاس ہی موجود ہے وہ پہلے تو ہمارے سامنے نہیں آتی۔ ہاں اگر کوئی ان کو تنگ کرتا ہے، تو پھر یہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اس کا ایسا حشر کرتی ہے کہ آدمی قیامت تک اس کا عذاب یاد کرتا ہے۔ اور یہاں تک کہ دیکھا اور سنا گیا ہے کہ جو بھی ان کو تنگ کرتا ہے یہ مخلوق اس کے خاندان

تک کو ختم کر دیتی ہے۔ یہ ایسی ضدی مخلوق ہے کہ کیا بتاؤں..... لیکن ان میں کچھ اس قسم کے جن موجود ہیں جو اس پسند ہیں.....“ ”چھوڑ بھئی! مجھے معاف ہی کر! تو بھائی آصف کو سنا جو بھی جھوٹ تیرے پاس ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ۔ اور ویسے بھی میں آصف کی ضد کی وجہ سے بیٹھ گیا ہوں۔ ورنہ میں تو کب کا جا چکا ہوتا۔“ کاشف نے رضوان کو ٹھٹھکتے ہوئے کہا۔

”بھائی رضوان آپ بڑے بھائی کی باتوں کا برا مت مانو۔ آپ مجھے سنا میں سن رہا ہوں۔“ آصف نے اپنے بڑے بھائی کی بات پوری ہونے کے بعد کاشف کی طرف سے معذرت بھی کی اور ایک مرتبہ پھر رضوان سے فرمائش کر دی۔ لیکن رضوان بھی آج اپنی ضد منوانے کے موڈ میں تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ تو کاشف کو جن دکھانے کے چکر میں تھا۔ اور اس لئے وہ کاشف کی کسی بھی بات کا برا نہیں مان رہا تھا۔ اور وہ کاشف کی بات کو نہایت سکون کے ساتھ سنتا اور پھر کوئی نہ کوئی دلیل اس کے سامنے رکھ دیتا، جس کو کاشف کا ذہن پتا نہیں کیوں تسلیم ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ رضوان کی بات کو پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیتا۔ اور اپنی طرف سے تو اس کی یہی توشیح تھی کہ کسی طرح رضوان تنگ آ کر کوئی واقعہ نہ سنائے اور ان دونوں بھائیوں کو جانے دے۔

لیکن رضوان اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتا۔ اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب بھی تھا۔ کیونکہ رضوان کے ساتھ آصف بھی تو تھا۔ اور پھر رضوان نے ایک واقعہ سنانا شروع کر دیا۔ جو کچھ اس طرح تھا کہ..... ”عثمان نامی ایک شخص جو ہمارے گاؤں کا ہی رہنے والا تھا۔ اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ تیری ہی طرح کاشف صاحب رات کو کھیتوں میں پہرہ دیتا تھا اور بھئی پانی لگاتا ہوتا تھا۔ وہ بے چارہ اکیلا آدمی تھا۔ اس کا ایک بھائی بھی تھا لیکن وہ بچپن کی عمر میں ہی انتقال کر گیا تھا۔ اس لئے عثمان بے چارہ اکیلا رات کو اپنے

کھیتوں میں پہرہ دیتا تھا۔ کیونکہ اس کے کھیت گاؤں سے کافی دور تھے۔ اور ان کھیتوں کے قریب ہی ایک جنگل چھوٹا سا تھا۔ جس میں جانور وغیرہ تھے جو ظاہر ہے رات کو رزق کی تلاش میں نکلتے تھے۔ اور پھر عثمان کے کھیتوں کی حالت ابتر کر دیتے تھے اس لئے وہ بے چارہ ساری رات چاہے سردی ہو، برسات ہو یا کچھ بھی ہو لیکن وہ بندہ خدا کا کھیتوں میں پھر رہا ہوتا تھا۔

جس علاقے میں عثمان کے کھیت تھے وہ علاقہ صدیوں سے غیر آباد پڑا تھا۔ یعنی انسانوں کی آبادی سے کافی دور تھا۔ اور وہاں کچھ کھنڈرات بھی تھے۔ اور ایک پرانی مسجد کے آثار بھی تھے جو آباد نہ ہونے کی وجہ سے بالکل کھنڈر بن گئی تھی۔

اس مسجد کے بارے میں بلکہ اس پورے علاقے کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ علاقہ آسب زدہ ہے اس لئے ہر وقت یہاں ویرانی کا راج تھا اور بالکل سناٹا وغیرہ آباد علاقہ تھا۔ لوگ یہاں رات تو دور کی بات دن کو بھی کم ہی جاتے تھے۔ وجہ وہ آسب حالانکہ اتنی ویرانی ہونے کے باوجود عثمان بے چارہ مجبوراً اس پر اسرار اور ویران کھنڈروں کے پاس ساری رات پہرہ دیتا تھا۔ اور لوگ اس بات پر حیران بھی تھے کہ اتنے پر اسرار اور خوفناک علاقے سے عثمان زندہ واپس کیسے آتا ہے۔ اور کچھ لوگوں نے ازراہ ہمدردی عثمان کو کہا بھی کہ ان کھیتوں کو چھوڑ کوئی اور کاروبار کرلو، ورنہ خوفناک اور پر اسرار کھنڈرات سے تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔ اور کون جانے گا تمہاری لاش لینے ان جنوں سے۔

عثمان کہتا۔ ”آخر میں کون سا کاروبار کروں مجھے تو کسی اور کاروبار کا تجربہ ہی نہیں ہے۔ اور نہ تو اگر میری ان کھنڈروں میں لکھی ہوئی ہے تو وہ ضرور آئے گی۔ ویسے بھی مجھے ان کھنڈروں کے بارے میں تحقیق کرنے کا کوئی شوق بھی تو نہیں میں تو اپنے کھیتوں میں ساری رات کام میں لگا رہتا ہوں۔ مجھے کیوں جن یا بھوت تنگ کریں گے۔“

اور ہاں کاشف صاحب! اب بھی وہ علاقہ ایسے

آپ کے نام

مالک نوکر سے: ”یہ خط کس بے وقوف

نے لکھا ہے؟“

نوکر: ”جناب آپ کے بیٹے نے۔“

مالک: ”کس بے وقوف کے نام لکھا

ہے؟“

نوکر: ”جناب آپ کے نام پر۔“

(شمالہ حماد۔ سرائے سدھو)

کاشف کہنے لگا: ”چل چھوڑ! تو تو جان ہی نہیں
چھوڑ رہا، خیر اپنی داستان غم سنا۔“

یہ الفاظ کاشف نے ٹوکنے کے انداز میں کہے۔

اور رضوان پھر سوچوں میں گم ہو گیا تو کاشف کہنے لگا۔

”کیوں بھائی آگے جھوٹ نہیں رہا جو خاموش“ ہو گیا۔

رضوان نے کہا۔ ”نہیں یہ بات نہیں، میں تو

سوچ رہا ہوں کہ بات کہاں چھوڑی تھی۔“

تو کاشف جھٹ سے بولا۔ ”تو تم نے کہا کہ اس

جن نے کہا کہ ہم قوم جنات سے تعلق رکھتے ہیں۔“

”ہاں یاد آیا۔“ تو جن نے مزید کہا کہ۔

”اللہ کے فضل و کرم سے ہم مسلمان جن ہیں۔

بالکل ایسے جیسے آپ اللہ کو ایک مانتے ہیں، ویسے ہی ہم

بھی اللہ کو ایک مانتے ہیں اور ہاں! یہ الگ بات ہے کہ

تم انسانوں کی طرح ہماری قوم میں بھی فتنے فساد والے

کچھ قبیلے موجود ہیں جو شیطان کی اور آگ! سورج کی

پوجا کرتے ہیں لیکن ہم الحمد للہ۔ اللہ کی عبادت کرتے

ہیں۔ اور اللہ کی ذات سے ڈرتے بھی ہیں اور یوم

حساب پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد اللہ

تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں گے۔ اور نبی آخر

الزمان ﷺ پر بھی ایمان رکھتے ہیں آپ پر درود بلی

پڑھتے ہیں۔ یہ باتیں میں اس لئے بتا رہا ہوں کہ پھر

سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی آواز بہت

ہی اچھی اور پیاری ہے اس لئے مجبور ہر کرم یہاں ٹھہر

گئے۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ڈرنا تو اس اللہ

سے چاہیے جس نے انسانوں کو مٹی سے اور جنوں کو

آگ سے پیدا کیا ہے پھر آپ کو کوئی نقصان نہیں

پہنچائیں گے۔“

جب اس جن نے یہ آخری الفاظ کہے تو عثمان کو

کچھ سکون ملا۔ اور ڈرتے ڈرتے اس جن سے پوچھا کہ

”آپ کا نام کیا ہے؟“

تو اس جن نے جواب دیا۔ ”میرا نام اسماعیل

ہے اور اللہ کے فضل سے میں نے چارج بھی کئے ہیں

۔ ہم تقریباً دو سو سال سے اس علاقے میں رہ رہے

تو دکھتا، وہ بے چارہ خاموش بت بنا کھڑا رہا اور متلاشی
نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اور پڑھنا بھی
بند کر دیا تھا ڈر کی وجہ سے اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ
کیا کرے۔ اس مصیبت سے تو آج پہلی مرتبہ اس کا
سامنا ہوا تھا، ابھی وہ ڈری ہوئی نظروں سے چاروں
طرف گھور رہا تھا کہ خدا نخواستہ اگر کچھ ہو تو نظر آجائے۔
لیکن وہاں اندھیری رات، سنان علاقہ اور جنگل کے
علاوہ کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔

ابھی وہ خاموشی سے سوچ رہا تھا کہ کیا کرے
اتنے میں آواز آئی جو بالکل سامنے کی طرف سے آئی،
کوئی کہہ رہا تھا کہ ”آپ کی آواز سن کر آئے ہیں بڑی
پیاری آواز ہے آپ کی، بڑا ہی اچھا انداز ہے آپ
کے پڑھنے کا۔“

آواز تو آ رہی تھی لیکن آواز والی ہستی کا دور دور
تک نام و نشان نہ تھا۔ اور عثمان بے چارہ اپنے سامنے
کسی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن سوائے اندھیرے
کے اس کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اچانک آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی آواز والی
ہستی عثمان سے کہہ رہی تھی کہ ”بھائی کیا دیکھنے کی کوشش
کر رہے ہیں آپ کو نظر نہیں آئیں گے کیونکہ ہمارا تعلق
قوم جنات سے ہے۔“

اچھا تو اس وقت عثمان کے ساتھ تھا یا عثمان نے
تجھے خواب میں یہ داستان سنائی ہے، تو تو ایسے بتا رہا ہے
جیسے یہ سارا واقعہ تیرے سامنے ہوا ہو۔“ کاشف جو ابھی
تک رضوان کو تنگ کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ یہ بات
کاشف نے رضوان کی بات پوری ہونے کے بعد کی۔

تو رضوان نے کہا۔ ”نہیں میں ساتھ تو نہ تھا اور
ناہی عثمان نے خواب میں مجھے بتایا۔ بلکہ یہ بات تو
سارے گاؤں والوں کے علم میں ہے کہ اس ویران
علاقے میں عثمان کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے تھے
یہ باتیں جن لوگوں نے انہیں ان میں کچھ تو بے
چارے مر گئے ہیں اور کچھ اپنی زندگی کی گاڑی کو دھکیل
رہے ہیں۔“

یہ غیر آباد پڑا ہے۔ کسی کو پتا نہیں وہاں کون آباد تھے اور
کب سے وہ علاقہ غیر آباد ہوا کسی کو پتا نہیں! ہاں البتہ
اتنا پتہ ضرور ہے کہ وہ جو کوئی بھی تھے لیکن تھے مسلمان
کیونکہ اس علاقہ میں جو مسجدیں اس سے تو یہی لگتا تھا کہ
وہ لوگ تھے مسلمان۔ اور ہاں ایک چھوٹا سا قبرستان بھی
ہے۔ جس میں مشکل سے آٹھ یا دس قبریں آج بھی
موجود زیادہ پتا نہیں وہاں اور کتنی قبریں بھی ایک مرتبہ
میں بھی اس قبرستان کے پاس سے گزرتھا۔“

”چھوڑو یار تو سنا کیوں مجھے تنگ کرنے کے
چکر میں ہے۔“ کاشف۔ رضوان کی بات پوری ہونے
کے بعد بولا۔ اور رضوان پھر شروع ہو گیا۔

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ عثمان وہاں پر پہرہ دیتا
تھا۔ عثمان کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ جب بھی اکیلا
ہوتا تو اس کی زبان پر قرآنی آیتوں اور سورتوں کا ورد
ضرور ہوتا تھا۔ چاہے دن ہو یا رات لیکن اس کی یہ
عادت کبھی تھی اور اسی وجہ سے لوگ اس کی عزت بھی
کرتے تھے۔ شاید اسی لئے وہ اپنے کھیتوں میں سے
زندہ واپس آتا تھا۔

ایک رات حسب معمول وہ اپنے کھیت میں پانی
لگا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کلام پاک کا بلند آواز میں ورد
بھی اس کی زبان پر جاری تھا۔ کہ عثمان کو، اپنے قریب
سے آوازیں آنے لگیں ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے قریب میں
کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوں ان کی آوازیں سن
کر عثمان کو تو پسینہ آ گیا کیونکہ آوازیں بالکل قریب سے
آ رہی تھیں اور دیکھنے میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

وہ بیچارہ ایک تو اکیلا اور دوسری بات یہ کہ جس
کھیت میں وہ پانی لگا رہا تھا اس کے بارے میں وہ اچھی
طرح سے جانتا تھا کہ یہ آسب زدہ علاقہ ہے۔ اس
لئے اس بے چارے کا ڈر نا جائز تھا۔ اور مزے کی بات
یہ تھی کہ رات کا وقت اور وہ بھی اندھیری رات آبادی
سے کافی دور کون اس وقت اس بے چارے کی مدد کرنے
کو آتا۔ سوائے اللہ کے۔

سو وہ بے چارہ لگا ادھر ادھر دیکھنے۔ لیکن کچھ ہوتا

ہیں۔ ہم جب سے اس علاقے میں آباد ہوئے ہیں یہ
علاقہ اسی طرح ویران اور سنان پڑا ہے۔ حالانکہ
ہماری نظر میں یہ علاقہ آباد ہے لیکن انسانوں کی نظر
میں یہ علاقہ خوفناک کھنڈرات میں شامل ہے۔
بہر حال ہم جب سے اس علاقے میں آئے یہ علاقہ
ویرانی میں ڈوبا ہوا ہے۔

میرے قبیلے والوں کو یہ علاقہ بہت ہی مناسب
لگا کیونکہ اس جگہ دو خاص چیزیں ایسی تھیں جن کی وجہ
سے ہم یہاں رہنے پر مجبور ہو گئے۔ ان دونوں میں
سے ایک تو یہ ویرانی تھی۔ یعنی انسانوں کی آبادی کافی
دور چونکہ ہمیں ویرانوں میں رہنے کا حکم ہے۔ اسی
لئے ہی یہاں پر آباد ہو گئے۔ اور دوسری خاص چیز
ہماری توجہ کا مرکز بنی۔ وہ بھی یہ سامنے والی مسجد، یہ مسجد
پتا نہیں کتنے سالوں سے غیر آباد اور ویران پڑی تھی۔
ہم نے سوچا کہ چلو خدا کا گھر ہے۔ اس کو بنانے والے
ختم ہو چکے ہیں۔ یا کہیں اور جا چکے ہیں۔ تو کیوں نہ
ہم خدا کے اس گھر کو آباد کریں۔ اور پھر ہم اس مقصد
کے لئے یہاں آباد ہو گئے۔ اللہ ہمارے مقصد کو قبول
فرمائے۔“

عثمان کی آئین کے ساتھ ان کی آوازیں بھی
بلند ہوئیں، یعنی ان جنوں نے جو اسماعیل کے ساتھ تھے

آمین کہا۔

عثمان نے کہا۔ ”آپ کتنے لوگ اس وقت آئے ہیں۔“

تو اسماعیل نے کہا کہ اس وقت میرے ساتھ میرے قبیلے کے پانچ جن اور موجود ہیں۔ ہم ساتھ والے قبیلے کے پاس سے آرہے ہیں۔ کچھ ضروری مذاکرات کرنے گئے تھے۔ کیونکہ یہ جن ہماری برادری کے جنوں کو تنگ کرتے ہیں۔ اور اس قبیلے کے ساتھ ایک بڑا جادوگر بھی ہے۔ اس لئے ایک سردار ہونے کے ناطے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ اپنے قبیلے کی حفاظت کرنا، اور ہم واپس جارہے تھے کہ آپ کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی اس لئے ہم رک گئے۔ ہم اسن پسند جن ہیں۔ ہمیں جو بھی تنگ کرتا ہے تو پہلے اس کو درگزر کرتے ہیں۔ لیکن جب دیکھتے ہیں کہ تنگ کرنے والا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ تو میں اپنے قبیلے میں سے ایک دو جوان بھیجتا ہوں اور اس کے ساتھ خاص کر یہ تاکید بھی کرتا ہوں کہ کسی کو جانی و مالی نقصان نہ پہنچائیں۔ اور تھوڑا سا ڈرا دھمکا کر واپس آجائیں۔ تاکہ آئندہ وہ ایسی کوئی حرکت کرنے سے دور رہے۔ لیکن آج تک میرے قبیلے والوں کو آپ کے گاؤں یا آپ کے آس پاس گاؤں والوں سے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ ہاں باقی جو قبیلے ہیں۔ ان میں شرانگیز جن موجود ہیں۔ اور سب سے بڑی بات کہ ان کے ساتھ شیطانی طاقت بھی ہوتی ہے۔ ان کا کام ہے کہ اس دنیا میں شیطانی حکومت ہو۔ اور وہ اسی ارادے سے اس دنیا میں تم انسانوں کی دنیا میں آتے ہیں اور ان کا ارادہ ہوتا ہے کہ اصل دنیا میں ان کی حکومت ہو اور اسی غرور اور تکبر کی وجہ سے وہ اکثر انسانوں کی آبادیوں میں نکل جاتے ہیں اور ان کا ارادہ ہوتا ہے کہ کوئی انسان ان کو تنگ کرے اور وہ اس کو ایسا سبق سکھائیں کہ اس کی آنے والی تسلیں تک یاد کریں، اور پھر وہ انسانوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے رہتے ہیں۔ اور پریشان کرتے رہتے ہیں۔ جس

میں کبھی تو بے چارے انسان کام میں آجاتے ہیں۔ اور کبھی یہ شیطان چھن جاتے ہیں۔ اور وہ بھی انسانوں کی طرح جیسے انسان بے چارے ان شیطانوں سے تنگ آکر ان سے معافی مانگتے ہیں۔ ویسے ہی وہ جن بھی اس عامل سے جس کے یہ قبضے میں ہوتے ہیں۔ اس سے زندگی کی بھیک مانگتے ہیں۔

اور کوئی عامل اس سے قول و اقرار کر کے ان کو آزاد کر دیتا ہے۔ لیکن اکثر ضدی جن جو غرور کی وجہ سے اس عامل سے معافی نہیں مانگتے وہ ٹرپ ٹرپ کر اور سسک سسک کر دم دوڑ دیتے ہیں۔

اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے جب یہ علم ہوتا ہے کہ فلاں قبیلہ کا جن انسانوں کو تنگ کرتے کرتے اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ تو مجھے ایک قسم کا سکون محسوس ہوتا ہے لیکن خوشی کے ساتھ ساتھ یہ خوف بھی رہتا ہے کہ جس عامل نے اس شیطان کو اپنے انجام تک پہنچایا ہے۔ اس شیطان کے دوست یا رشتے داروں میں سے کوئی بھی اس عامل کو یا اس کے خاندان والوں میں سے کسی سے بدلہ لینے کی کوشش کرتے ہیں اس میں کچھ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن بعض کا انجام بہت ہی برا ہوتا ہے۔“

”ارے! پتا نہیں میں کیا کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ اسماعیل نے بات پوری کرنے کے بعد یہ جملہ کہا اور عثمان سے کہا۔ ”آپ اپنا نام تو بتائیں۔“

تو عثمان نے کہا۔ ”میرا نام محمد عثمان ہے۔ ادھر میرے کھیت ہیں۔ میں روزانہ رات کو اپنے کھیتوں میں پہرہ دیتا ہوں۔ اور کبھی پانی لگاتا ہوں۔ اور میری یہ عادت ہے کہ جب بھی میں اکیلا ہوتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کے کلام کی تلاوت کرتا ہوں۔ میں نے قرآن پاک حفظ کیا ہوا ہے۔ اور اللہ کے کلام کی برکت سے میرے کھیتوں میں برکت بھی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ میرے کھیت اس خوفناک جنگل میں ہیں۔ لیکن فصلیں تمام اچھی اگتی ہیں۔ یہ سب میرے مالک کے کلام کی وجہ سے ہے۔ میرا اس میں کوئی کمال نہیں ہے، میرا کام

ہے اچھا بیج اور اچھی کھاد زمین میں ڈالنا، باقی کام تو میرے پروردگار کا ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خالق کائنات نے کبھی بھی مجھے مایوس نہیں کیا۔ الحمد للہ ہر سال میری فصل اس سارے علاقے یعنی میرے گاؤں والوں کی فصل سے اچھی ہوتی ہے۔ آج بھی میں اپنی فصل کو پانی لگا رہا تھا کہ آپ کی آوازن کر میں خاموش ہو گیا۔

اسماعیل جن نے عثمان کی بات سن کر بولا۔ ”عثمان صاحب اگر ناراض نہ ہوں تو ایک عرض کروں۔“ عثمان بے چارہ جو کافی دیر سے ان جنوں کے دم و کرم پر تھا وہ بے چارہ کیا جواب دیتا۔ وہ کہنے لگا۔ ”اسماعیل صاحب میں بھلا آپ کی بات سے کیوں ناراض ہوں گا۔“

تو اسماعیل جن نے کہا۔ ”آپ کے کھیت میں میرے قبیلے کے کچھ جوان پہرا دیں گے اور آپ ہمارے بچوں کو قرآن پاک پڑھانا۔ جو بھی ہم سے ہوا ہم آپ کی مدد کریں گے۔ باقی حقیقی معاوضہ تو اللہ ہی دے گا۔“

عثمان نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں آپ کو آپ کے بچوں کو قرآن پاک پڑھاؤں گا اور وہ بھی خالص اللہ کی رضا کی خاطر پڑھاؤں گا۔ اور اس کا معاوضہ میں طلب نہیں کروں گا۔ باقی میری شرط ہے۔ اگر آپ میری شرط پر پوری طرح اترتے ہیں تو میں انشاء اللہ تعالیٰ بچوں کو قرآن پڑھاؤں گا۔“

اسماعیل نے کہا۔ ”ویسے تو اسلام نے شرط پر پابندی لگادی ہے لیکن آپ بتائیں آپ کی کیا شرط ہے؟“

عثمان نے کہا۔ ”میری شرط یہ ہے کہ آپ یا آپ کے قبیلے والوں میں سے کوئی بھی میرے سامنے ڈروانی شکل میں نہ آئے۔“

اسماعیل نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے یہ شکایت نہیں ہوگی ہمیں آپ کی یہ شرط منظور ہے۔ اور اس دن کے بعد عثمان روزانہ رات کو کھنڈروں میں

جنوں کے بچوں کو قرآن شریف پڑھانا جاتا تھا۔ اور یہ بات تو تقریباً ہر کسی کے علم میں ہے اور اسماعیل کے قبیلے کے جن عثمان کے کھیتوں میں پہرہ دیتے تھے اور جن لوگوں نے یہ پہرہ دیکھا ان میں سرفہرست وہ بوڑھا شاکر جو کاشف صاحب تمہارے دادا کا دوست ہے۔“

وہ کہتا ہے کہ ”ایک مرتبہ جب میری عمر مشکل سے سولہ یا سترہ برس کی تھی میں دن کے وقت تقریباً سوا بارہ کا ٹائم تھا۔ عثمان کے کھیتوں میں سے گزرا تو میں نے کچھ گھڑسواروں کو دیکھا جو پورے کھیت کو چاروں طرف سے اپنے کھیرے میں لئے ہوئے بھی ادھر تو بھی ادھر پورے کھیت میں چکر لگا رہے تھے۔“

دور ہونے کی وجہ سے ان کے چہروں کو پہچان نہ سکا۔ میں سمجھا کہ کوئی چور یا ڈاکو ہیں جو ان کھنڈروں میں چھپے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ دن کے وقت کھنڈر سے باہر کیا کر رہے ہیں۔ میں چھپتا چھپاتا اس جنگل سے نکلا اور انہی سوچوں میں گھرا ہوا تھا کہ یہ کون ہیں؟ اور پھر میں نے سوچا کہ یہ تو چچا عثمان کے کھیت کے پاس ہی چکر لگا رہے تھے۔ مجھے چچا عثمان کو ابھی سے بتادینا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ چچا عثمان رات کو کھیتوں میں جا پہنچے اور یہ ڈاکو ان کو مار ڈالیں۔“ اور پھر میرا رخ چچا عثمان کے گھر کی طرف تھا۔ میں دوڑتا ہوا چچا عثمان کے گھر پہنچ گیا۔ دیکھا تو چچا سو رہے تھے۔ میں نے آواز دی۔ ”چچا عثمان..... چچا عثمان.....“ جلدی جلدی ان کو اٹھانے لگا۔ میں بھاگتا ہوا آیا تھا اس لئے میری سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ چچا عثمان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور پوچھا۔ ”شاکر بیٹا! خیر تو ہے۔ تو پریشان کیوں ہے؟“

اور پھر میں نے چچا عثمان کو سارا واقعہ سنا دیا اور آخر میں کہا۔ ”چچا میرا پانی کر کے آج آپ کھیتوں پر نہ جانا کہیں وہ ڈاکو آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ کیونکہ وہ سارے گھوڑوں پر سوار تھے اور وہ آپ کے کھیتوں کے چاروں طرف دن دھاڑے بے خوف و خطر چکر لگا



ڈیٹھ ہاؤس

احسان سحر - راولپنڈی

اچانک کئی ڈھانچے نمودار ہو گئے اور نوجوان سے مخاطب ہوئے جلد ہی تم بھی ہم سے آن ملو گے ہم تمہیں اپنی دنیا میں خوش آمدید کہیں گے، غم نہ کرو ایسے غم سے کیا فائدہ جس سے تمہاری جان آزاد نہ ہو سکے اور پھر تمہیں.....

خوف و دہشت کے شکنجے میں جکڑنے والی ایک ماورائی مخلوق کی لرزہ خیز داستان نیرت

یہ ان ایام کا قصہ ہے جب میں جوان تھا اور مرچنٹ نیوی میں سیل تھا اور ”سی لنگ“ نامی ایک مال بردار جہاز پر کام کرتا تھا جو ایک برطانوی نژاد فلپائنی مسٹر ایف نیگروس کی ملکیت تھا۔ یہ ایک پرانا اور سال خوردہ جہاز تھا جسے اب کباڑیوں کے ہاتھ بیچ دینے کی ضرورت تھی، مگر ماسٹر ایف نیگروس اسے اس وقت تک سمندر کے سینے پر بوجھ بنائے رکھنا چاہتا تھا جب تک سمندر خود

کرتا ہوں کہ کوئی جن یا بھوت یا چیز مل آئے اور وہ مجھے اپنی شکل دکھائے تاکہ مجھے بھی یقین ہو جائے کہ اس دنیا میں اس مخلوق کا وجود ہے۔“

”ضرور! ضرور! اے نوجوان تیری خواہش پوری ہوگی، اور میں حاضر خدمت ہوں، میں تیری کیا خدمت کروں؟“ اس آواز نے تینوں کے ہوش اڑا دیئے۔ اور اس آواز کی وجہ سے تینوں خاموش ہو گئے۔ اور لگے ایک دوسرے کا منہ تکتے.....

”کاشف اگر ہم اپنی ضد پر آجائیں تو ضرور شکل دکھاتے ہیں۔ اور اب تو تمہاری فرمائش کو مد نظر رکھتے ہوئے میں تمہارے سامنے حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہوں، اور ہاں اگر تم اجازت نہ بھی دو تب بھی میں حاضر ہونے کی بڑی غلطی کروں گا۔ تاکہ تمہیں یقین آجائے۔“ اس آواز نے پھر ایک بار ان تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اور اس کا خاص نشانہ کاشف ہی تھا۔ آواز ایک بار پھر آنے لگی۔

کاشف میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ میں نے اپنا نام سنا اور پھر اپنا نام سن کر میں ٹھہر گیا اور تمہیں پتا چلے کہ تمہارے علاوہ بھی اس دنیا میں بہت کچھ ہے۔“ اور ان تینوں کے سامنے ایک ہیولا ظاہر ہونے لگا۔ اس ہیولے نے خوفناک شکل اختیار کر لی اور پھر ان تینوں کے سامنے ایک خوفناک شکل والا جن کھڑا تھا۔ جس کا ٹارگٹ خاص کر کاشف ہی تھا، اور وہ جن کاشف کو کہہ رہا تھا۔

”کاشف یہ حقیقت ہے، اس دنیا میں قوم جنات موجود ہے۔ جس کا بچتا جاگتا ثبوت اس وقت تمہارے سامنے موجود ہے۔ اور ہاں ایک بات اور کہ اسماعیل میرا ہی نام ہے۔“

لیکن کاشف تو اس کی شکل دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔ اور آصف رضوان کے ساتھ چپکا بیٹھا تھا اور رضوان مسکرا رہا تھا۔ کیونکہ کاشف کو ثبوت مل چکا تھا۔



رہے ہیں۔“

تو چچا عثمان منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگے۔ جس کا مطلب میں نے یہ نکالا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ..... ”اچھا تو اب یہ دن کو بھی پہرہ دینے لگے ہیں۔“ اور پھر جیسے میری موجودگی کا احساس ہو گیا اور چچا عثمان یکدم خاموش ہو گئے۔

میں نے پوچھا۔ ”چچا کون سا پہرہ؟“ تو چچا جو پتا نہیں کس سوچ میں گم تھے۔ چونک کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں نے تم سے کچھ کہا ہے کیا؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں آپ نے کہا کہ اچھا اب یہ دن کو بھی پہرہ ادا دینے لگے ہیں۔ چچا یہ کون سا پہرہ ہے۔ جس نے آپ کو اتنا پریشان کر دیا ہے۔“ پہلے تو چچا عثمان ٹال ٹال سے کام لینے لگے۔ لیکن شاکر کہتا ہے کہ ”میرے بار بار اصرار پر چچا عثمان نے ساری بات بتا دی۔ اور آخر میں کہا۔ ”شاکر بیٹا آئندہ تم بھول کر بھی وہاں نہ جانا۔“

تو شاکر نے کہا۔ ”چچا تو میں ساتھ والا گاؤں جو جنگل کی پرلی طرف ہے اس گاؤں کا کام سے گیا تھا اس لئے واپسی پر یہ واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ لیکن اب تو میری باپ کی بھی تو بے جو آئندہ میں آپ کے کھیتوں میں گیا۔ اور شاکر اٹھ کر اپنے گھر چلا آیا۔

لیکن بقول شاکر کے پھر بھی وہ عثمان کے کھیتوں میں نہ گیا، اور ایک دو اور آدمی بھی ہیں جن کے ساتھ ایسے عجیب و غریب واقعات پیش آئے، جن میں کچھ تو بے چارے مر گئے اور ایک دوزندہ ہیں۔

کاشف صاحب اگر میری بات کسی بات کا بھی تمہیں اعتبار نہ ہو تو کسی سے بھی پوچھ لیتا۔ اور شاکر کی مثال جو میں نے تمہیں سنائی ہے وہ تو تیرے سامنے ہے۔“

کاشف نے کہا۔ ”کوئی ضرورت نہیں مجھے کسی سے پوچھنے کی اور ہاں جیسا کہ تو کہہ رہا تھا کہ ہمارے آس پاس یہ قوم رہتی ہے تو میں اس قوم سے درخواست

سے فنی جانے کے لئے پہلے مشرقی تیور کا رخ کرتے ہیں وہاں سے بحیرہ کورال سے گزرتے ہوئے فنی کی طرف سفر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم نے فلپائن سے نیوگنی کا رخ کیا تھا اور بحر الکاہل سے گزرتے ہوئے جزائر سلیمان اور وہاں سے فنی کا قصد کیا تھا۔ یہ راستہ نسبتاً مختصر تھا اور اسے منتخب کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہمارا جہاز لمبا سفر کرنے کا تحمل نہ ہو سکتا تھا۔

مگر تقدیر کے آگے تدبیر کیا معنی رکھتی ہے؟ ہم نے اپنے تئیں بہل اور محفوظ راستہ چنا تھا مگر وہی ہمارے لئے نہایت پرخطر اور ہلاکت خیز ثابت ہوا، ہوا یوں کہ ہمارے سفر کے دوسرے روز شام کے وقت جب ہم جزائر سلیمان کے قریب پہنچنے والے تھے، یکا یک پرسکون سمندر کے تیور بدلنے لگے۔ مشرق کی طرف تیز ہواؤں کے جکڑ چلنے لگے۔ جن کے اثر سے سمندر کے سطح میں خوفناک اضافہ ہو گیا، اور ہمارا جہاز چنگھاڑتی ہوئی موجوں کے تھپڑوں سے کسی کھلونے کی طرح ڈولنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کہاں سے سیاہ مہیب بادلوں کے لشکر اٹھے اور آنا فانا پورے آسمان کو ڈھک دیا۔ بادل سطح سمندر پر اس طرح جھک آئے کہ عملاً ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور افق ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اگلے ہی لمحے بادلوں کی گرج اور بجلی کی ہیبت ناک کڑک کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یہ میری بحری زندگی کا سب سے خوفناک طوفان تھا۔ عملے کے باقی افراد بھی کانوں کا تھوہکا تے ہوئے بار بار توبہ کرتے اور اعتراف کرتے تھے کہ انہوں نے ایسا طوفان اپنی زندگی میں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ طوفان کی شدت کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ چار چار پانچ پانچ منزلہ بلڈنگ کی بلندی کے برابر چنگھاڑتی ہوئی موجیں جہاز کی طرف بڑھ رہی تھیں اور جہاز ان کے تھپڑوں سے پھر کی طرح گھونسنے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جہاز اب ڈوبا کہ تب ڈوبا۔ جہاز کے آلات جو کہ پہلے سے ہی خستہ حالت میں تھے اس طوفان میں جواب

دے گئے۔ ہمیں سمت کا بھی تعین نہ رہا اور ہم سب اپنے اپنے انداز میں خدا سے گڑگڑا کر معافی مانگنے لگے۔ کیونکہ جہاز کو مشینوں سے کنٹرول کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ پھر ایک بہت بڑا سمندری ریلہ آیا جس نے ہمارے جہاز کو عقبی سمت سے توڑ ڈالا اور پھر الٹا دیا۔ ہم سب اچھل کر دیواروں سے ٹکرائے۔ ہر طرف چیخ و پکار اور شور مچ گیا۔

جہاز اٹھنے سے میز، کرسیاں، اوزار اور آلات اور اسی نوع کی دوسری چیزیں ہمارے اوپر گرنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سمندر کا پانی کینبوں میں داخل ہونے لگا۔ ہم شتم و پشیم ایک دوسرے کو مدد کے لئے پکارتے کینبوں سے باہر نکلے۔ لائف بوٹ جہاز کے دونوں طرف بندھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف کی کشتیاں تو اب سمندر کے اندر اور جہاز کے نیچے چلی گئی تھیں۔ جبکہ دوسری طرف کی کشتیاں اوپر کی طرف تھیں جہاں پہنچنا اس طوفانی بارش میں ناممکن تو نہیں مشکل ضرور تھا۔

جہاز آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا۔ عملے کے کئی افراد لاپتہ ہو گئے تھے۔ جو بچ گئے تھے وہ جیسے تیسے کشتیوں تک پہنچے اور پھرے ہوئے سمندر کے سینے میں اتر گئے۔ لیکن جو سمندر اتنے بڑے جہاز کو خاطر میں نہ لا رہا تھا اس کے سامنے ان کشتیوں کی کیا حیثیت تھی۔ بہت سی کشتیاں سمندری لہروں کا ایک تھپڑا نہ سہہ سکیں اور غرق ہو گئیں۔

میں جس کشتی میں سوار ہوا اس میں ہم کل چار آدمی تھے، میں، گواکار ہنے والا ایک ادھیڑ عمر ہندو ملاح تلسی داس، ایک فلپائنی ملاح کو کوہان جت اور جہاز کا فرسٹ میٹ مسٹر سومانو جو انڈونیشیا کا رہنے والا ایک مسلمان آدمی تھا، ہم سب خامسے تجربہ کار لوگ تھے۔ علاوہ ازیں ہم اس جذبے سے بھی سرشار تھے کہ اس قدر ترقی یافتہ کے سامنے آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالیں گے بلکہ حتی الامکان کوشش کریں گے کہ اپنی مکان جان بچا کر کسی جزیرے تک پہنچ جائیں۔ بحر الکاہل میں اس جگہ لاتعداد جزائر تھے۔ قسمت یاوری کرتی تو کسی ایک

جزیرے تک پہنچنا جاسکتا تھا۔ المختصر ہم نے سیٹ بیلٹ باندھ لئے اور ربڑ کی ایک لائف بوٹ میں انجانی منزلوں کا رخ کیا۔

طوفان کی شدت پہلے سے سواتھی۔ اوپر سے سورج بھی غروب ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ہمارے لئے چند گز دور دیکھنا بھی محال ہو گیا۔ لہرں ہماری پشت کی کسی تنکے کی طرح اپنے جلو میں اوپر نیچے اور دائیں بائیں لے جانے لگی۔ ہم موجوں کے تھپڑے کھاتے بارش اور سمندر کے پانی میں شرابور آنکھیں میچ کر اور ہونٹ بھیچ کر لہروں کے رحموں و کرم پر محو سفر رہے۔

ہم سب کے دل اپنے اپنے خدا کے سامنے گڑگڑانے لگے۔ کوہان جت بدھا کو یاد کر رہا تھا۔ تلسی داس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی موتی تھی جن کے سامنے وہ نہ جانے کیا کیا بددعا کر رہا تھا۔ رہے ہم دونوں یعنی میں اور فرسٹ میٹ سومانو، تو مسلمان ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے دعا کر رہے تھے کہ وہ ہمیں اپنے حبیب کے صدقے موت کے منہ سے نکال دے۔

ساری رات ہم مہیب سمندر سے لڑتے رہے۔ حتیٰ کہ سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی طوفان کا زور ٹوٹنے لگا۔ بادل غبی منزلوں کا رخ کر رہے تھے اور ہوائیں بھی اب ہم سے آگ بڑھنا تھیں۔

آہستہ آہستہ موجوں کا شور بھی ٹھنڈا پڑ گیا اور سورج طلوع ہونے تک سمندری لہروں پر سکون ہو گیا جیسے اس نے کبھی طوفان کا چہرہ بھی نہ دیکھا تھا۔ ہم خدا کا شکر بجا لا رہے تھے جس نے ہمیں ہلاکت سے بچالیا تھا۔ اگرچہ ہم کسی جزیرے پر نہیں پہنچے تھے مگر طوفان ختم ہونے سے یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ جلد یا دیر پھر کسی جزیرے پر پہنچ جائیں گے۔ ہماری کشتی کو معجزانہ طور پر کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور ہم اس پر اب بھی کئی روز سفر کر سکتے تھے۔ اگر مسئلہ تھا تو صرف یہ تھا کہ ہمارے پاس سامان خورد و نوش نہ ہونے کے برابر تھا۔

افرا تفری میں ہم گوشت، مچھلی اور پھلوں، بزیوں کے چند ڈبے ہی اٹھا سکے تھے۔ اسی طرح پانی

کی تین چار بوتلیں بھی ہمارے ہاتھ لگی تھیں۔ یہ سامان زیادہ سے زیادہ دو دن نکال سکتا تھا اور.....!!!

ہم ایک دن اور ایک رات مشرق کی طرف محو سفر رہے۔ ہمارا اندازہ تھا کہ ہم ایک آدھ دن میں جزائر سلیمان پہنچ جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم نہ جانے کدھر نکل گئے۔ حذر نظر ہی پانی تھا اور خشکی کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ اوپر سے دھوپ کی تمازت، ہمارا برا حال ہو گیا۔

ایک دن اور گزرا تو راترانی ختم ہو گیا۔ کوہان جت کو تے اور اسپہال شروع ہو گئے۔ خود میں بخار میں پھٹنے لگا۔ ہمارے پاس کوئی دوا نہ تھی۔ بخار تو پھر بھی قابل برداشت تھا مگر کوہان جت کاعارضہ دوا کا متقاضی تھا۔ اسے دوانہ ملی تو اس کی حالت غیر ہو گئی اور بالآخر شام کے وقت اس نے ہمارے سامنے دم توڑ دیا.....!!!

کوہان جت کی موت نے ہمیں سراپہ بھی کیا اور افسردہ بھی۔ بھوک سے انشریاں جل رہی ہوں تو انسان کے ذہن میں عجیب اور اچھوتے خیال آتے ہیں۔ جب میں نے اور مسٹر سومانو نے کوہان جت کی لاش سمندر کے حوالے کرنے کا ارادہ کیا تو تلسی داس نے ہمیں روکتے ہوئے کہا۔ ”اس کی موت ہمارے لئے بھگوان کی کرپا ہے۔ اسے جل میں مت ڈالو، ہم اس کا ماس کھائیں گے۔“

”تلسی داس تو تو ہندو ہے۔ تمہارے دھرم میں ماس کھانا پاپ سمجھا جاتا ہے.....؟“

میں نے حیرت سے کہا۔ اس پر تلسی داس نے جواب دیا اور ”انسان یا مردار کا ماس تم مسئلے (مسلمان) بھی نہیں کھاتے ہو، مگر بھجوری میں تمہارے دھرم نے بھی اس کی آگیا دی ہے۔ دیکھو دین دھرم تو زندگی کے ساتھ ہے۔ زندگی ہی نہ رہے تو کیا دین اور کون سا دھرم میں جو کہہ رہا ہوں وہی کرو۔“ تلسی داس کی بات میں وزن تھا۔ دوسرے خالی پیٹ کو تو بہانہ چاہئے تھا۔ ہم تینوں اپنے ساتھی کی لاش پر پل پڑے اور اس کے بازوؤں اور رانوں سے گوشت کاٹ کاٹ کر کچا ہی

عالمی ریکارڈ

پاکستان سے سیریز ہارنے کے بعد دھونی صاحب کو بخار ہو گیا۔

ڈاکٹر نے ٹمپرچر چیک کیا تو خاصا حیران ہوا اور کہا۔

”آپ کا ٹمپرچر تو 105 درجے تک پہنچ چکا ہے۔“

دھونی نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! کیا یہ عالمی ریکارڈ ہے؟“

(رانا محمد ہاشم نون - کراچی)

جو کاکا دیوی تھی۔ غضبناک لگا ہوں سے ہمیں دیکھا۔ ایک کونداسالپاکا اور ہماری کشتی میں آگ بھڑک اٹھی اور ہم دونوں شعلوں میں گھر گئے۔ ہم سمندر میں چھلانگ نہ لگاتے تو جل کر ہضم ہو جاتے۔ ارے احسان بھائی یہ کیا حقیقت نازل ہو گئی ہے۔“

مسٹر سورمانو نے خوف سے لرزے ہوئے کہا اور ڈوبنے سے بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ ”یہ سب تلسی داس کی بدعا کا اثر ہے۔ اب تو اس کی دیوی کا غضب بھگتنا پڑے گا۔“ میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

اب ہم دونوں کھلے سمندر میں تیر رہے تھے اور ہمارے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا نہ ان میڑھیوں کی طرف لپکیں جو سمندر سے ابھری ہوئی تھیں۔ ان کے سروں پر بنے ہوئے کھوپڑی نما کمروں میں ابھی تک وہ انسانی بیولے کھڑے تھے۔ جنہوں نے کاکا دیوی کی مداح سرائی کی تھی۔ البتہ کاکا دیوی خود غائب تھی۔ ہم دونوں جیسے تیسے ان میڑھیوں تک پہنچ گئے اور پہلی میڑھی پر بیٹھ کر سانس استوار کرنے لگے۔

ہم دونوں نے علیحدہ علیحدہ میڑھی کا انتخاب کیا تھا۔ اسی لمحے ہماری نگاہیں سمندر کی موجوں پر پڑی تو یہ دیکھ کر ہماری سٹی گم ہو گئی کہ میڑھیوں کے ارد گرد کئی

قوتیں ہمیں ان شیطانی قوتوں سے بچانے کے لئے میدان میں اتریں اور کچھ دیر گزری تھی کہ میرے اندر کا خوف حقیقت بننا دکھائی دینے لگا۔ ہوا یوں کہ دوراقت پر کچھ ایسے آثار نظر آتے جیسے چھوٹے چھوٹے جزیروں کا مجموعہ ہو۔ میں نے خوشی سے مغلوب آواز میں مسٹر سورمانو کو اس طرف متوجہ کیا تو وہ بھی اچھل پڑا۔ ہم نے جلدی جلدی کشتی کو اس طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ مگر جب آدھے گھنٹے کے بعد اس جگہ پہنچے تو جو کچھ ہم نے دیکھا اسے دیکھ کر حیرت سے ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

جسے ہم جزیروں کا مجموعہ سمجھ رہے تھے وہ دراصل سمندر کے اندر سے ابھر کر باہر نکلتی ہوئی پتھری درجنوں میڑھیوں تھیں جن کے آخری سروں پر انسانی کھوپڑی کی شکل کے کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ میڑھیوں سمندر میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر باہر ابھری ہوئی تھیں اور ہر کھوپڑی کی نما کمرے کے دروازے میں ایک انسانی بولیہ نظر آ رہا تھا۔

ایک ایک میڑھیوں اور کھوپڑی نما کمروں کے مجموعے کے عقب سے ایک حسین نسوانی چہرہ کچھ ایسے نمودار ہوا جیسے سینما کی بڑی اسکرین پر کسی ماڈل کی بڑی سی کلپ تصویر نظر آتی ہے۔ اس کے خوب صورت بالوں نے اس کا آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ ابھی میرا ذہن اس نسوانی چہرے کی دلکشی کے سحر سے آزاد نہیں ہوا تھا کہ میری نگاہ اس کے ہاتھ پر پڑی اور میں خوف سے لرز اٹھا۔ اس خوب صورت عورت کے ہاتھ میں انسانی بازو کی ایک بڑی مٹی جس کے ساتھ لگے ہوئے گوشت کو اس نے کھالیا تھا۔ جو بڑی کھوپڑی نما کمروں کے دروازے میں کھڑے ان انسانی بیولوں کو اس عورت کے نمودار ہونے کا احساس ہوا وہ یکدم ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور ہم آواز ہو کر کہنے لگے۔

”کاکا تو مہان ہے۔ ساگر تیرا استھان ہے۔ جس پہ تیرا آکر دوش ہے۔ وہ کبار بھٹے دان ہے، جو بڑی ان کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے اس حسین عورت نے

اس نے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سجا کر کہا اور پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے آگے بڑھ کر بڑے پھل کا ایک چاقو عین اس کے دل کے مقام پر ٹھونک دیا۔

”آہ“ اور تلسی داس کے گلے سے ایک ہڑبڑائی ہوئی چیخ بلند ہوئی۔ اس کی پچھلی پچھلی نگاہوں میں دنیا جہاں کی حیرت سمٹ آئی اور اس کے منہ سے مرتے مرتے یہ الفاظ ادا ہوئے اور ”تم دونوں نے مجھے مار ڈالا اور آہ کاکا دیوی کا اور تم پر آکر دوش اور“ اور اس کے ساتھ ہی اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی، مورتی جو غالباً کاکا دیوی کی تھی اس کی گود سے نیچے گر کر اور اس کے سینے سے ایلنے والے خون سے آلودہ ہوئے گی۔ مگر اس پر زیادہ خون نہ گر سکا کیونکہ سورمانو نے عالم وحشت میں آگے بڑھ کر اس جگہ منہ لگا دیا جہاں سے تازہ خون ابل رہا تھا۔ شاید وہ پاگل ہو گیا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر میرا وجود خوف سے تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ میری بھوک ہوا ہو گئی تھی بلکہ طبیعت متلائے لگی تھی اور میں نے اس نظارے سے بچنے کے لئے رخ پھیر لیا تھا اور پہلو کے بل لیٹ گیا تھا۔ لیکن میرے کانوں میں سورمانو کے کچر کچر گوشت کھانے کی آوازیں آرہی تھیں جو بچ بچ میں مجھے بھی دعوت دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا ”حرامی تلسی داس تھا بوڑھا مگر گوشت اس کا بہت مزیدار ہے جیسے کسی جوان مینڈھے کا ہو۔“

وہ بے خوف تھا مگر میرے دل پر ایک انجانا سا خوف چھا رہا تھا۔ تلسی داس کی بدعا کا خوف، اس نے مرتے وقت کاکا دیوی کا قہر نازل ہونے کی ہمیں بدعا دی تھی۔ وہ ایک مسکین و مظلوم آدمی تھا اور خاصا آجاری (دستدار) ہندو تھا۔ اس کے ساتھ کئی سال سے انٹھے رہنے کی بدولت مجھے معلوم تھا کہ وہ پراسرار علوم سے شفقت رکھتا ہے اور کئی خلعتیوں کا مالک ہے۔ ٹھیک ہے وہ شیطانی خلعتیاں تھیں مگر ہم جیسوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے وہ پوری طرح کارگر ہو سکتی تھیں۔ ہم اتنے دہندہ راہ اور اچھے لوگ نہ تھے اور نہ اچھے مسلمان کہ رحمانی

کھانے لگے۔ پیاس بجھانے کے لئے ہمارے پاس پانی کا کوئی متبادل نہ تھا۔ سمندر کا پانی سخت کھار تھا جسے پینے سے انتڑیوں میں زخم ہونا یقینی بات تھی۔ پیاس کی شدت زیادہ مجبور کرتی تو ہم سمندر کے پانی میں کپڑے بھگوڑ کر تھوڑا تھوڑا چوس لیتے اس طرح ہم موت سے لڑتے رہے۔

دو دن مزید گزر گئے۔ کو باں جت کی لاش بنجر میں بدل گئی مگر ہمیں خشکی کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ہم بری طرح مایوس اور نڈھال ہو گئے تھے۔ میری طبیعت سب سے زیادہ خراب تھی۔ مجھے بادی سے بخار چڑھنے لگا تھا جس نے مجھے توڑ کر رکھ دیا میں سوچتا تھا کہ موت کا اگلا نشانہ میں بھی ہوں گا۔ مجھے تو اب اپنے دوسرے ساتھیوں سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ اونگھتے اونگھتے اچانک میں چونک پڑتا تھا کہ کہیں وہ میرا گلہ کھونٹ کر مجھے مار ہی نہ دیں۔ کیونکہ اب انہیں خوراک کی ضرورت تھی۔ ویسے تلسی داس ہم دونوں سے ڈرتا تھا اور ہمہ وقت مورتی کو سامنے رکھ کر پرارتھنا کرتا رہتا تھا۔ اسے یہ خدشہ تھا کہ یہ دونوں مسلے اسے مار ہی نہ ڈالیں۔ اور پھر وہی ہوا۔ دوپہر کے وقت جب ہمارا بھوک سے برا حال تھا اور تلسی داس کو زورہ دیر کے لئے آنکھ لگی تھی، مسٹر سورمانو نے سرکشی کے لیے میں کہا۔ ”مسٹر احسان خوراک کی عدم موجودگی میں ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔ ہم تینوں میں کسی ایک کو باقی دو کے لئے قربانی دینا ہوگی اپنی زندگی کی۔ ہم دونوں جوان ہیں اور تلسی داس بوڑھا آدمی ہے۔ اس نے اپنی پوری زندگی گزار لی ہے۔ میرا خیال ہے کہ قربانی اسے دینی چاہئے۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے اور؟“

اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی بات سن کر لرز اٹھا میں نے کہا۔ ”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم لوگ اسے قتل کر دیں۔۔۔۔۔؟“

”ہاں کیا حرج ہے۔ ویسے بھی سالہا ہندو ہے۔ ثواب بھی ملے گا ہمیں۔۔۔۔۔“

نائب ہو گیا۔

”سنو..... سنو اور خدا کے لئے میری بات سنو۔
یقین کرو میں بے تصور ہوں۔ کالکا کے پجاری تکی داس
کو میں نے نہیں مسٹر سارمانو نے قتل کیا تھا۔ مجھے ناکردہ
گناہ کی سزا دے دو۔“

میں نے چیختے ہوئے کہا۔ مگر میری التجائیں صدا
الہیہ ثابت ہوئیں۔ ”صبر کرو سر.....“ کئی ڈھانچے
سر راتی ہوئی آواز میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

”جلدی تم ہم سے آن لو گے ہم تمہیں اپنی دنیا
میں خوش آمدید کہیں گے غم کیسا۔“ اور پھر وہ بھی سسکتے
اور کسی بننے لگے۔

شام تک میں اس کال کو فطری میں زنجیر سے بندھا
آنسو بہاتا رہا۔ موت مجھے سامنے نظر آرہی تھی۔ اپنی گناہ
آلود زندگی کسی فلم کی طرح میرے پردہ ذہن پر متحرک تھی
اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں مر گیا تو میری بخشش ہرگز نہ
ہوگی۔ میں گڑگڑاتے ہوئے خدا سے اسنے گناہوں کی
معافی مانگنے لگا اور پھر کسی لمحے میری آنکھ لگ گئی۔

عالم خواب میں، میں نے ایک بار لیش بزرگ کو
دیکھا۔ بزرگ نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر سبز
نماشہ تھا اور ہاتھ میں بیج۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔
”احسان بیٹا تم نماز نہیں پڑھتے تھے اور گناہ آلود زندگی
بسر کرتے تھے۔ اس لئے تم پر یہ مصیبت نازل ہوئی۔ یاد
رکھنا جو انسان نماز کی پابندی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی
حفاظت کی ذمہ داری لے لیتے ہیں۔ مگر جو انسان نماز کو
تھوڑ دیتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی ذمہ داری سے بری
ہو جاتے ہیں۔“

میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”بابا اللہ پاک سے
دعا کریں کہ وہ مجھے اس بار معاف کر دے اور اس موت
کے گھر سے بچا کر نئی زندگی دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ
نیک انسان بنوں گا اور ہمیشہ چنگا نہ نماز ادا کروں گا۔“
بزرگ نے کہا۔ ”اچھی بات ہے میں بھی دعا کرتا ہوں
اور خود تم بھی اپنے رب سے معافی مانگو اور لا حول ولا قوۃ
اللہ کا ورد بکثرت کرو اور اللہ تعالیٰ کرم فرمائیں گے۔“

میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”بابا اللہ پاک سے
دعا کریں کہ وہ مجھے اس بار معاف کر دے اور اس موت
کے گھر سے بچا کر نئی زندگی دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ
نیک انسان بنوں گا اور ہمیشہ چنگا نہ نماز ادا کروں گا۔“
بزرگ نے کہا۔ ”اچھی بات ہے میں بھی دعا کرتا ہوں
اور خود تم بھی اپنے رب سے معافی مانگو اور لا حول ولا قوۃ
اللہ کا ورد بکثرت کرو اور اللہ تعالیٰ کرم فرمائیں گے۔“

میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”بابا اللہ پاک سے
دعا کریں کہ وہ مجھے اس بار معاف کر دے اور اس موت
کے گھر سے بچا کر نئی زندگی دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ
نیک انسان بنوں گا اور ہمیشہ چنگا نہ نماز ادا کروں گا۔“
بزرگ نے کہا۔ ”اچھی بات ہے میں بھی دعا کرتا ہوں
اور خود تم بھی اپنے رب سے معافی مانگو اور لا حول ولا قوۃ
اللہ کا ورد بکثرت کرو اور اللہ تعالیٰ کرم فرمائیں گے۔“

میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”بابا اللہ پاک سے
دعا کریں کہ وہ مجھے اس بار معاف کر دے اور اس موت
کے گھر سے بچا کر نئی زندگی دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ
نیک انسان بنوں گا اور ہمیشہ چنگا نہ نماز ادا کروں گا۔“
بزرگ نے کہا۔ ”اچھی بات ہے میں بھی دعا کرتا ہوں
اور خود تم بھی اپنے رب سے معافی مانگو اور لا حول ولا قوۃ
اللہ کا ورد بکثرت کرو اور اللہ تعالیٰ کرم فرمائیں گے۔“

میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”بابا اللہ پاک سے
دعا کریں کہ وہ مجھے اس بار معاف کر دے اور اس موت
کے گھر سے بچا کر نئی زندگی دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ
نیک انسان بنوں گا اور ہمیشہ چنگا نہ نماز ادا کروں گا۔“
بزرگ نے کہا۔ ”اچھی بات ہے میں بھی دعا کرتا ہوں
اور خود تم بھی اپنے رب سے معافی مانگو اور لا حول ولا قوۃ
اللہ کا ورد بکثرت کرو اور اللہ تعالیٰ کرم فرمائیں گے۔“

میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”بابا اللہ پاک سے
دعا کریں کہ وہ مجھے اس بار معاف کر دے اور اس موت
کے گھر سے بچا کر نئی زندگی دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ
نیک انسان بنوں گا اور ہمیشہ چنگا نہ نماز ادا کروں گا۔“
بزرگ نے کہا۔ ”اچھی بات ہے میں بھی دعا کرتا ہوں
اور خود تم بھی اپنے رب سے معافی مانگو اور لا حول ولا قوۃ
اللہ کا ورد بکثرت کرو اور اللہ تعالیٰ کرم فرمائیں گے۔“



دیکھنے کے قابل ہوئیں تو کمرے کا ماحول دیکھ کر میرا دل
بل گیا۔ وہ کوئی انسانی مدح خانہ تھا جس میں ایک طرف
ٹوکے، کلباڑیاں، چھریاں اور بوٹیاں کرنے کے لئے
لکڑی کی لٹھیاں پڑی ہوئی تھیں۔ چھت سے کئی رسیاں
لٹک رہی تھیں۔ جن کے ساتھ لوہے کے بک تھے۔ ان
پر یقیناً ذبح کرنے کے بعد انسانی لاشیں لٹکائی جاتی
ہوں گی۔ میں نے اس کا اندازہ اس طرح لگایا کہ ایک
بک کے ساتھ آپ بھی آدھی کٹی ہوئی ایک برہنہ انسانی
لاش لٹک رہی تھی اور پھر میں نے اس کا کٹا ہوا سر اور
ہاتھوں کے پنجے بھی ایک اونچے میز پر پڑے ہوئے دیکھ
لئے تھے۔ وہ کون تھا میں پہچان نہیں سکا۔ کوئی بد نصیب
ملاح ہی ہوگا۔ کمرے میں ناقابل برداشت تعفن سے
میرا سر پھنسا جا رہا تھا۔

میں اٹھ کر قہقہے ہوا تو کسی شے سے ٹکرا گیا۔
اور پھر اگلے ہی لمحے کئی انسانی ڈھانچے جو پھیل دیوار کے
ساتھ ٹکے ہوئے تھے۔ مجھ سے ٹکراتے ہی فرش پر
جا گرے۔ میں خوف سے اچھل پڑا۔ ”او جاہل آدمی،“
ایک ڈھانچے نے کراہ کر کہا۔ ”میری ہڈی تو ڈی تو
نے“ دوسرے ڈھانچے نے بھی یہی کہا۔

”یا الہی میں کس وحشت کدے میں آ گیا
ہوں۔“ میں نے کانپتے ہوئے کہا۔
”یہ وحشت کدہ نہیں کالکا دیوی کی رسوائی
ہے۔“ ہیولے نے عقب سے میرے کندھے پر ہاتھ
رکھا کالکا دیوی ہر اماں کی رات انسانی گوشت کا بھوجن
کرتی ہے۔ سات روز بعد پھر وہی رات آنے والی ہے،
اس بار تمہارا اور تمہارے اس ساتھی کا گوشت پیش کیا
جائے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے دبوچ لیا اور دیوار کے
ساتھ ایسا دھکے لپٹا دیے کہ زنجیر سے باندھ دیا۔

میں نے بہت چیخ پکاری کہ ہاتھ پاؤں مارے مگر
اس کی گرفت بہت ہی مضبوط تھی۔ اس نے مجھے پوری
طرح جکڑ لیا اور مجھے بے بس کر دیا..... ”اماں کی رات
تک تم اس طرح قید رہو گے پھر میں آکر تمہیں ذبح
کروں گا۔“ اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگا کر کہا اور

خونخوار شاکر مچھلیاں نمودار ہو گئیں۔ ہم دونوں بدحواس
ہو کر کئی سیڑھیاں اوپر چڑھ گئے۔ لیکن اوپر بھی کہا جاتے
۔ وہاں ڈراؤنے انسانی ہیولے کھوپڑی نما کمروں کے
دروازوں میں کھڑے ہمیں گھور رہے تھے۔
”آؤ..... آؤ موت کے زینے پر چڑھ کر آؤ،
ہم تمہارے منتظر ہیں۔“ ڈراؤنے ہیولے بھیا تک
انداز میں قہقہے لگاتے ہوئے کورس میں گانے لگے۔
”یا اللہ رحم۔“ میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔
”اوپر آؤ۔“ اب اس ہیولے نے حکم آمیز
لہجے میں کہا جو میرے والی زینے کی آخری سیڑھی پر کھڑا
تھا۔ میں نے ہم کراس کی طرف دیکھا اور پھر سمندر کی
طرف جہاں ایک بڑی شاکر مچھلی بار بار منہ کھول کر
میری طرف آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نہ جانے رشتن
نہ پاتے ماندن والی کیفیت تھی میری۔

دیکھو اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو میں تمہیں سمندر
میں دھکا دے دوں گا۔“ ہیولے نے مجھے دھکایا۔ اس
کی آواز میں ایسی سفاکی تھی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ حکم
عدولی کی صورت میں اپنی کبھی ہوئی بات پر فوراً عمل
کرے گا اور چنانچہ میں چارو ناچار آہستہ آہستہ اوپر
چڑھنے لگا۔ میں نے اس وقت مسٹر سارمانو کی طرف
دیکھا وہ بھی میری طرح اوپر چڑھ رہا تھا۔ غالباً اسے بھی
یہی دھمکی دی گئی تھی۔

میں اس ہیولے کے مقابل پہنچا تو ڈر کے
مارے میری جان ٹکی جا رہی تھی۔ اگرچہ وہ ایک ہیولہ ہی
تھا اور اس کی شکل واضح نہیں تھی مگر اپنے سامنے ایک غیر
انسانی مخلوق دیکھ کر خوفزدہ ہونا فطری امر ہے۔ میں
جونہی اس کے قریب پہنچا ہیولے نے ایک طرف ہٹ
کر مجھے راستہ دیا اور حکم یہ لہجے میں کہا۔ ”چلو اندر اور
موت کے گھر میں۔“

مجھے اندر جانے میں قدرے تاہل ہوا تو اس نے
عقب سے مجھے دکھا دیا اور اس میں اس کو فطری نما
اندھیرے کمرے کے وسط میں منہ کے بل جا کر۔
جب میں سنبھلا اور آنکھیں اندھیرے میں

میں اس ہیولے کے مقابل پہنچا تو ڈر کے
مارے میری جان ٹکی جا رہی تھی۔ اگرچہ وہ ایک ہیولہ ہی
تھا اور اس کی شکل واضح نہیں تھی مگر اپنے سامنے ایک غیر
انسانی مخلوق دیکھ کر خوفزدہ ہونا فطری امر ہے۔ میں
جونہی اس کے قریب پہنچا ہیولے نے ایک طرف ہٹ
کر مجھے راستہ دیا اور حکم یہ لہجے میں کہا۔ ”چلو اندر اور
موت کے گھر میں۔“

مجھے اندر جانے میں قدرے تاہل ہوا تو اس نے
عقب سے مجھے دکھا دیا اور اس میں اس کو فطری نما
اندھیرے کمرے کے وسط میں منہ کے بل جا کر۔
جب میں سنبھلا اور آنکھیں اندھیرے میں

میں اس ہیولے کے مقابل پہنچا تو ڈر کے
مارے میری جان ٹکی جا رہی تھی۔ اگرچہ وہ ایک ہیولہ ہی
تھا اور اس کی شکل واضح نہیں تھی مگر اپنے سامنے ایک غیر
انسانی مخلوق دیکھ کر خوفزدہ ہونا فطری امر ہے۔ میں
جونہی اس کے قریب پہنچا ہیولے نے ایک طرف ہٹ
کر مجھے راستہ دیا اور حکم یہ لہجے میں کہا۔ ”چلو اندر اور
موت کے گھر میں۔“

دہشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لرزیدہ لرزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بھاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی۔

تجسس اور سسپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو رطہ حیرت میں ڈال دیں گے



میں پھانسنے کی بہت کوشش کی۔ میں کوئی بچی تو تھی نہیں کہ جو، ان معاملات کی تہہ میں نہیں پہنچتی۔ کیوں کہ مجھے نظر آ گیا تھا کہ اس کی ذریعہ آمدنی جائز نہیں..... گورکھ دھندا ہے۔ میں جب دشواری میں بھنسی تو اس نے مجھے مخلصانہ مدد کی پیش کش کی۔ اس لئے اس نے آج رات مجھے سلور بار میں ملنے کے لئے کہا۔ وہ مجھے کچھ بتانا اور مشورہ دینا چاہتا تھا۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

”اور اس نے تمہیں کیا بتایا؟“

”یہی کہ اب مجھے پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اس نے ان بد معاشوں کا بندوبست کر دیا ہے۔ چونگ اور ہراساں کر رہے تھے۔“

”یہ تو رتن کمار نے آپ پر بڑی مہربانی کی..... لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کبھی کب پر بے سبب اور بے غرض مہربان نہیں ہوتا۔“

ٹائیگر جانتا تھا کہ انسپکٹر چوں کہ بڑا گھاگ اور تجربہ کار ہے اور روز نجانے اس کا کتنے بد معاشوں اور ٹھگوں سے واسطہ پڑتا تھا اس لئے اس نے تاڑ لیا تھا کہ راکھی جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ اس سلسلے میں راکھی کے لئے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے پاس ثبوت کوئی نہیں تھا۔ اس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ چنانچہ سب انسپکٹر نے اپنا

ٹائیگر نے سوچا کہ الزام تو راکھی پر ہے اور سب انسپکٹر کو اس پر شک ہے اور پھر سرو قد مال جس کے پاس سے برآمد ہوگا وہ چور اور مجرم ہوگا۔ سب انسپکٹر جانتا ہے کہ وہ پرائیویٹ سرائے رسال ہے لہذا اس پر شک اور تعاون کا الزام نہیں ہوگا۔ اس لئے وہ بے فکر سا ہو گیا۔

”انسپکٹر رام دیال.....؟“ وہ بولی تو اس کی آواز پوری طرح قابو میں تھی۔ ”آپ نے مجھ پر بڑا گھٹیا الزام لگایا ہے۔“

”مس راکھی ایک دولت مند خاتون ہیں..... ان کے پاس زیورات کی کوئی کمی نہیں..... ایسے دس بار ہوں گے..... وہ کسی کا ہار کیوں چرانے لگیں.....؟“ ٹائیگر نے اس کی حمایت میں کہا۔

”تو پھر..... یہ رتن کمار سے کیوں ملیں.....؟“ سب انسپکٹر نے راکھی کو گہری اور مشکوک بھری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

آخری پتا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا اور اس نے راکھی کا بیک اٹھالیا۔

”اگر یہ سب کچھ درست ہے تو مس راکھی! تو میرے خیال میں آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ میں اس بیک کو ایک نظر دیکھ لوں۔ اجازت۔“ اس نے بیک کو تھپ تھپایا۔

راکھی کا چہرہ بے لہو ہو گیا اور ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ ہچکچاتی تو ٹائیگر نے فوراً ہی مداخلت کی۔

”اسپیکٹر رام دیال! یہ زیادتی ہے۔ آپ کو اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔“

”انکار کی صورت میں انہیں ہمارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا اور یوں ان کی ٹرین نکل جائے گی۔“

ٹائیگر نے راکھی کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلادیا اور اس نے کہا۔

”تمہارے ہاتھ صاف ہیں اور تم نے کوئی واردات نہیں کی اور تم چور نہیں ہو تو چالی اسپیکٹر کو دواور پھر تمہارے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ یہی دانش مندی کا تقاضا ہے۔ ضد نہ کرو۔“

راکھی نے میکا کی انداز میں ٹائیگر کی ہدایت پر عمل کیا۔

اسپیکٹر نے باہر آنے انداز میں بیک کی تلاشی لی۔ بیک میں دو جوڑے نسوانی ملبوسات اور استعمال کی دیگر چیزوں کے ساتھ کچھ بھی نہیں تھا۔ ٹائیگر راکھی کی طرف بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اسپیکٹر کے ہاتھوں پر جمی ہوئی تھیں۔ بظاہر وہ بے تعلق نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسپیکٹر کی تلاشی مکمل ہوتے ہی وہ اپنی حیرت چھپانے لگی۔

اسپیکٹر کو مطلوبہ چیزیں نہیں ملی تھیں۔

راکھی پر بتایا کہ وہ کس لئے راکھی کی تلاشی لیتا جاتا ہے۔ راکھی اس کے ہمراہ ایک ملحق کمرے میں چلی گئی۔ محوِ رویہ بعد آئی۔ مسز رتنا دیوی بولی۔

”سرم! ہار تو دور کی بات ہے۔ انگوٹھی تک نہیں ملی۔“

راکھی جس طرح پر اعتماد گئی تھی اس طرح واپس بھی آ گئی۔ سب اسپیکٹر پھر اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے اپنی جیکٹ نکال کر کرسی پر ڈال دی۔ اسپیکٹر نے جیکٹ اور اس کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ ٹائیگر نے اپنے ہاتھ اور پیر اٹھا کر رکھے تھے۔

”آپ اچھی طرح سے میری تلاشی لیں۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”آپ کے بشرے سے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ اب بھی پوری طرح مطمئن نہیں نظر آ رہے ہیں؟“

اسپیکٹر نے دوبارہ اس کی سرسری طور پر تلاشی لی اور پھر غرایا۔ ”تم جانتی ہو۔ تمہارا پتا میرے پاس موجود ہے۔ ضرورت پڑی تو پھر تم سے رابطہ کریں گے۔“

”بڑی خوشی سے۔“ وہ بولی۔ ”تم بنگلور پولیس سے رابطہ کر کے گھر پر چھاپہ بھی مار سکتے ہو۔“

سب اسپیکٹر رام دیال منہ بناتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اور ٹائیگر بیک میں سامان قربانے سے رکھنے میں راکھی کی مدد کرنے لگا۔

راکھی نے بیک معقل کرنے سے پہلے اس میں سے ایک چھوٹا بٹا نکالا۔ پھر وہ باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے ڈسٹ بن میں سے اپنے اخبارات کا رول نکالا اور جیکٹ کی اندرونی جیب میں ٹھوس دیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ دونوں پلیٹ فارم پر چلے آئے جس پر کے کے ایک سپر لیس روٹنگی کے لئے تیار تھی۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کہوں۔“ ”راکھی عجیب سی کش کش کے لہجے میں بولی۔ ”کچھ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ ٹائیگر نے اسے سہارا دے کر ٹرین پر چڑھادیا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا رہا۔

اس نے اچانک ٹائیگر کا کندھا مضبوطی سے

پکڑ لیا۔ ”تم نے اس کا کیا کیا۔؟“

”کس کا۔؟“

”ہمروں کے ہار کا؟“

”وہ تو میں نے ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔“

”کیا کہہ رہے ہو۔“ راکھی کو ایسا لگا جیسے اس کی سانس رک جائے گی۔

”اب تم سکون سے گھر جاؤ اور اچھی بچی بن کر رہو۔ اب تمہیں اس ہار کی فکر کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ میں یہاں کے معاملات سنبھال لوں گا۔ تم پر کوئی آج اور مصیبت نہیں آئے گی۔“ ٹائیگر نے جیسے دلاسا دیا۔

”تم کیا کرو گے اس کا۔“

”میں اس کی مالکہ کو واپس کر دوں گا۔ شام کے اخبارات اور ریڈیو کی مقامی خبروں میں اس کا اتنا پتا بتانے والوں کو دس فیصد کے انعام کا اعلان کیا گیا۔ میں اسے تمہاری خدمات کا معاملہ سمجھ لوں گا۔“

ٹائیگر کو ایسا لگا کہ راکھی پر ہسٹریا کا دوزہ پڑنے والا ہے۔

”تم۔۔۔ تم۔۔۔ انتہائی ذلیل۔۔۔ بچہ اور گھٹیا آدمی ہو۔۔۔ کہتے تم نے مجھے ذلیل کر اس کیا۔۔۔ اگر۔۔۔ میرے پاس ریوالتور ہوتا تو اس وقت۔۔۔“ وہ ٹائیگر پر ہنکارتی۔ ٹائیگر نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ریوالتور راکھی کے پاس نہیں ہے۔ ”میں نے تمہیں درست سمجھا۔ تمہیں قابل اعتبار جانا۔ لیکن تم گھٹیا، لنگے، دو غلے ثابت ہوئے۔“

”میری بات سنو۔“ ٹائیگر نے خشونت سے کہا۔

”تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔ تم نے مجھے الو بنانا چاہا۔ تم اور رتن کمار نے مل کر۔۔۔ تم میں کوئی بھی ڈریم لینڈ ہوٹل کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ سو تم نے مجھے اپنی ضرورت کے لئے استعمال کیا۔ کیا میں اتنا بے وقوف تھا کہ سوچے سمجھے بغیر کچھ کر گزرتا۔ میں نے تمہیں رتن کمار سے ملتے دیکھا تو تمہارا سارا کھیل میری سمجھ میں آ گیا۔“ میرا احسان مانو۔ میں نہ ہوتا تو تم اس وقت

جیل کے راستے پر ہوتی۔ اب اس سے ہی کوئی سبق لے لو۔۔۔ گھر جاؤ راکھی!۔۔۔ اچھی بننے کی کوشش کرو۔۔۔ تم میں ایک اچھی عورت بننے کی خوبیاں ہیں۔“

اسی وقت ٹرین چل پڑی۔ ٹائیگر نے اسے کارڈور میں دھکیلا اور خود ٹرین سے اتر گیا۔ ”میرا یہ احسان ہمیشہ ماننا۔“

اس نے جج کر کہا۔ ”لیکن میرا خیال۔۔۔“

ٹائیگر کا خیال تھا کہ چلتی ٹرین کے شور میں وہ اس کی آواز سن نہ سکی ہوگی۔

ٹائیگر اس خیال سے کینٹین میں بیٹھا رہا کہ وہ کسی قریبی اسٹیشن پر زنجیر پھینچ کر اتر جائے اور لوکل ٹرین سے آجائے۔ کیوں کہ دس بیس ہزار کی مالیت کے ہار کی بات نہ تھی۔ پورے پچاس لاکھ کی مالیت کا تھا۔ آج جو سونے اور زیورات کا بھڑا چل رہا تھا وہ تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق تراسی لاکھ کا بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اس کے حصول کے لئے مہربان ہو کر پانے کی کوشش بھی کر سکتی تھی۔ اگر وہ اس انداز سے سوچ رہی ہوگی تو یہ اس کی بھول تھی۔ بلاشبہ وہ تو بہن تھی۔ رتن کمار نے شاید فحشی فحشی کی پازنٹز شپ کی ہوگی۔

وہ ایک گھنڈہ بیٹھا رہا۔ تین لوکل ٹرینیں آئی تھیں اس میں راکھی نہیں آئی تھی۔ وہ سمجھ گئی ہوگی کہ میں اس کے ہاتھ آنے سے رہا۔ اب اسے واپس جا کر تلاش کرنا لا حاصل ہے۔ صبر کر کے گھر میں بیٹھ جائے۔

ٹائیگر نے سوچا اس اداکارہ اور سابق ملکہ حسن نے اس ہار کی بازیابی کا انعام دس فیصد دینے کا اعلان کیا ہے۔ دس فیصد یعنی پانچ لاکھ روپے نقد۔ مفت ہاتھ آئیں تو بڑے کیا ہیں؟ یوں بھی یہ ایک بڑی رقم ہے۔ اسے زیادہ محنت نہ کرنی پڑے گی۔ یہ انعام اس کی تدبیر اور ذہانت کا ہے۔ اور پھر اس قیمتی ہار کا پاس رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ جتنا جلد ہو سکے یہ بوجھ سر سے اتار پھینکنا چاہئے۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ٹائیگر ملکہ حسن کی کوٹھی کی اطلاع گھنٹی بج رہا تھا۔ گیٹ دربان نے کھولا۔ اس نے

جیل کے راستے پر ہوتی۔ اب اس سے ہی کوئی سبق لے لو۔۔۔ گھر جاؤ راکھی!۔۔۔ اچھی بننے کی کوشش کرو۔۔۔ تم میں ایک اچھی عورت بننے کی خوبیاں ہیں۔“

اسی وقت ٹرین چل پڑی۔ ٹائیگر نے اسے کارڈور میں دھکیلا اور خود ٹرین سے اتر گیا۔ ”میرا یہ احسان ہمیشہ ماننا۔“

اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ گیٹ پر جو ایک چھوٹا سا کمرانا ہوا تھا جس میں فون، انٹرکوم اور موبائل کے علاوہ چھت پر پکھلا۔ ایک کرسی اور میز پر ایش ٹرے اور سگریٹ کا پیکٹ اور ناچس بھی تھی۔

دربان نے انٹرکوم پر ملکہ حسن سے بات کی تو تھوڑی دیر بعد سترہ برس کی لڑکی اندر سے تھرتھرتی، کچکتی اور بڑے ادائے ناز سے آئی۔ اس نے آکر سنا کر کیا۔

”آپ مسٹر دیوکار ہیں۔۔۔۔۔؟ اندر تشریف لے چلیں۔ بیگم صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“

ٹائیگر اس کی طرف دیکھا تو وہ لچاسی گئی۔ ٹائیگر نے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”رانی۔۔۔۔۔! اس نے جواب دیا۔ ”آپ نام کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”اس لئے کہ تم نہایت حسین ہو۔۔۔۔۔ دل چاہ رہا ہے کہ ایک سندرسا مشورہ دوں۔“

”کیسا مشورہ۔۔۔۔۔؟“ اس نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ بولا۔ ”کیا تم یہاں ملازمہ ہو۔۔۔۔۔؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ میں یہاں ملازمہ ہوں اور کام کر رہی ہوں۔“ رانی نے بتایا۔

”تم نہ صرف نہایت حسین بلکہ ہر لحاظ سے فلمی ہیروئن بننے کے قابل ہو۔۔۔۔۔ تم یہاں نہ صرف اپنا وقت، حسن، عمر اور جوانی ضائع کر رہی ہو۔۔۔۔۔ ایسا جسم جو کسی قیامت سے کم نہیں فلم سازوں کی ضرورت ہے۔ تم کسی اچھے فلم ساز سے ملو۔ تمہارے نصیب جاگ جائیں گے۔“ ٹائیگر نے مشورہ دیا۔

”مجھے کون چانس دے گا۔۔۔۔۔ ایک سے ایک حسین اور نوجوان لڑکیاں خوار ہو رہی ہیں۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”سنو۔۔۔۔۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”تم کسی فلم ساز سے ملو تو اس سے کہنا کہ میں ہر قسم کے بولڈ سین کر سکتی ہوں۔“

تمہارا جسم بہت ہی بولڈ کرنے والا ہے۔۔۔۔۔ آج کل فلموں میں کہانی کم عورت کو بولڈ ہی بولڈ دکھایا جا رہا ہے۔ تم ایک کام کرو۔ کسی فوٹو گرافر سے اپنی کچھ عدد بولڈ تصویروں کھینچو کرا لیم بناؤ۔۔۔۔۔ وہ خورا تمہیں لے لے۔“

”آپ نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے۔ میرے والدین بھی یہی کہتے ہیں کہ میں فلموں میں بولڈ مناظر کے لئے نہایت فٹ ہوں۔۔۔۔۔ میری ماں تو مجھے آئینے کے سامنے کھڑا کر کے دیکھتی رہتی ہے۔ آپ کتنے اچھے ہیں۔“

ٹائیگر نے اسے کوئی غلط مشورہ نہیں دیا اور نہ ہی بے وقوف بنایا تھا۔ اسے اس لئے بھی اس ملازمہ سے ہمدردی ہوئی تھی کہ اس کی مالکہ کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ بہت ہی مغرور، تنگ مزاج ہے۔ ملازماؤں سے اس کا سلوک انتہائی توہین آمیز ہوتا ہے۔

رانی اسے نشست گاہ میں بٹھا کر اطلاع دینے اندر چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ بڑے غرور سے آئی۔ ٹائیگر اس کے استقبال کے لئے اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا۔ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اس ملکہ حسن کو بڑا ناگوار سا لگا۔

”کون ہو تم۔۔۔۔۔؟ کس لئے آئے ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ قدرے تلخی سے بولی۔ ”دربان نے بتایا تھا کہ تم ہمارے بارے میں بتانے آئے ہو؟“

”تم نے یہ اعلان کیا تھا کہ الماس ہار بازیاب کرنے والے کو اس کا دس فیصد دیا جائے گا۔“ ٹائیگر نے بھی اسے تم سے مخاطب کیا۔ ”میں اس سلسلے میں بتانے آیا ہوں کہ۔۔۔۔۔“

”تم میں بات کرنے کی ذرا بھی تیز نہیں۔۔۔۔۔ میں آئی تو احتراماً کھڑے بھی نہیں ہوئے۔ اور پھر تم کے مخاطب سے بات کر رہے ہو۔۔۔۔۔ کیا عورتوں سے ایسے ملا جاتا ہے؟“

”میں تمہارا نوکر نہیں ہوں جو تمہیں دیکھتے ہی کھڑا ہو جاؤں۔ تم نے مجھ سے تم سے مخاطب کیا۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہارا ہار جس کی مالیت تم نے پچاس لاکھ بتائی ہے اس وقت مارکیٹ میں پچاس لاکھ کا ہے۔“

اس کا دس فیصد لوں گا۔“

”کیا۔۔۔۔۔ وہ ہار تمہارے پاس ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولی۔ ”تم سے کس نے کہہ دیا کہ اس کی مالیت پچاس لاکھ ہے۔“

ٹائیگر نے جیب سے تین وزینگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

”یہ شہر کے تین سب سے بڑے جیولرز شاپس ہیں۔ میں نے انہیں باری باری دکھایا۔ وہ پچاس لاکھ قیمت دینے کو تیار ہیں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے تو فون کر کے ابھی پوچھ لو۔۔۔۔۔ فون سامنے ہی رکھا ہے۔“

”تم بڑے کاٹیاں ہو۔۔۔۔۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟ نا جائز ہانکوا اٹھا رہے ہو۔“

”شرمیلی جی۔۔۔۔۔ یہ ہار کون سا تمہارے چتائی کا مال ہے۔۔۔۔۔ اسے تو ایک رئیس زادے نے ایک رات کے عوض تمہیں پیش کیا تھا۔ لہذا پانچ لاکھ دیتے ہوئے دل کیوں دکھ رہا ہے۔“ ٹائیگر نے طنز پر لہجے میں کہا۔

”شب آپ۔۔۔۔۔؟“ وہ غصے سے بولی۔ ”یہ تم کس نے کہہ دیا کہ مجھے ایک رات کے عوض ملا، میں نے اسے دہی میں خرید لیا تھا۔ یہ میرا مال ہے۔ میری ملکیت ہے۔“

”اگر تم نے اسے خریدا ہوا ہے تو یقیناً اس کی رسید تو ہوگی۔۔۔۔۔؟ کیا میری تسلی کے لئے دکھانا پسند کرو گی؟“

”تم کون ہوتے ہو رسید طلب کرنے والے۔“ وہ گڑبگڑی۔ ”کام کی بات کرو۔ تم الماس ہار کے بارے میں بات کرنے آئے تھے؟“

”بات ہار کی مالیت کی ہو رہی تھی۔ تم کیوں نہیں۔۔۔۔۔ فون کر کے ان سے میری بات کی تصدیق کر لیتی۔ سچ کیا ہے جھوٹ کیا ہے؟ تاکہ کمیشن کا معاملہ طے ہو۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”اس نے بادل خواستہ تینوں جیولرز کو باری باری فون کیا۔ پھر کریڈل پر رسیدور رکھ کر بولی۔ ”میرا ہار تمہیں

کہاں اور کس سے ملا؟“

”تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گنتے سے۔۔۔۔۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”میری ایمانداری اور شرافت دیکھو کہ میں چاہتا تو ہار فروخت کر کے رقم جیب میں رکھ لیتا۔۔۔۔۔ ادھر کار خ نہ کرتا۔ لیکن تم میری شرافت کی قدر کرنے کے بجائے کمیشن دینے میں بخل اور تکرار سے کام لے رہی ہو۔۔۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔ تم لڑو۔۔۔۔۔ میں ہار نہیں دیتا۔“

ٹائیگر ایک جھکے سے جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ وہ دروازے کی طرف تیزی سے بڑھا تو ملکہ حسن اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔ پھر اس کے قریب آکر اس کے گلے میں عریاں ہانسیں حائل کر دیں اور اس کے چہرے پر جھکنے لگی تو ٹائیگر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تم بہت ناراض ہو۔۔۔۔۔ مجھے بوسہ لینے نہیں دے رہے جب کہ ساری دنیا ترستی ہے۔“ وہ اسے خود سپردگی کی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

”وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں میں خوش کرتی ہوں۔“

”میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔۔۔۔۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”میں ان ہونٹوں کا کیا بوسہ لوں جو غلیظ ہے اور جانے کیسے کیسے ہونٹوں نے اس میں پوسٹ کیا۔“ میں یہ بات جانتا ہوں ہار کے حصول اور کمیشن بچانے کی خاطر مجھ پر مہربان ہو جاؤ۔۔۔۔۔ میں بے نصیب ہی بہتر ہوں۔ تم کمیشن دے رہی ہو یا نہیں۔ میں پانچ لاکھ سے ایک کوڑی کم نہ لوں گا۔“

”تھوڑی دیر انتظار کرو۔۔۔۔۔ چائے پیو۔۔۔۔۔ میری سیکریٹری بینک تک گئی ہوئی ہے۔ بس وہ آتی ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”تجوری کی چابیاں اس کے پاس ہوتی ہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

وہ اندر چلی گئی۔ رانی ملازمہ تھوڑی دیر بعد اس کے لئے ٹرے میں چائے اور سینڈوچز لیتی آئی۔ پھر وہ ٹرے رکھ کر چلی گئی۔ اندر ملکہ حسن آئی۔ چائے پیتے ہوئے اس نے پھر سابقہ سوال دہرایا۔

”آپ نے بتایا نہیں کہ یہ ہار کہاں سے ملا ہے؟ کس کے پاس تھا۔ کیا رتن کمار نے چرایا تھا یا راجی نے؟“

”آئی ایم ساری۔۔۔۔۔“ وہ راستہ پر آگئی تھی۔ آپ سے مخاطب کرنے لگی۔

”میں نے کہا تا کہ آم کھانے سے مطلب رکھیں۔۔۔۔۔ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہار کہاں سے ملا۔۔۔۔۔؟ ورنہ قانونی جھجھوں میں پھنس جائیں گی۔ کیوں کہ اس کی رسید بھی آپ کے پاس نہیں ہے۔۔۔۔۔ انکم ٹیکس والے بھی رسید طلب کریں گے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”آپ جیسا کہتے ہیں ویسا ہی کروں گی۔“

تھوڑی دیر بعد اس کی سیکریٹری آئی تو اس کے ساتھ پولیس بھی تھی۔ ٹائیگر نے اس کی سیکریٹری مانی کو پہچان لیا۔ مانی بھی بڑی مشہور اور مقبول اور بدنام زمانہ ہیر وڈن اور کال گرل تھی۔ بڑی حسین تھی۔ اب پچاس برس کی ہو گئی تھی۔ وہ ساہوکاروں اور سرمایہ داروں سے ملکہ حسن کے کالی راتوں کے سودے کرتی تھی۔

پولیس جو آئی تھی اس کے ساتھ سب انسپکٹر رام دیال تھا۔ اس نے ٹائیگر کو حیرت سے دیکھا۔ ملکہ حسن ہندیانی لہجے میں بولی۔

”انسپکٹر۔۔۔۔۔ یہی چور ہے۔۔۔۔۔ اس نے رتن کمار کے ساتھ مل کر پارٹی میں میرا ہار چرایا تھا۔ اندھرا کر کے۔۔۔۔۔ اس کی تلاشی لیں۔ اس کے پاس میرا ہار ہے۔“

”میں نہیں جانتا ہوں۔“ سب انسپکٹر رام دیال نے کہا۔ ”آپ مسٹر دیو کمار ہیں۔ پرائیویٹ سرائے رساں۔۔۔۔۔ آپ نے مجھے اس روز کے مہمانوں کی جو فہرست دی تھی اس میں ان کا نام نہیں تھا۔۔۔۔۔ ان کا رتن کمار سے دور کا تعلق بھی نہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔۔۔“ ملکہ حسن نے ٹکرائی۔ ”یہ میرا ہار مجھے تیس لاکھ میں بیچنے لایا ہے۔ آپ تلاشی لے کر دیکھ لیں۔۔۔۔۔ اس کی جیب میں ہار رکھا ہوا ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ رام دیال نے حیرت سے کہا۔ ”مسٹر دیو کمار کیا صحیح کہہ رہی ہیں۔۔۔۔۔؟“

”جھوٹ۔۔۔۔۔ میرے پاس ہار کہاں سے آسکتا ہے۔“ ٹائیگر نے جواب دیا۔

”پھر تم یہاں آئے کس لئے۔۔۔۔۔ کیا میری شکل دیکھنے۔۔۔۔۔؟“ ملکہ حسن پھنکاری۔

”میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ اگر میں نے ہار کا پتہ چلا لیا اور برآمد کر لیا تو کیا مجھے بھی دس فیصد کمیشن مل سکتا ہے؟“ ٹائیگر بولا۔

”یہ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا ہے۔ اس کا بارہ چڑھ گیا۔“ آپ اس کی تلاشی کیوں نہیں لے رہے ہیں؟“ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ میں تلاشی دیئے دیتا ہوں۔“

ٹائیگر نے ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار کر صوفے پر ڈال دیئے۔ اب وہ صرف اندر ویر میں تھا۔ اس نے ملکہ حسن سے کہا۔

”شریستی جی۔۔۔۔۔! کہیں تو اندر ویر بھی اتار دوں۔۔۔۔۔“

ملکہ حسن کی سیکریٹری مانی برہم ہو کر بولی۔ ”تمہیں شرم نہیں آتی عورتوں کے سامنے اس حالت میں آتے ہوئے۔۔۔۔۔“

”شرم کس بات کی۔۔۔۔۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”شرم کی ماں کا دیہانت ہونے ساٹھ برس ہو گئے۔ جب عورتوں کو برہنہ ہونے شرم نہیں آتی ہے تو مردوں کو بھلا کیوں آنے لگی۔۔۔۔۔ تم بھی تو اپنی فلموں میں بے حجاب ہوتی رہی ہو۔۔۔۔۔ تمہاری باس کی خواہش تھی کہ میری تلاشی لی جائے۔ میں نے اس کی ضد پوری کی ہے۔ تم میرے کپڑوں کی تلاشی لے لو۔“

مانی نے فوراً ہی ٹائیگر کے کپڑوں کی تلاشی لے لی۔ دور دور تک ہار کا پتا نہیں تھا۔ پھر اس نے کپڑے پہن لئے۔ پھر وہ رام دیال سے بولا۔

”اچھا اب مجھے اجازت دیں۔ آپ گواہ ہیں کہ میرے پاس ہار نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔“

پھر وہ رام دیال سے گرم جوشی سے مصافحہ کر کے باہر آیا۔ پھر اس نے دربان کو کوشری کے پاس پہنچ کر کہا۔

”میرے اخبار کارول تو دے دو کپور بابا۔۔۔۔۔!“

دربان نے میز پر رکھا ہوا اخبار کارول اٹھا کر اسے دے دیا۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔

ٹائیگر رات سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو اسے اپنی قسمت کی خوش نصیبی پر یقین نہیں آیا۔ اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ الماس کا ہار اس کی دولت میں اضافہ کر دے گا۔ وہ تو بڑی نیک نیتی سے ہار لوٹا نے کیا تھا۔ اس کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا اس نے ملکہ حسن کو بہت بڑی چوٹ دے دی تھی۔۔۔۔۔ کفرانِ نعمت تھی۔ وہ ٹھکرانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ ہار ملکہ حسن کے باپ کا نہیں تھا بلکہ اس کی کالی رات کا معاوضہ تھا۔ پھر اس نے اس ہار کو بیچنے میں دیر نہیں کی۔ سندھی لاریٹ میں گولڈن جیولری شاپ کا مالک چوری کا مال خریدتا تھا۔ مول تول کے بعد اس نے اسی لاکھ کی رقم ادا کر دی۔ جب کہ ٹائیگر کے ایک اندازے کے مطابق اس کی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ تھی۔

☆.....☆.....☆

ٹائیگر بنگلور جا رہا تھا۔ اسے ہندوستان کے تمام شہروں میں بنگلور سب سے زیادہ پسند اس لئے تھا کہ اس جیسا خوب صورت شہر کوئی اور نہ تھا۔ آب و ہوا معتدل تھی۔ جون اور جولائی میں رات کو کبیل اوٹھ کر سونا پڑتا تھا۔ اس نے وہاں ایک مکان خرید کر رکھا تھا۔ اس کی ڈپٹی کیٹ چابی پڑوس میں جو برکت اللہ صاحب رہتے تھے ان کے پاس ہوتی تھی تاکہ کراف صفا کر سکیں۔

اسے ریل گاڑی کا سفر بہت زیادہ پسند تھا۔ ابھی گاڑی کی روانگی میں خاصی دیر تھی۔ اس لئے بھی کہ وہ ابھی بھری نہیں تھی۔ مسافر ایک ایک کر کے بڑے سکون و اطمینان سے آرہے تھے۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر بھاٹک رہا تھا۔ ہندو، مسلم، مسیحی اور سکھ مرد اور عورتیں پلیٹ فارم پر آ جا رہے تھے۔ مسلمان عورتوں میں پردے کا رواج تھا۔ برقع بھی تھا۔ چادر بھی تھی۔ وقت گزاری کے

لئے وہ پلیٹ فارم کی چہل پہل سے مخطوط ہو رہا تھا۔ وقت گزاری کے لئے اس کے پاس کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔

کچھ دیر بعد ایک جوان جوڑا لوگی میں داخل ہوا اور ٹائیگر کی سامنے والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ انہوں نے قلی کی مٹھی گرم کر کے ٹکٹ حاصل کئے تھے۔ ٹائیگر کو اس بات کا اندازہ ان کی بات چیت سے ہوا تھا۔

لڑکی سیاہ رنگ کے برقع میں تھی۔ اس نے ہاتھوں میں سیاہ دستان پہن رکھے تھے اور اس کے موزے اور سینڈل بھی سیاہ تھے۔ نقاب میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ چوں کہ وہ برقعے میں لمبوس تھی اور ہاتھوں میں دستان کے باعث ٹائیگر اس کی عمر کا اندازہ نہیں کر سکا تھا۔

ٹائیگر نے لمحے بھر کے لئے سوچا کہ وہ کب تک برقعے میں اس طرح لمبوس رہے گی۔ اس جوڑے کو رخصت کرنے کوئی نہیں آیا تھا۔ ٹائیگر نے ان کے سامان کا جائزہ لیا۔ ان کے پاس صرف ایک اچھی، دتی بیک اور بریف کیس تھا۔ ایک پلاسٹک باسکٹ بھی جس سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بے سفر پر جا رہے ہیں۔ یہ بوکی صرف مخصوص قسمی لمبے سفر والوں کے لئے۔

جب گاڑی چل پڑی اور اس نے بیس منٹ کی مسافت طے کر لی تب اس لڑکی نے برقع اتارا اور بڑے سلیقے سے تہہ کر کے دتی بیک میں رکھ دیا۔ ٹائیگر کو حیرت ہوئی۔ وہ بیٹھنے کے بعد بھی برقع اتار سکتی تھی یا گاڑی کے روانہ ہوتے ہی۔۔۔۔۔ بیس منٹ بعد اتارنا یہ اسرار اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ تب اس نے اس جوان جوڑے کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا وہ اس کے سامنے والی سیٹ پر تھے۔ گو کہ یہ جوان جوڑا تو تھا۔ لیکن کچھ بے جوڑ سا تھا۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہ تھی۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان کے معاشرے میں یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ آئے دن بے جوڑ شادیاں ہوتی رہتی تھیں اور ایسے بہت سارے جوڑے سرعام نظر آتے تھے۔ اسے نہ صرف حیرت بلکہ دکھ بھی ہوتا تھا۔ پھر وہ یہ سوچتا تھا کہ بنانے والے نے ان کا جوڑ کسی مصلحت کے تحت بنایا

ہے۔ جوڑے تو آسمان پر ہی بنتے ہیں..... ایسی ناانصافیوں میں ایک جانب گھروالوں کی پسماندگی ہوتی ہے تو دوسری طرف کچھ ایسی مجبوریوں ہوتی ہیں کہ آدمی بندھ کر رہ جاتا ہے۔ ایک ازدواجی زندگی کا طویل سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہوتا ہے۔

اسے درحقیقت اس بے جوڑے کی شادی کا پس منظر کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔ اسے لڑکے پر نہ جانے کیوں بے حد ترس آیا اور دکھ سا محسوس ہوا۔ ایسا لگا کہ وہ کسی مجبوری کے باعث قربانی کی بجینٹ چڑھ گیا ہے اس کی اس لڑکی سے شادی میں اس کی مرضی اور پسند کا دخل کسی صورت اسے محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

لڑکے کی عمر تیس اٹھائیس برس یا اس سے ایک دو برس زیادہ ہوگی۔ لیکن وہ زیادہ عمر کا کسی بھی لحاظ سے معلوم نہیں دیتا تھا۔ وہ نہ صرف خوب رو بلکہ ایسا وجہہ جوان تھا جو ہزاروں میں ایک دکھائی دیتے ہیں۔ دراز قامت نے اس کی وجاہت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ اس جوان لڑکے کی بیوی کی عمر ٹائیگر کے ایک اندازے کے مطابق پچیس چھبیس برس ہوگی۔ اس کے چہرے پر اور متناسب جسم اور درمیانہ قد کی وجہ سے اس کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا۔ ویسے اس کے اندازے غلط ہی ثابت ہوتے تھے۔ لڑکی کی رنگت گہری سائولی تھی..... اس کی بڑی بڑی بے حد سیاہ آنکھیں روشن اور چمک سی تھیں لیکن چہرے کے نقش و نگار میں ٹیکھا پن یا ایسی کوئی جاذبیت بھی نہیں تھی جو دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔

ایک بات جو ٹائیگر کو بہت عجیب اور پراسرار سی لگی تھی۔ وہ یہ کہ انٹیشن سے ڈبے میں اس وقت سوار ہوئے تھے جب گاڑی کی روڈاگ کی دوسری ویل بجی تھی۔ وہ دونوں ویننگ روم سے اس طرح باہر آئے تھے جیسے قید خانے سے نکلے ہوں۔ انہوں نے قلی کو صرف اٹیچی کیس اور دستی بیگ تھما دیا تھا۔ لڑکے کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بالکل نیا اور بڑا سا بریف کیس تھا جسے اس نے بڑی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا جیسے کوئی چھین نہ لے اور اس میں

خزانہ بھرا ہوا ہو۔ لڑکی نے ایک بڑا سا پیکٹ اٹھا رکھا تھا۔ وہ یہ سامان بڑی آسانی سے خود بھی اٹھا کر لاسکتے تھے۔ چون کہ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر جھانک رہا تھا۔ اس لئے ان کی ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ یہ شخص اتفاق تھا کہ ان کی نشستیں اس کی نشست کے مقابل اور کھڑکی کے ساتھ تھیں۔

اس کے دوسرے ہم سفروں کے پاس اس قدر ساز و سامان تھا کہ وہ رستے میں بے ترتیبی سے نہ صرف بکھرا ہوا پڑا تھا بلکہ آمدورفت میں رکاوٹ بن گیا تھا بلکہ بیٹھے ہوئے لوگوں کے لئے بھی تکلیف دہ اور پریشانی کا باعث ہو رہا تھا۔ اس کے لئے جگہ بنانے اور ترتیب سے رکھنے کے لئے ایک انفرادی اور بد نظمی سی مچی ہوئی تھی۔ بڑی دیر میں بدقت تمام سامان ترتیب سے رکھا جا سکا۔ گاڑی تیز رفتاری سے سفر کر رہی تھی۔ وقت گزاری کے لئے ضروری تھا کہ آپس میں گفتگو کی جائے۔ اور ایک دوسرے سے متعارف ہو یا جائے۔ اس لئے کہ یہ بس کا نہیں بلکہ ریل گاڑی کا سفر تھا۔ موضوعات کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اسے بنگلور جانا تھا۔ کسی قریبی اسٹیشن پر اتارنا بھی نہیں تھا۔ اس نے ہی سکوت کو توڑنے میں پہل کی۔

”آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟“ لڑکے کو شاید اس بات کی توقع نہیں تھی کہ وہ اس سے کچھ پوچھے گا۔ وہ یک لخت اس طرح سے گھبرا گیا تھا جیسے وہ کوئی مجرم ہو اور کسی پولیس افسر نے سوال کر لیا ہو۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گیا اور پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔ اسے جواب دینے میں جھجکی ہو رہی تھی۔ تاہم اس نے خود کو سنبھالا کہ قدرے تامل کے بعد جواب دیا۔

”جی..... ہم بنگلور جا رہے ہیں۔“ اس نے اپنے بشرے یا اپنے کسی رد عمل سے یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ لڑکے کی بات سن کر چونک گیا ہے۔ جب لڑکے کے عمل اور اس کی اضطرابی کیفیت نے ٹائیگر کو چونکا دیا تھا۔ اور پھر وہ شک و شبہ میں مبتلا ہو گیا۔

اس کے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی زندگی میں رابطہ جرم پیشہ لوگوں سے پڑنا چلا آ رہا تھا۔ ایک طویل عرصہ سے ہر بات کو نہ صرف شکی مزاج سے دیکھنا بلکہ چونکنا اس کی فطرت سی بن گئی تھی جس سے وہ باز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ سرائے میں بیٹھا تھا۔ ایک طرح سے اس کے اندر جیسے کوئی خفیہ پولیس افسر تھا۔ اس لئے جب کسی کی حرکات و سکنات عجیب اور پراسرار سی لگتی تو اسے ایک عجیب سی بے چینی ہونے لگتی تھی۔ اس لئے وہ بے چینی کی اہر کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

اور پھر یکا یک اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی تھی۔ ٹائیگر کا قیاس بتا رہا تھا کہ یہ جوڑا ہرگز شادی شدہ نہیں ہے بلکہ وہ دونوں اپنے اپنے گھروں سے بھاگ کر بنگلور جا رہے ہیں..... اس بریف کیس میں وہ نقدی اور زیورات ہوں گے جو لڑکی اپنے گھر سے لے کر آئی ہے۔ عموماً اس طرح کی لڑکیاں بری بے رحمی سے اپنے گھروں میں جھاڑ دھیرتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ عشق کے جنون میں اندھی ہو جاتی ہیں۔ وہ نہ صرف سوچنے سمجھنے سے قاصر ہو جاتی ہیں اور انہیں کچھ بھائی نہیں دیتا ہے۔ لڑکیوں میں عقل تو ہوتی ہے نہیں..... عشق کی راہ میں قدم قدم پر فربہ کھاتی رہتی ہیں۔

ٹائیگر کے ذہن میں ایک بات اور آئی تھی کہ لڑکے نے لڑکی کو بے وقوف بنانے کے لئے اس کے حسن کی خوب تعریف کی ہوگی..... اس حسن کا دور دور کوئی پتا اور نام و نشان نہیں تھا جو ایک لڑکی محسوس کرتی ہے۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوگی۔ اس کی اس کمزوری سے لڑکے نے فائدہ اٹھایا ہوگا..... اس نے نہ صرف اس کی تعریف کے پل باندھ دیئے ہوں گے۔ لڑکی نے بڑے خواب دیکھے ہوں گے۔ پھر وہ اپنے آپ کو واقعی خوب صورت سمجھی ہوگی اور اس لڑکے کی جھولی میں کسی کے پھل کی طرح گر پڑی ہوگی۔ لڑکے نے تجویز دی ہوگی۔ بنگلور جا کر شادی کر لیں گے۔ شادی اور مستقبل کے خیال سے وہ گھر سے رقم اور زیورات لے کر فرار ہو رہی ہوگی۔ یقیناً لڑکی نے اونچا ہاتھ ہی مارا ہوگا۔ اس کے گھر والے

یقیناً خوش حال اور دولت مند بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ لاکھوں ہی لے جا رہی ہوگی۔ جب ٹائیگر نے خیالات کے گرداب سے نکل کر تھوڑی دیر بعد کسی بہانے سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اسے نظروں کی گرفت میں لے کر لڑکی کے چہرے پر نظریں مرکوز کیں تو اس کا قیاس درست ثابت ہوا اور وہ ریت کے تودے کی طرح ڈھس گیا۔ گو لڑکی عام شکل و صورت کی تھی۔ لیکن اپنی صورت سے اس قماش کی دکھائی نہیں دیتی تھی کہ وہ عشق کے جنون میں اپنے آپ کو لڑکے کو سب کچھ سوپ دے اور اس کی جھولی میں کپے پھل کی طرح ٹپک پڑے..... اور اپنا گھر بار ایک لڑکے کی خاطر چھوڑ دے اور اس کے ساتھ آنکھیں بند کر کے بھاگ نکلے۔ ایسی لڑکیاں اور ہوتی تھیں۔

وہ اپنے چہرے مہرے اور وضیع قطع سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نفیس مزاج کی لڑکی اسے لگی تھی۔ اس کے لب و لہجے کی نفاست اور شانستگی اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ لڑکی کا تعلق کسی اچھے اور اعلیٰ گھرانے سے ہے۔ وہ یوں ہی ہر طرح سے پرسکون نظر آ رہی تھی۔ اس کے بشرے سے کسی بے چینی اور ذرہ برابر اضطراب ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ جو عموماً گھروں سے فرار ہونے والی اکثر لڑکیوں کی حرکات و سکنات اور چہروں پر دکھائی دے جاتا ہے..... اگر وہ واقعی اپنے گھر اور ضمیر کی مجرم ہوتی تو ندی کی طرح پرسکون نہیں ہوتی اور اس کا وجود ہر لمحہ مرتعش رہتا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی شوخی نہیں بلکہ انجانے خوف کی لرزیدگی ہوتی.....

اس لڑکی کی برعکس اس کے ساتھی لڑکے کی ظاہری حالت قدرے مختلف تھی۔ وہ اپنی اندرونی اضطرابی کیفیت کو بے وقت تمام دہائے ہوئے تھا۔ وہ مضطرب سا ہو کر بار بار بریف کیس کو کسی نہ کسی بہانے دیکھتا جو اس کے پاس ہی رکھا تھا..... جسے اس کا بس چلے تو اسے سینے سے لگالے یا اپنی آغوش میں بھر لے۔ جب کسی کی نگاہیں غیر ارادی طور پر اس خوب صورت سے بریف کیس کی طرف اٹھ جاتیں تو وہ ایک دم سے چونکنا ہو جاتا اور اس

تخص کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے لگتا۔ چہرہ متغیر سا ہونے لگتا۔

ٹائیگر کا تجسس برابر بڑھتا رہا جو ایک قدرتی اور فطری امر تھا۔ اس کا شک اس یقین میں تبدیل ہو چکا تھا کہ اس بریف کیس میں ہزاروں کے نہیں بلکہ لاکھوں کے زیورات موجود ہیں۔ اس لئے وہ ہر نگاہ پر کسی بھی ہوئی ہرنی کی طرح چوکنا ہو جاتا ہے اور اس بریف کیس سے ایک لمحے کے لئے غافل نہیں ہو رہا ہے۔ ایک اسٹیشن پر جب گاڑی سگنل نہ ملنے کی وجہ سے چند لمحوں کے لئے رکی اور ایک گشتی سپاہی نہ جانے کی کی تلاش میں یوگی میں جھانکا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ لرزے کا مریض بن گیا۔ سوائے ٹائیگر کے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اگر کوئی ہم سفر نہ اس کا بے لہو چہرہ دیکھتا تو شک میں پڑ جاتا یا پھر اس سے پوچھتا کہ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا.....؟

لیکن دوسری طرف لڑکی کی طمانیت مشکوک کورنچ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس بریف کیس میں لڑکی کے اپنے زیورات ہوتے تو وہ زیادہ پریشان اور محتاط ہوتی۔ ٹائیگر کے خیال میں لڑکا ایسی حماقت کرنے سے رہا کہ وہ اپنے ہی گھر پر ڈاکا مارے یا پھر اس بریف کیس میں کوئی ایسی چیز تھی جس نے لڑکے کو ہوشیار اور چوکنا رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسی عجیب سی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا کہ جب کہ کبھی اور کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور پھر اس سے اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

جب شام کے گہرے سائے رات کی تاریکی میں ہم آغوش ہونے لگے جب پوری یوگی میں ایک پچھلی سی پیدا ہو گئی۔ چوں کہ رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا اس لئے مسافر اپنے ناشتے دان کھولے اور دسترخوان بچھا کر کھانا چننے لگے۔ ٹائیگر کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے اسٹیشن پر صرف ایک پیالی چائے پی لی تھی۔ ہم سفروں میں صرف وہ ایک ایسا شخص تھا جس کے پاس کھانا نہیں تھا۔ اسے پیچھے تاسا ہو رہا تھا کہ اس نے اسٹیشن پر کسی مسلم ریستورنٹ سے بریانی پارسل کیوں نہیں کرائی تھی۔ ٹرین

میں ڈانگ کا رہتی تھی جس میں ویجٹریئن کھانے دستیاب تھے لیکن ممبئی اسٹیشن کے مسلم ریستورنٹ کی بریانی بڑی لذیذ اور ذائقہ دار ہوتی تھی۔ اسے دو ایک مرتبہ کھانے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر خاصی دیر کھڑی رہی تھی۔ اس ہوٹل کے باوردی ویجٹریئن گزرے تھے۔ تب اسے دھیان نہیں آیا تھا کہ رات کے کھانے کا وہ کیا کرے گا۔ اب اسے ویجٹریئن کھانے پر اٹھار کرنا تھا۔ اس نے سوچا کہ کسی اسٹیشن پر گاڑی رکی یا ڈانگنگ کار کا کوئی ویجٹریئن گزرے گا تو لے لے گا۔ ایک ویجٹریئن اس نے معذرت کی اور کہا کہ صرف چائے یا کافی یا کولڈ ڈرنکس مل سکتی ہے۔ اس نے بتایا کہ اب جو اسٹیشن آنے والا ہے وہ پینتالیس منٹ بعد..... شاید وہاں کھانا مل جائے۔ ٹائیگر کے پیٹ میں چونے دوڑنے لگے تھے۔ لیکن اب صبر کے سوا چارہ نہیں تھا۔

لڑکی نے اور والی برتھ سے اپنا پرس اٹھایا اور اسے برتھ پر رکھ کر کھولا۔ ٹائیگر نے نہ چاہتے ہوئے بھی ادھر دیکھا۔ شامی کباب، فرائی قیہ اور روٹنی پرائیڈوں کے ساتھ سلاد اور پودینے کی چٹنی بھی تھی۔ گتے کی رکابیاں بھی تھیں۔ لڑکی نے ایک رکابی میں دو پرائیڈ رکھے۔ پھر دوسری رکابی میں اس نے بڑے سلیٹے اور قرینے سے دو ابلے ہوئے انڈے، دو شامی کباب، قیہ چٹنی اور سلاد رکھا۔ پھر اس نے اپنے سر اور سینے پر دو پٹا درست کیا۔ پھر ان دونوں رکابیوں کو اپنے دونوں ہاتھ میں اٹھا کر ایک تخت ٹائیگر کی طرف گھومی۔ پھر اس نے ٹائیگر کو اپنا نیت بھرے لہجے میں مخاطب کر کے کہا۔

”یہ لیجئے انکل.....! آپ بھی کھانا کھالیں۔“

ٹائیگر کو اس لڑکی سے اس قسم کے سلوک کی توقع نہیں تھی۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک اجنبی لڑکی گھر کے فرد کی طرح پیش آنے کی۔ لڑکی نے اسے رسمی طور پر دعوت دینے کے بجائے عملی طور پر ایک انجانے خلوص اور جذبے کا اظہار کیا تھا۔ اس لڑکی کی مہمان نوازی اور اپنائیت نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔ ٹائیگر نے چونک کر رسمی طور پر شیم دلی سے انکار کیا اور کہا۔

”آپ لوگ بسم اللہ کریں..... تھوڑی دیر میں اسٹیشن آنے والا ہے۔ میں اسٹیشن سے لے لوں گا۔“

”انکل..... پلیز.....! اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ اس میں لاجب بھی تھی۔ وہ ٹائیگر سے اس طرح پیش آ رہی تھی جیسے وہ واقعی اس کا انکل ہو۔“ اسی نے ہم دونوں کے لئے کتنا سارا کھانا تیار کر کے دے دیا ہے..... اتنا سارا کون کھائے گا..... ہم سفر غیر مذہب ہیں وہ کباب اور قیہ کا گوشت کہاں کھاتے ہیں۔ ورنہ میں انہیں بھی پیش کر دیتی۔ اور پھر ریلوے کے کھانے پر بے کیوں برباد کرتے ہیں..... ان کے کھانے کھا کر آدمی برباد ہو جاتا ہے۔“

آخری جملہ ادا کرتے وقت اس لڑکی کا لہجہ قدرے شوخ ہو گیا تھا۔ وہ بڑی خوش مزاج اور زندہ دل واقع ہوئی تھی۔ ٹائیگر نے مجبوراً اس پر خلوص لڑکی کے آگے ہتھیرا ڈال دیے تھے۔

اسی تو قورمہ، چکن کرائی اور مرغ بریانی اور نہ ہانے کیا کیا پکا کر دینا چاہ رہی تھیں جیسے ہم تین چار دن کے سفر پر جا رہے ہیں۔“

لڑکی نے لڑکے کی طرف شوخ نظروں سے دیکھا تو لڑکا معنی خیز انداز سے مسکرا کر رہ گیا۔ ”جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں شاید کھانا نہیں ملے گا.....“ وہ ہنس پڑی۔

اب ٹائیگر کے لئے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر شکوک کے جو گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے وہ ایک ایک کر کے چھٹ گئے تھے۔ اب اس کی نظروں کے سامنے صاف و شفاف اور نکھر ا ہوا آسمان تھا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا ہوگا کہ بنگلور میں اس نے ایک مکان خرید کر رکھا ہوا ہے۔ اس کا چھوٹا موٹا پلاسٹک کاروبار ہے۔ وہ مکان میں کچھ دن رہنے جا رہا ہے۔ جو خالی پڑا ہوا۔

وہ سمجھ گیا کہ اس بریف کیس میں نہ صرف کچھ نقد ہے بلکہ شادی کے زیورات موجود ہیں۔ جوان کی اپنی ملکیت ہے۔ ظاہر ہے ایک جوہری نے اپنی بیٹی کو جہیز میں قیمتی زیورات دیئے ہوں گے۔ ان زیورات کے عوض لڑکا بک گیا تھا جب کہ اس لڑکے کو فروخت ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی خوب صورتی اور وجاہت سے فائدہ اٹھا کر کسی بھی بڑے گھر کا داماد بن سکتا تھا اور اسے بیوی بھی حسین و جمیل مل جاتی۔ یہ شاید علت پسند تھا یا پھر اس نے

کسی خاص مقصد سے اس لڑکی سے شادی کر لی تھی۔

زندگی کے اس سفر میں لڑکا واقعی بڑا ہی خوش نصیب تھا کہ اسے عطیہ جیسی بیوی ملی تھی جو ہر لحاظ سے ایک مکمل عورت تھی..... ایک روایتی عورت جو گنگی بندھی ڈگر پر بل کر گھر کو جنت کا نمونہ بناتی ہے اور شوہر پرست ہوتی ہے۔ ایک مرد ایسی بیوی پر بجا طور پر ناز اور فخر کر سکتا تھا۔ ایسی مثالی لڑکیاں خال خال ہی مظاہرے میں نظر آتی تھیں۔

پونا اسٹیشن پر گاڑی رکی تو اس نے ٹائیکر اسے اور سرفراز کے لئے بھی چائے منگوائی۔ اس نے ٹائیکر کو چائے کے پیسے دیئے نہیں دیئے تھے۔ اس نے اپنا پرس جو اٹھٹی سے نکالا تھا اس میں سے چائے کے پیسے نکال کر دیئے تھے۔ جب ٹائیکر نے خاناچے والے کو بلا کر اپنی پسند کے سگریٹ کے بارے میں پوچھا تو اس نے ٹائیکر کو دو پیکٹ کے بھی پیسے دیئے تھے۔ جب اس نے احتجاج کیا اور پیسے دینے لگے تو وہ بہن کی طرح روٹھنے لگی۔ ٹائیکر کو ایسا لگا کہ جیسے وہ اپنی بہن کو اس کی سسرال چھوڑے جا رہا ہو۔ اس میں اور عطیہ میں بہت ساری باتیں مشترک تھیں۔ عطیہ کے خلوص..... اپنائیت کے جذبے اور محبت آئیز برتاؤ نے اس کے اندر یہ جذبہ بیدار کیا تھا وہ اس کی زندگی کے لئے دعا کرے۔

مارچ کا مہینہ تھا۔ باہر کا موسم بڑا خوشگوار اور دلکش سا ہو گیا۔ بہار کا موسم عجب بہادرے رہا تھا..... اور پھر عطیہ کی باتوں اور بے حد خلصانہ برتاؤ سے فرحت بخش ہو کر دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔ عطیہ نے سفر کو بڑا سہانا بنادیا تھا۔ اور اسے بالکل بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اکیلا سفر کر رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر عطیہ سے سفر میں ملاقات نہ ہوتی تو وہ نہ صرف تنہائی محسوس کرتا بلکہ بڑی بوریت بھی محسوس کرتا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ عطیہ کو اس کی سسرال چھوڑ کر لوٹ رہا ہے۔ اس سے اس کی طبیعت پر ایک گہری یاسیت اور اداسی چھا گئی تھی۔ جس کا اس نے دل پر گہرا اثر لیا تھا۔ نائیک لڑکیوں کے بارے میں بہت جذباتی ہوتا تھا۔ اسے ایسا بھی لگ رہا تھا کہ

عطیہ سے جیسے کوئی انجانا رشتہ ہو۔

سرفراز ایک طرح سے اس سے الگ تھلگ ہی رہا۔ ٹانگیگر نے اندازہ کیا کہ وہ شاید بریف کیس میں موجودہ دولت کے باعث اس سے اور دوسرے ہم سفروں سے میل جول بڑھانے میں احتیاط برت رہا ہے۔ جب اس نے ٹانگیگر کو زیادہ لفٹ نہیں دی تو وہ بھلا اس کی کیا پرواہ کرتا۔ اور سمجھتا کہ تم جو اس قدر محتاط اور چمکنا ہو رہے ہو اس سے ہم صرف شک کر سکتے ہیں کہ بریف کیس میں یقیناً مال بھرا ہوا ہے۔ وہ عطیہ سے بہت گھل گیا۔ کیوں کہ آخر وہ ایک سونا جیسی لڑکی تھی۔ اس سے اس طرح پیش آرہی تھی وہ جسے اس کے خاندان کا کوئی فرد ہو۔

جب مسافر سونے کی تیاری کرنے لگے تو اوپر والی برتھوں پر سرفراز اور مائیکہ آسنے سامنے لیٹ گئے تھے۔ درمیان والی برتھوں پر عطیہ اور ایک برتھ پوٹ عورت اپنے نوزائیدہ بچے کے ساتھ لیٹ گئی۔ برتھ پوٹ عورت کے سخت گیر شوہر نے جو ایک کشمیری پٹھان تھا سیٹوں کے درمیان چادر لگا کر پردہ تان دیا تھا تاکہ اس کی بیوی سکون و اطمینان اور آزادی سے سو سکے۔ وہ سب سے نیچے برتھ پر دراز ہو گیا۔ مائیکہ کو اس لئے دراز ہوتے ہی نیند آ گئی اور جلد ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا کہ موسم اور خوش گوار اور حسین ہو گیا تھا۔ خنک ہوانے جیسے اوریاں دے کر سلا دیا ہو۔

کسی اور ایشین پر گاڑی رکی تو پلیٹ فارم پر مسافروں اور قلیوں کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید کوئی جتنکشن تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی لیکن تھی کہ کسی ہرجانی مجبور کی طرح روشمی ہوئی تھی۔ اس نے سرفرازی کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں جاگ رہا تھا۔ شاید اس کی آنکھ بھی شور کی وجہ سے کھل گئی تھی۔ اس نے برف کیس کو سر ہانے رکھ کر نکیہ بنایا ہوا تھا۔ اگر کوئی برف کیس کو اس کے سر کے نیچے سے برف کیس کھینچتا تو اس کی آنکھ ضرور کھل جاتی۔

عظیہ درمیانی برتھ پر لیٹی ہوئی تھی وہ نکل کر فرش پر

کھڑی ہو گئی۔ اس نے اس کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور کہا۔

”انکل.....! کیا آپ بھی جاگ رہے ہیں.....؟“
 آپ تو لیٹتے ہی سو گئے تھے؟“

”میں شور سے بیدار ہوا ہوں..... ورنہ کہری نیند
 سوچا ہوتا۔“

”آپ جاگ ہی گئے ہیں تو چائے پی لیں.....
 آپ کے لئے میں چائے منگوا کرتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”بھئی..... مجھے چائے
 نہیں بلکہ نیند پیاری ہے..... چائے تو نیند کی دشمن ہوتی
 ہے..... اب میں نے دو گھونٹ چائے پی بھی لی تو ساری
 رات سوئیں سکوں گا..... لہذا مجھے معاف ہی رکھو۔“

عطیہ اس کی باتیں سن کر مسکرا اٹھی۔ پھر اس نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر چائے والے کو آواز دی۔ جب وہ کھڑکی کے پاس آیا تو اس نے چائے والے کو چائے کے لئے کہا..... ٹانگہ بنے سونے کی کوشش کی۔ آنکھیں موند لیں۔ لیکن وہ اس حالت میں کسی کی بھی حرکات و سکنات دیکھ سکتا تھا۔ عطیہ نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے بیس روپے کا نوٹ نکالا تو اس نے ایک چھوٹی سی پڑیا کو پرس سے نکل کر فرش پر گر گرتے ہوئے دیکھا۔ عطیہ نے فوراً ہی بجلی کی سی سرعت سے جھک کر اس پڑیا کو اس طرح سے اٹھایا جیسے وہ کوئی قیمتی ہیرا ہو..... پھر اس نے اس پڑیا کو بائیں ہاتھ کی مٹھی میں اس طرح سے دبایا کہ جیسے اسے کسی کی نظروں میں لانا نہ چاہتی ہو۔ عطیہ کی اس حرکت نے اسے بری طرح جھوٹا دیا۔

دونوں پیالیاں لے کر مڑنے سے پہلے ٹائنگر کی طرف دیکھا..... وہ سوتا بن گیا اور لمبی لمبی سانس لے کر یہ تاثر دینے لگا کہ وہ گہری نیند سو گیا ہے۔

دوسرے لمحے عطیہ نے اسے دسی آواز میں مخاطب کیا۔ ”انکل!..... آپ چائے پئیں گے؟“

جب ٹائیگر نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو اس نے دونوں پیالیاں لے لیں۔ پھر اس نے سرفراز کی طرف دیکھا..... سرفراز آنکھیں بند کئے اچانے تصور میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا خوب صورت چہرہ جانے کن خیلوں سے دکھ رہا تھا اور اس کے رخ پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ بھی کھیل رہی تھی جیسے سکندر کی طرح ساری دنیا کو فتح کر لیا ہو۔

عطیہ نے بڑی سرعت سے پلٹ کر چائے کی
دونوں بیالیاں اپنی برتھ کے بستر کے قریب رکھ دیں۔
پھر اس نے گریبان سے پڑیا نکال لی۔ اس نے وہ پڑیا
گریبان میں رکھ لی تھی وہ دیکھ نہیں سکا تھا۔ جب اس
نے بغیر کسی تاخیر کے وہ پڑیا کھولی تو اس کے ہاتھ میں
کیپکپاہٹ پیدا ہو گئی تھی جس پر اس نے جلد ہی قابو
پالیا تھا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے گرد و پیش کا جائزہ لے کر اپنا اچھی طرح سے اطمینان کر کے پڑیا کا سارا سفوف ایک پیانا میں ڈال دیا۔ وہ اس قدر محتاط ہو گئی تھی کہ خالی پڑیا کو کھڑکی کے راستے باہر بھینچنے میں پل بھر کی بھی دیر نہیں کی تھی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ اس نے دوپٹے کے پہلو سے پیشانی کے پسینے کو جذب کیا اور ایک گہرا سانس لیا۔

پھر اس نے فوراً ہی شستری میں سے بیچ اٹھا کر اس
سفوف کو چائے میں گھولنے لگی۔ وہ چند لمحے تیزی سے چیخ
چلاتی رہی۔ جب اسے اچھی طرح اس بات کا اطمینان
ہو گیا کہ سفوف چائے میں اچھی طرح سے حل ہو گیا ہے تو
اس نے چیخ نکال کر شستری میں رکھا۔ اس دوران اس کے
چہرے پر پسینہ بھٹوٹ پڑا تھا۔ اس نے اسے دوپٹے میں
جذب کیا۔ اچھی طرح سے چہرہ پونچھا۔ پھر اس نے سر پر

دو ہٹا کر درست کیا۔ پھر چائے کی پیالی دائیں ہاتھ میں اٹھائی۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ سے سرفراز کا بازو ہلایا جو گہری نیند میں غرق تھا۔

چند ثانیوں کے بعد سرفراز نے بیدار ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟“
عطیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔ اس کے شوخ لہجے میں ہلکا سا طنز تھا جو صاف طور پر محسوس ہوتا تھا۔

”سرتاج چائے لیجئے۔۔۔۔۔! کنیز نے آپ کے لئے چائے منگوائی ہے۔“

سرفراز نے چونک کر پہلے تو بریف کیس کی جانب نگاہ کی۔ پھر اس نے اپنی دونوں آنکھیں ملیں۔ پھر اس نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے تڑنگ کے عالم میں پوچھا۔

”کون سی جناب۔۔۔۔۔؟“
”ریلوے اسٹیشن کی۔۔۔۔۔“ عطیہ گنگنائی۔

سرفراز اٹھا اور بریف کیس سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ عطیہ کے ہاتھ سے چھائے کی پیالی لیتے ہوئے مسکرایا۔

”آپ کی اس نوازش کا بہت بہت شکریہ۔۔۔۔۔“
آپ میری ہر بات کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔“

”آپ بہت ہی ہوشیار۔۔۔۔۔ بادشاہ سلامت۔۔۔۔۔“ عطیہ نے اسے جیکھی نظروں سے دیکھا۔

”اس میں ہوشیاری کی کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“
سرفراز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”بادشاہ سلامت۔۔۔۔۔! اس میں ہوشیاری کی کیا بات ہے نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔۔۔۔۔؟ آپ میری ہر نوازش کو شکریے پر ٹال دیتے ہیں۔۔۔۔۔ کوئی انعام و اکرام سے نوازتے نہیں ہیں۔“ وہ شرارت کے انداز میں آہستگی سے بولی۔

”وقت آنے پر ہم اپنی ملکہ عالیہ کو ایسی فیاضی سے نوازیں گے کہ۔۔۔۔۔ آپ زندگی بھر فراموش نہیں کر سکیں گی۔۔۔۔۔ آپ نے ہمارا دل کہاں دیکھا ہے۔۔۔۔۔؟“ سرفراز

نے متکبرانہ لہجے میں کہا۔

”کنیز۔۔۔۔۔ اس روز کا بے تابی سے انتظار کرتی رہے گی۔۔۔۔۔“ عطیہ نے نورس بجاتے ہوئے کہا۔

”آپ فکر مند نہ ہوں۔۔۔۔۔ وہ دن بہت جلد آپ کی زندگی میں طلوع ہونے والا ہے۔۔۔۔۔“ سرفراز نے کہا۔
”ہم اس دن کا انتظار کریں گے بادشاہ سلامت۔۔۔۔۔!“ عطیہ نے کہا۔

”بس۔۔۔۔۔ وہ دن۔۔۔۔۔ دو ایک دن میں ہی آجائے گا۔۔۔۔۔ آپ ہم پر بھروسہ رکھیں۔“

عطیہ جانے کس خیال میں لپا سی گئی اور وہ اس لمحے ٹائیکر کو بہت اچھی لگی۔ اس لمحے اس کے چہرے پر حیا سے ایک نکھار آ گیا تھا۔ جس نے عجیب سی جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ لیکن وہ سمجھ گیا کہ عطیہ اپنی اداکاری اور عیاری کا جو ہر دکھا رہی ہے۔ وہ بڑے بھولین اور سادگی سے سرفراز کو بے وقوف بنارہی ہے۔ اس بات کا ٹائیکر کو اندازہ نہ تھا کہ وہ اس قدر تیز لڑکی ہے۔ کسی دودھاری تلوار کی طرح۔

صاحب زادے عطیہ کو لپاتے دیکھ کر کھل اٹھے۔ انہوں نے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی پکڑ رکھی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے عطیہ کی کلائی پکڑ لی تو وہ سرخ ہو گئی۔
”کچھ تو خیال کیجئے۔۔۔۔۔ یہ ریل گاڑی ہے۔۔۔۔۔ بیڈروم نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”تم اس قدر حسین دکھائی دے رہی ہو کہ دل قابو میں نہیں آ رہا ہے۔“ سرفراز نے شاعرانہ انداز میں کہا۔

عطیہ نے فوراً ہی اپنے آپ کو اس خول سے باہر نکالا اور غیر محسوس انداز سے اپنے کلائی چھڑائی اور بولی۔

”عالی جاہ۔۔۔۔۔! چائے ویسے ہی ٹھنڈی ہوئی جارہی ہے۔ اگر آپ کا فرمان شایہ جاری رہا تو برف بن جائے گی۔“

”ٹھنڈی ہو رہی ہے تو اسے پھینک دو اور دوسری گرم چائے منگوا لو۔۔۔۔۔“ سرفراز نے کہا۔

”اب اتنا وقت نہیں رہا کہ چائے کا انتظار کیا جائے۔۔۔۔۔ یوں بھی چائے کے اسٹال پر بہت رش

ہے۔۔۔۔۔ چائے پوری طرح ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے۔۔۔۔۔ نیم گرم تو ہے۔“ عطیہ نے فوراً ہی کہا۔

”اگر ایسی بات ہے تو زہر مار کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔“
سرفراز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سرفراز نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کڑوا سا منہ بنایا۔ ”کیا واہیات چائے ہے۔ میں نے کبھی ایسی چائے نہیں پی۔“

”یہ چائے ریلوے پلیٹ فارم کی ہے۔ آپ کے شاہی باورچی خانے کی نہیں ہے۔“ عطیہ نے جھٹ سے جواب دیا۔ پھر وہ چائے کا گھونٹ لے کر بولی۔ ”آخر میں بھی تو پی رہی ہوں۔۔۔۔۔ ایسی خراب بھی تو نہیں ہے۔“
”میں نہیں پیوں گا یہ کڑوی سیکی چائے۔“ اس نے چائے کی پیالی عطیہ کی طرف بڑھائی۔

”چائے نہیں پیو گے تو اپنی نیند کیسے بھگاؤ گے۔۔۔۔۔؟“ عطیہ نے سراپیمہ ہو کر اس کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

”کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں رات بھر نہیں سوؤں۔۔۔۔۔“ سرفراز نے الجھ کر کہا۔ ”جاگتا رہوں۔۔۔۔۔“

”تمہیں دیکھتا ہوں۔“
”اگر تمہیں نیند آگئی تو سمجھو کہ۔۔۔۔۔“ عطیہ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ مجھے تو اس بات کا دھیان ہی نہیں رہا۔“
سرفراز نے چونک کر بریف کیس کی طرف دیکھا۔

”عالی جاہ۔۔۔۔۔! گھوڑے بیچ کر نہیں بلکہ تخت و تاج بیچ کر سو رہے تھے۔ میں نہیں جگاتی اور چائے نہیں منگوائی تو۔۔۔۔۔ عالی جاہ کی آنکھ شاید بنگور جا کر چھڑتی۔۔۔۔۔“
چائے پیتے نیند بھاگ جائے گی۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”نیند کیا۔۔۔۔۔ شیطان بھی بھاگ جائے گا۔“
سرفراز نے ایک ہی سانس میں چائے حلق سے اتار لی۔

پھر اس نے ہر اسامہ بنایا۔ اس چائے سے تو کسی بھی سرکاری اسپتال اور ڈسپنسری کی کچھ لاکھ روپے بہتر ہوگا۔ کیا نہیں ہو سکتا کہ کسی اور سے چائے لے لو۔“

”وہ کس لئے۔۔۔۔۔؟“ عطیہ نے سوالیہ نظروں

سے دیکھا۔ ”اس چائے سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔“
”منہ کا ذائقہ بہت خراب ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ اچھی چائے کی بڑی طلب ہو رہی ہے۔“ سرفراز نے کہا۔

”گاڑی چلنے والی ہے۔“ عطیہ نے اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے لی۔ ”تم جاگتے رہو گے۔۔۔۔۔ کسی اور اسٹیشن سے تمہیں اچھی چائے پلا دوں گی۔ پہلے میں پی کر دیکھوں گی۔۔۔۔۔ اچھی لگی تو عالی جاہ کی خدمت میں پیش کروں گی۔“

ٹائیکر نے عطیہ کے چہرے پر ایک فاتح جرنیل کی سی مسکراہٹ دیکھی۔۔۔۔۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کنکڑاتی جلیوں کی پلک دکھائی دے رہی تھی۔۔۔۔۔ سرفراز نے جو پوری چائے پی لی تو اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ جیسے اس کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ اور اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہو گئے ہوں۔ جب چائے والا اپنی پیالیاں لینے آیا تو اس نے نہ صرف دس روپے بخشش اور چائے کے پیسے دیئے اور اس پر اپنی کامیابی پر سرشاری سی تھی۔

ٹائیکر تو کب سے اپنی جگہ پر لیٹا ہوا عطیہ کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی حیرت دوچند ہوئی جارہی تھی۔ ایک سیدھی سادی لڑکی نے یکایک اپنا چولا بدل کر اسے جیسے اوپر برتھ سے نیچے گرا دیا تھا۔ اس کے ذہن پر ہتھوڑے پڑنے لگے۔۔۔۔۔ اس کے ذہن میں خیالات گڈمڈ ہونے لگے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہ رہ سکا کہ درحقیقت وہ دونوں میاں بیوی نہیں ہیں بلکہ میاں بیوی کا ڈرامہ رچا کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔ ورنہ وہ کچھ دیر پہلے ایک میاں بیوی کئی مسافروں کی موجودگی میں وہ گہری نیند سو ہی کیوں نہ رہے ہوں ایسے شوخ اور محبت بھرے انداز میں بات نہیں کر سکتے۔ میاں بیوی یوں بھی صاف پہچانے جاتے ہیں۔ یہ دونوں تو فکری رومانی جوڑا بنے ہوئے تھے۔

لیکن دوسری طرف اس کی بد صورت محبوبہ نے اس کی چھائی ہوئی ساری بساط الٹ دی تھی۔۔۔۔۔ شہ مات کے اس مات کھیل میں عطیہ کا پلہ بھاری تھا۔ اس کے دل

میں شاید لالچ آگیا تھا۔ وہ ایک خطرناک اور طرح دیتی ہوئی..... گہری اور تنہلی ہوئی عورت دکھائی دے رہی تھی..... اس نے سرفراز کی چائے میں نیند یا بے ہوشی کی دوامدادی تھی کہ جیسے ہی سرفراز پر بے ہوشی طاری ہو جائے تو وہ بریف کیس لے کر کسی انشٹین پر اتر جائے گی..... ٹائنگر کا زیادہ اس بات کا امکان ہے کہ عطیہ کا کوئی ساتھی اس گاڑی میں موجود ہو اور اس کی موجودگی کے باعث ہی اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہو۔

یہ بچوں کا کھیل نہیں تھا اور ایک عام قسم کی لڑکی اتنی ہمت سے یہ کام کر سکتی تھی..... لیکن ٹائنگر نے بھی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ..... وہ عطیہ کو اپنے ارادوں میں کسی قیمت پر کامیاب نہیں ہونے دے گا۔

عطیہ اب اس کے لئے بہت ہی پر اسرار اور شاطر قسم کی لڑکی بن گئی تھی..... اب اس کے دل کے کسی کونے میں عطیہ کے لئے ہمدردی کی رقت بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی پیشہ ورانہ زندگی اور سراغ رسانی کے کاموں میں اسے بہت ساری ایسی نو جوان اور شادی شدہ لڑکیوں سے واسطہ پڑا اور پڑتا تھا کہ جو مجرم ہوتی تھیں..... لیکن ان میں کوئی عطیہ کی طرح ہوشیار..... ذہین اور خطرناک نہیں تھی جس سے اس کا واسطہ پڑا ہو۔ ایک بھولی بھالی لڑکی سے وہ اس طرح کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

جب عطیہ اپنی برتھ پر جا کر لیٹ گئی اور جلد ہی گہری نیند میں ڈوب گئی تو اسے نہ صرف اپنے خیالات جھٹک دینا بلکہ بدل دینا بھی پڑے تھے۔ عطیہ نے اسے بری طرح چکرا دیا تھا۔ بلکہ بھونچکا بھی کر دیا تھا۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا کہ..... آخر اس نے پڑا چائے میں گھول کر کیوں پلائی تھی؟؟؟ آخر اس پڑا میں کون سی دوا تھی.....؟ وہ اس کے متعلق جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔

اس کے دماغ میں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ کیوں کہ اس کے اندر جو سراغ رساں وہ پوری بیدار ہو کر اس پر اسرار معاملے کی تہ میں پہنچنے کے لئے میدان میں آگیا تھا۔ یہ عجیب کیس تھا جو اس کے لئے فرق نہیں پڑتا

تھا۔ وہ سونے کی کوشش کے باوجود سونہیں سکا تھا اور اس معاملے کو صبح تک کے لئے موقوف کر دیا تھا..... اور پھر وہ سوتا بھی کیسے.....؟ کیوں کہ زندگی میں پہلے اسے ایک ایسی لڑکی سے واسطہ پڑنا تھا جس نے اس کے برسوں کے تجربے کو چیلنج کر دیا تھا اور پھر اس کی تمام صلاحیتوں کو ناکارہ بنادیا تھا..... اب اس کی قابلیت کا ایک کڑا امتحان تھا..... آزمائش تھی..... اس کے اندر محسوس کا ایک طوفان بھرا ہوا تھا..... ایک نادیدہ آواز جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی..... اس کے کانوں میں گرم گرم سیسہ افٹیل رہی تھی..... ٹائنگر تم ایک عام قسم کی لڑکی سے ہار گئے..... تمہارے سارے اندازے غلط نکلے.....

وہ لیٹا لیٹا..... آنکھوں پر بازو رکھے عطیہ پر نگاہیں مرکوز کئے ہوئے تھا۔ عطیہ مکمل طور پر اس کی نظروں کی گرفت میں تھی۔ وہ بڑے سکون و اطمینان سے گہری نیند سو رہی تھی..... اور وہ ایک اتنی ہی طرح اسے دیکھ رہا تھا اور جاگ رہا تھا..... آخر کیوں اور کس لئے.....؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

کوئی بیس پچیس منٹ کے بعد وہ پیک لخت بیدار ہو گئی۔ اس کے خیال میں وہ سوئیں رہی تھی۔ اس لئے کہ اگر وہ سو رہی ہو تو اس طرح بیدار نہیں ہوتی۔ اس نے بیدار ہونے کے بعد ایک لمبی سی انگڑائی لی۔ دو پٹا سینے اور شانے پر درست کرنے کے بعد اپنی لمبی چوٹی کو پشت پر ڈال دیا۔ پھر اس نے دتی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر وہ اپنا سراپا سمیٹ کر اور غیر محسوس انداز سے برتھ سے اتر آئی۔

اس کی یہ حرکت بھی بڑی پر اسرار اور چونکا دینے والی تھی۔ اس نے فرش پر بیٹھ رکھے۔ آہٹ بالکل بیدار نہیں ہوئی..... جب وہ چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد اس کی طرف گھولی تو اس نے فوراً ہی اپنی آنکھیں بند کر لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

چند ثانیوں کے بعد اس نے عطیہ کی طرف نیم وا آنکھوں سے دیکھا تو وہ سرفراز کا شانہ ہلار رہی تھی۔ سرفراز نہیں جاگا۔ کیوں کہ اس پر بے ہوشی طاری

تھی..... کیا بارگی عطیہ نے اسے بری طرح جھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ تب بھی نہیں جاگا..... عطیہ نے اس کی چائے میں جو بے ہوشی کی دوا گھول دی تھی اس نے اپنا اثر دکھایا تھا..... جب عطیہ کو سرفراز کی بے ہوشی کا پورا یقین ہو گیا تو اس کے لیوں پر ایک زہر خند مسکراہٹ ابھرا آئی اور چہرے پر سفاکی چھا گئی..... جب اس نے اپنے دونوں ہاتھ سرفراز کی طرف بڑھائے تو وہ سمجھا کہ سرفراز کو برتھ سے فرش پر گرا دے گی اور اسے کھرکی سے باہر پھینک دے گی لیکن اس کا یہ قیاس غلط ثابت ہوا۔ اس نے فوراً ہی سرفراز کے سر کے نیچے سے بریف کیس کھینچ لیا۔

وہ چونکا ہوا گیا۔ اب اس بریف کیس اور واردات کا کلائمکس آگیا تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ گاڑی کے انشٹین پر رکتے ہی وہ بریف کیس لے کر اتر جائے گی۔ گاڑی تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ جو بھی انشٹین آنے والا تھا اس میں خاصی دیر تھی۔ وہ بریف کیس اپنی گود میں لئے بیٹھی تھی۔ بڑے سکون و اطمینان سے کہ سرفراز اب بیدار ہونے سے رہا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس میں نہ تو کوئی اضطراب تھا اور نہ ہی کوئی بے چینی..... بشرے اور آنکھوں سے کوئی ڈر اور خوف کا اظہار تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ اپنی برتھ سے اتری۔ پھر اس نے بریف کیس برتھ پر رکھا۔ جب وہ تالے کا نمبر سیٹ کرنے لگی تو اس کی انگلیوں میں ہلکا سا ناراض تھا..... وہ چونک کر اس کی حرکات و سکنات کو دیکھنے لگا۔ چند ثانیوں کی دیر بھی نہیں لگی۔ ایک ہلکی سی کھٹاک ہوئی۔ بریف کیس کھل گیا۔ اسی لمحے اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور اس طرح خیرہ ہو گئیں کہ اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا۔ جب اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ بریف کیس میں ہیرے جواہرات کے اچھے خاصے زیورات بھرے ہوئے تھے۔ ان کی مالیت کسی بھی طرح ساٹھ ستر لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔ اس کا قیاس درست ثابت ہوا تھا کہ بریف کیس میں زیورات ہوں گے۔ لیکن وہ یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ بریف کیس میں اس قدر زیورات بھی ہو سکتے ہیں۔

اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ سرفراز نے یہ سارے زیورات ڈیکٹی کی واردات حاصل کر کے کئے ہیں۔ اس نے بہت ہی اونچا ہاتھ مارا تھا..... کہیں ایسا تو نہیں کہ سرفراز نے عطیہ کے والد کی دکان پر ڈاک مار کر جھاڑ پھیر دی ہو اور عطیہ نے محبت کے اندھے جنون میں اس سے تعاون کیا ہو..... سرفراز ایک ایسا خوب صورت، وجیہ اور دراز قدم مرد تھا کہ اس کے حصول کے لئے ایک عورت بہت دور تک جاسکتی تھی..... عطیہ نے منزل پانے کے لئے اپنے باپ کو بھی نہیں بخشا تھا۔ وہ بڑی خود غرض بن گئی تھی جو حیرت سے زیادہ دکھ کی بات تھی..... اب کس پر بھروسہ کیا جائے..... ایک بیٹی نے اپنے ماں باپ پر رحم نہیں کھایا تھا ان کی پشت میں سختی القہی سے چھرا گھونپ دیا تھا۔

عطیہ نے ان زیورات پر ایک اچھی سی نگاہ ڈالی اور اپنا ہاتھ بڑھا کر بریف کیس کے اس حصے کی تلاشی لی جہاں کاغذات رکھے جاتے ہیں۔ جب اس کا ہاتھ اس حصے سے باہر آیا تو اس میں ایک بڑا لفافہ دبا ہوا تھا۔ عطیہ نے لفافہ کا ہر نکال کر بریف کیس کو بند کر دیا۔ پھر اس نے غلج اور اضطراب کی کیفیت میں لفافے کے اندر سے کاغذات نکال کر بریف کیس پر پھیلا دیئے..... ان میں پاسپورٹ کے علاوہ غیر ملکی کرنسی بھی تھی۔ پھر ان تمام کاغذات، پاسپورٹ اور کرنسی کو لفافے میں واپس ڈال دیئے۔ پھر اس نے اپنی اپنی اوپر والی برتھ سے اٹھائی جو سرفراز کی پانسی رکھی ہوئی تھی۔ اس اپنی کو کجول کر اپنے کپڑوں کی تہ میں اس لفافے کو چھپا دیا۔ پھر اس نے اپنی کوچھی طرح سے مقفل کر کے دوبارہ ایسی جگہ رکھ دیا اور اس کی چابی پرس میں رکھ کر ایک گہری سانس لی۔

نہ صرف اس کا چہرہ دمک رہا تھا بلکہ اس کی آنکھیں بھی چمک اٹھی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ہزاروں طاقت ور برقی قہقہے جل اٹھے ہوں۔ پھر اس نے بڑی غلج سے بریف کیس کو مقفل کیا۔ پھر اس کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنے ہم سفروں کا جائزہ لیا اور انہیں گہری نیند میں ڈوبا پا کر اس طرح کھل اٹھی کہ جیسے اس

نے بہت کچھ پالیا ہو..... مگر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر تباہی کی کیفیت پیدا ہوگئی اور اس کی آنکھوں سے ایک پیشور قاتل کی سی سفاکی جھانکنے لگی..... اگر سرفراز یا کوئی بھی اس لمحے اس کا چہرہ دیکھ لیتا تو وہ یقیناً ڈر جاتا عطیہ کے چہرے کے تاثرات اس قدر بھیانک تھے کہ وہ تنگ رہ گیا تھا۔

عطیہ نے بریف کیس اٹھایا تو اس کا خیال تھا کہ اسے واپس اپنی جگہ رکھ دے گی..... کیوں کہ اسے لگانے کی ضرورت تھی جو اس نے ایک چور کی طرح بریس کیس سے چرا کر اسٹیج میں رکھ لیا تھا..... اس نے بریف کیس کو سرفراز کے سر ہانے رکھنے کے بجائے کھڑکی سے باہر پھینک دیا..... گہرے سناٹے میں ریل کے پھولوں کی جو گڑگڑاہٹ گونج رہی تھی اس کے شور میں بریف کیس کے کسی چیز سے ٹکرانے کی آواز آئی اور پھر ڈوب گئی۔

عطیہ کی اس غیر متوقع حرکت سے وہ سناٹے میں آ گیا اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

وہ اس لمحے ایسا مبہوت ہوا جیسے اس کی نظروں کے سامنے موت کا فرشتہ آ گیا ہو۔ اس کی نظروں کو بالکل یقین نہیں آیا کہ ایک لڑکی ہیرے جواہرات کے زیورات سے بھرا ہوا بریف کیس اس سنگ دلی سے باہر پھینک سکتی ہے..... اس بریف کیس میں جیسے ہیرے جواہرات نہیں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا ہے۔

اس لمحے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ عطیہ نے یہ حرکت کیوں کی؟ کس لئے کی؟ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ وہ سرفراز سے کسی بات کا انتظام لینے پر تلی ہوئی ہے..... اپنی ذات اور سرفراز کو قانون کے لمبے ہاتھوں سے بچانے کے لئے اس نے نہریلے سانپوں سے بھرا ہوا بریف کیس باہر پھینک دیا تاکہ وہ دونوں ڈس لئے نہ جائیں..... ان کی زندگی اجڑ کر ویران نہ ہو جائے۔ جو ان زیورات سے کہیں قیمتی اور عزیز تھی..... ایک عورت جو ایسا زور قری کا بیکرہ ہوتی ہے۔

شاید عطیہ نے اس بریف کیس سے وہ لگانہ نکال لیا تھا جس میں ایسے کاغذات تھے جن کی مدد سے پولیس

انہیں گرفتار کر سکتی تھی۔ اس نے ایسا کوئی ثبوت اور نام و نشان رہنے نہیں دیا جو پولیس کے ہاتھ لگ سکے۔

اس کے دل میں فوری طور پر خیال آیا کہ کیوں نہ وہ زنجیر کھینچ کر گاڑی رکوالے تاکہ معاملے کی تفتیش ہو سکے۔ جہاں بریف کیس پھینکا گیا وہاں سے گاڑی نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔ بریف کیس کو با آسانی تھوڑی ہی دیر میں تلاش کیا جاسکتا تھا۔ ورنہ دن کے اجالے میں اگر وہ کسی کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو ایسی صورت میں زیورات کی بازیابی مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی۔ جسے یہ زیورات ملیں گے وہ اتنا احمق نہیں ہوگا کہ پولیس کے حوالے کر دے اور پھر اس دنیا میں اب ایمان داری اور فرض شناسی کہاں رہی تھی..... اور پھر ان زیورات کو پانے اپنا مستقبل تباہ کیا جاسکتا تھا۔ ان زیورات کو پولیس کے حوالے کرنے کا مطلب اپنے پیروں پر کھڑی مارتے کے مترادف تھا۔

اس نے اٹھنا چاہا تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا..... اس پر نیند اور کمزوری کا سا غلبہ کچھ ایسا تھا کہ وہ بے بس سا ہو کر رہ گیا تھا..... اس نے اپنی پوری قوت جمع کی لیکن بے سود..... مرغن کھانوں کا نشہ ایسا تھا کہ وہ اسے توڑ نہ سکا..... اس کے بس کا روگ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کوئی کارروائی کر سکے..... اس لئے اس نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا تھا لیکن ایک خیال آیا کہ عطیہ نے مجھے پونا اسٹیشن پر چائے پلائی تھی۔ اس میں کوئی نیند کی گولی تو نہیں تھی؟..... ایسا لگا کہ اس کے باعث اس کی یہ حالت ہو رہی تھی..... اس نے بھی ایسی کیفیت محسوس نہیں کی تھی..... یہ شرارت عطیہ کی ہی تھی۔

وہ غنودگی کے عالم میں عطیہ اور سرفراز کو باری باری دیکھ لیتا تھا۔ عطیہ تو واقعی گھوڑے بچ کر سوئی تھی۔ جب کہ سرفراز پر بے ہوشی طاری تھی۔ اب اسے صبح سے پہلے ہوش نہیں آسکتا تھا۔ بے ہوشی کی دوائے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک سنسنی خیز ڈرامے کا آغاز ہوا وہ بھی اس کا ایک کردار بن گیا تھا..... اس کے ذمے جو فرض تھا اس کے پیش نظر اسے اپنا دامن آلودگی

سے بچا کر ان دونوں کو جو واقعی کسی ذمہ داری سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے وہ اپنی نیند سے نبرد آزما تھا اور اس کے خلاف متواتر جدوجہد کئے جا رہا تھا..... لیکن نیند سے لڑنا آسان نہیں تھا۔ وہ تختہ دار پر بھی آجاتی تھی۔

وہ دوسرے ایکٹ کا بے چینی سے منتظر تھا کہ جب سرفراز بیدار ہوگا اور اپنا بریف کیس نہیں پائے گا تو اس کا رد عمل کیا ہوگا؟..... اس دوسرے ایکٹ کے آغاز کے لئے مجھے دو کھنکے شدید کرب اور اذیت سے گزارنا تھے۔ جان لیوا انتظار کرنا تھا.....

سرفراز کی آنکھ رات کے پچھلے پہر کھلی۔

وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ اس وقت اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ اس قدر نارمل ہو چکا تھا کہ آسانی سے کروٹیں لے سکتا تھا اور اٹھ بیٹھ سکتا تھا۔ توانائی بھی جیسے لوٹ آئی تھی۔ اب کمزوری نہیں رہی تھی۔ عطیہ نے اس کی چائے میں کچھ نہیں ملایا تھا۔ اسے عطیہ پر اس لئے شک ہوا تھا کہ اس نے سرفراز کی چائے میں بے ہوشی کا سفوف ملایا تھا۔ وہ کمزوری اور ٹھنکن کے باعث نیند کے شدید غلبے میں آ گیا تھا۔ اس لئے بھی کہ وہ دونوں سے جاگا ہوا تھا اور ایک کیس کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔

سرفراز بیدار ہونے کے بعد بڑی دیر تک خلا میں گھومتا رہا اور نجانے کیا سوچتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک مرتبہ سببی خیر مسکراہٹ ابھری تھی۔ اس کا چہرہ تھوڑی دیر تک سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری رہا تھا جیسے اس کا ذہن بالکل ہی خالی ہو گیا ہو..... اس کی آنکھیں ایک عجیب سی چمک لئے ہوئے تھیں۔

ایک نکتہ وہ اس طرح سے چونکا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو..... اس نے اپنا دایاں بازو کسی سانپ کی طرح سر ہانے لہرایا۔ پھر اس کے ہاتھ نے ادھر ادھر بریف کیس کو ڈھونڈا..... اس کا وجود ہوتا تو اس کے ہاتھ سے ٹکراتا..... جب اس کے ہاتھ نے بریف کیس کو

نہیں پایا تو وہ بدحواس ہو کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا..... ٹائیگر نے اپنی آنکھیں ایک خیال کے زیر اثر بند کر لیں اور سوتا بن گیا..... وہ سرفراز پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ رات پیش آنے والا ڈرامہ دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ جو نہایت دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔

اس نے چند لمحوں کے بعد کھسک پھری کی آوازیں سن کر آنکھیں کھول دیں..... سرفراز..... عطیہ کو چکا کر بریف کیس کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر ہوا نیاں اڑ رہی تھیں اور وہ ہلدی کی مانند زرد ہو رہا تھا..... اس عالم میں سرفراز کا چہرہ بڑا ہی خوف ناک دکھائی دے رہا تھا۔ اگر اس نے ہاتھ کا سہارا نہ لیا ہوتا تو تیور اٹھ کر فرش پر گر پڑتا۔

ٹائیگر دل ہی دل میں عطیہ کی بے مثال اداکاری پر اس اٹھ کر اٹھا۔ وہ بھٹی بھٹی وحشت زدہ آنکھوں سے سرفراز کو دیکھ رہی تھی..... اس کا چہرہ متوحش تھا..... اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے موتی بن کر دمک رہے تھے..... اس نے سرفراز کا بازو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا جیسے وہ سرفراز کا سارا نہایتی تو پیروں پر کھڑا ہونا دشوار ہو جاتا اور گر پڑتی۔

یہ دوسرا ایکٹ بڑا بھر پور تھا اور کامیابی سے جاری تھا۔ عطیہ نے جیسے اداکاری میں ساری دنیا کی اداکاروں کو مات دے دی تھی۔

عورت واقعی بہت بڑی اداکارہ ہوتی ہے۔ اس سے کوئی جیت نہیں سکتا..... ساتھ ہی دو دھاری ٹکوار بھی..... جب اس نے کھٹک کر اپنی بیداری کا احساس دلایا تو ان دونوں نے ایک ساتھ گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے.....؟“ خیریت تو ہے.....!“

ٹائیگر نے باری باری ان کے چہرے دیکھ کر پوچھا۔ سرفراز اس کی برتھ کی طرف آیا۔ اس نے اپنا چہرہ ہوا حیران چہرہ اوپر اٹھایا..... وہ ٹائیگر سے کچھ کہنا چاہتا تھا..... اس کے کپکپاتے ہونٹوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا تو اس نے اپنا سر ہاتھ کے کنارے ٹیک دیا اور سسک پڑا۔

ٹائیگر نے عطیہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ سرفراز کے پاس سے ہٹ کر آئی اور پھر اس نے کہا۔
 ”وسم اٹکل..... خیریت نہیں ہے..... ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے..... ہم تباہ ہو گئے ہیں۔“
 ”آخر بات کیا ہے؟“ ٹائیگر نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے پوچھا۔
 ”اٹکل..... اٹکل..... ہمارا بریف کیس چوری ہو گیا ہے۔“ عطیہ نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔
 ”بریف کیس چوری ہو گیا ہے۔“
 وہ انجان بن گیا..... اس نے حیرت اور دکھ کا اظہار کیا..... اس نے دانستہ اپنی نگاہیں عطیہ کے چہرے پر مرکوز رکھیں۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“
 ”سوئے میں خوشی چرا کر لے گیا۔“ عطیہ نے جواب دیا۔ ”سرفراز اور میں گہری نیند سو گئے تھے..... چور نے ہماری گہری نیند اور غفلت سے فائدہ اٹھایا.....“ اس کی آواز بھرا سی گئی۔
 ”لیکن سرفراز نے اسے سر کے نیچے رکھ کر تکیہ بنایا ہوا تھا۔“
 ”ٹائیگر نے تعجب ہونے کی اداکاری کی.....“
 ”چور نے اتنا بڑا بریف کیس سر کے نیچے سے نکال لیا اور یہ بیدار بھی نہیں ہوئے۔“
 ”معلوم نہیں رات مجھے کیسے اس قدر گہری نیند آگئی تھی کہ..... چور کے میرے سر کے نیچے سے بریف کیس نکالتے وقت میری آنکھیں کھل سکی۔“
 سرفراز بہت دقت تمام لرزیدگی سے بول پایا۔ ”اس وقت بھی مجھ پر نیند کا ساغلب ہے جیسے میں نے خواب آور گولیاں کھالی ہوں۔ ایک نشہ ساز دوا ہو رہا ہے۔“ اس نے سر کو جھٹک دیا۔
 ”کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے سونے سے قبل نیند کی گولی کھائی ہو۔“ اس نے دانستہ عجیب سا سوال کیا تھا۔
 ”نہیں.....“ سرفراز نے سر ہلایا۔ ”مجھے اس کی کیا ضرورت ہے کہ جو میں نیند کی گولیاں کھاؤں۔“
 ”شاید کسی ذہنی دباؤ کے باعث!“ اس نے

کہا۔ ”آج ہر شخص کسی نہ کسی ٹینشن کا شکار ہے۔ چاہے وہ جوان ہو یا بوڑھا..... امیر ہو یا غریب..... اس لئے آج کل نفسیاتی مرلیضوں اور نفسیاتی اسپتالوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔“
 ”نہیں..... مجھے کوئی ٹینشن نہیں ہے اور نہ ہی میں نے آج تک نیند کی گولی کھائی ہے اور نہ ہی اس کی شکل دیکھی ہے۔“ اور اس کا نام بھی معلوم نہیں ہے۔“
 سرفراز نے جواب دیا۔ ”مجھے ریل گاڑی میں نیند نہیں آئی۔ آج نہ جانے کیسے آگئی تھی۔“
 ”آخراں بریف کیس میں تھا کیا جو تم دونوں اس قدر پریشان نظر آ رہے ہو۔“ اس نے چیتیتی ہوئی نظروں سے سرفراز کی آنکھوں میں جھانکا۔ عطیہ کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔
 سرفراز ٹائیگر کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکا۔ اس نے نظریں پٹی کر لیں اور اس کا چہرہ مستحضر ہو گیا اور وہ اس کی بات کا جواب دینے میں پچھلیا۔ سرفراز اسے اعتماد میں نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ تفصیل بتانے سے کس لئے گریز کر رہا ہے۔ وہ اس کی وجہ سمجھتا تھا۔
 چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اس نے سرفراز کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بے پرواہی سے اندھیرے میں تیر چلایا۔
 ”اگر اس بریف کیس میں کوئی خاص اور قیمتی چیزیں نہیں ہیں تو یہ سمجھو کہ جان و مال کا صدقہ گیا۔“
 بہت بڑی افتاد مل گئی ہے۔ لہذا دکھ نہ کرو۔ اللہ نے چاہا تو تم لوگوں کی ہر مصیبت حل جائے گی۔“
 ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی ریلوے اسٹیشن پر چوری کی واردات کی رپورٹ درج کرادیں؟“ عطیہ نے کہا۔
 ”رپورٹ درج کرانا ہے تو کرادیں..... لیکن میری ایک بات نوٹ کر لیں کہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔“ ٹائیگر نے مشورہ دیا۔
 ”وہ کس لئے اٹکل.....!“ عطیہ نے غم زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا پولیس اس بریف کو تلاش یا بازیاب نہیں

کر سکے گی؟ اس لئے کہ رپورٹ درج کراتے ہی وہ فوراً اس کی تلاش شروع کر دے گی۔“ صبح ہونے تک وہ مل جائے گا؟“
 ”اس لئے کہ پولیس کی کارکردگی بڑی ستر ہوتی ہے..... کسی نوجوان لڑکی یا کوئی فائدہ مند چیز ہو جس سے ان کی جیبیں بھر جائیں تو وہ اس کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں اور پھر وہ بڑی رقم کی طلب گار ہوتی ہیں۔“ ٹائیگر نے کہا۔
 ”اور پھر تمہارا بریف کیس عام بریف کیس کے مقابلے میں بڑا اور بے حد قیمتی دکھائی دیتا تھا..... اگر محض اس بریف کیس کی بازیابی کا مقصد ہے تو ریلوے پولیس میں اس کی رپورٹ کرنا فضول ثابت ہوگا۔ کیوں کہ جب تک بریف کیس تمہارے ہاتھ لگے گا تم اس کی صورت بھی پہچان نہ سکو گے۔ اس کا حشر نشر ہو چکا ہوگا۔“
 ”اس بریف کیس کے اندر جو کچھ بھی تھا کیا وہ پورا نہیں مل سکے گا؟“ عطیہ نے بڑی سادگی سے پوچھا۔
 ”اس نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر تائید کی..... تم ٹھیک کہتی ہو۔ عموماً چوری ہونے والی چیزیں پوری طرح ہاتھ نہیں لگتی ہیں۔ کالی بیسٹریں اس پڑا کارنامہ ہیں..... ان سے مال بردار کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔“
 ”اب ہم صبر کر کے بیٹھ جائیں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا.....؟“ عطیہ کی آواز اس کے گلے میں رندہ گئی۔
 ”میرے خیال میں اب اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔“ اس نے عطیہ کو دلا سادیا۔
 ”اٹکل آپ بیجا فرماتے ہیں۔“ عطیہ نے گہری سانس لی اور اس کے چہرے پر کرب سا چھا گیا۔ ”جب کوئی چیز ہمارے مقدر میں نہیں ہے تو ہم کربھی کیا سکتے ہیں..... جو چیز جانتا تھی وہ چل گئی۔“
 ”تم سنا گئی ہو.....“ سرفراز نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔ ”اس بریف کیس میں نہ صرف ہمارے زیورات ہیں بلکہ بے حد مال کا غنڈا بھی تھے۔ وہ کاغذات نہ ملے تو میں لٹ جاؤں گا۔“ برباد ہو جاؤں گا۔ میں زندگی بھر کہیں ملازمت نہیں کر سکوں گا۔“
 ”کیا تم یہ بات نہیں جانتے ہو کہ چوری ہونے

والی چیزیں آسانی سے دوبارہ ہاتھ نہیں لگتی ہیں..... یہ ہندوستانی پولیس ہے۔ امریکہ یا یورپ کی نہیں.....“ عطیہ کہنے لگی۔ ”ذہنیت کی بڑی بڑی وارداتیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں..... بینک اور بڑے بڑے ادارے لٹ جاتے ہیں..... کیا کبھی چور یا ڈاکو پکڑا گیا..... جو یہ پکڑا جائے گا؟“
 ”تو کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر خاموش بیٹھ جائیں۔“ سرفراز نے تیز لہجے میں کہا۔
 ”تمہیں شاید اس پر بہت غم ہو رہا ہے کہ میرے زیورات چوری ہو گئے..... میرے زیورات گئے تو یہ سمجھو کہ سر سے کوئی بڑی بلا مل گئی..... زیورات کا کیا ہے۔ جب تم کمانے لگو گے تو اور بن جائیں گے۔“
 ”تم کیسی عورت ہو جو تمہیں اپنے زیورات کے چوری ہونے کا کوئی صدمہ نہیں ہو رہا ہے؟“ سرفراز تیز لہجے میں بول اٹھا۔ ”میں اتنی آسانی سے زیورات اور کاغذات کو ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔ میں ہارے ملک کی پولیس کو ہلا کر رکھ دوں گا۔ تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ مجھے پولیس سے شمتا آتا ہے۔“
 عطیہ نے اس کی نظریں بجا کر سرفراز کی پسلی میں ایک ہلکا سا ٹھوکا دیا تھا۔ وہ شاید یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اس بریف کیس کو چوری کا کیس بت بناؤ۔ ٹائیگر نے اس کا ٹھوکا دیکھ لیا تھا۔ ویسے اس نے جو بھی کہا اس کی باتیں سمجھ داری کی تھیں۔
 سرفراز اپنے آپ میں کہاں تھا۔ وہ بریف کیس کی وجہ سے غم و غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اگر اس کے علم میں یہ بات آجاتی کہ عطیہ نے بریف کیس کو ہاتھ پر پکڑا تھا وہ شاید اس کا گلا دبا کر اسے چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیتا۔ اس نے عطیہ کے ٹھوکے کی کوئی پروا نہیں کی۔ اسے نظر انداز کر کے ہڈیانی لہجے میں کہا۔
 ”گاڑی روکو۔“ زنجیر کھینچو.....“
 ”سرفراز اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ خود کا قبو میں رکھو..... معلوم نہیں بریف کیس کس اسٹیشن پر چوری ہوا۔“ عطیہ نے اسے سمجھایا۔

”تمہیں مشورہ دینے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں..... تم ایک بے وقوف عورت ہو۔“ اس کی آواز اونچی ہوئی۔

”تم ہوش سے کام لو غصے سے نہیں.....“ عطیہ نے تکرار کی۔ ”غصہ ہمیشہ پشیمانی پر ختم ہوتا ہے۔“ سرفراز سے غم و غصے کی کیفیت اور بھولاہٹ میں ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں کہ ڈبے میں سوئے ہوئے سارے مسافر نیند سے بیدار ہو گئے۔ ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ وہ دونوں ایک تماشائ بن گئے۔ لیکن عطیہ خود کو قابو میں کئے رہی تھی۔

گھٹکل جکشن آنے والا تھا۔

مسافروں نے سرفراز اور عطیہ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور ساتھ ہی سوالات کی بوچھاڑ بھی کر دی تھی کہ اس بریف کیس میں کیا تھا۔ عطیہ ان کے سوالات کا جواب دیتی رہی تھی کہ اس میں سونے کا ایک لاکٹ اور سیٹ..... رقم اور ضروری کاغذات بھی تھے۔ مسافر عورتوں نے عطیہ کی بڑی دل جوئی کی۔ ایک عورت نے ان دونوں کے لئے تھرماس میں سے چائے نکال کر پیش کی۔ عطیہ نے چائے پی لی تھی۔ سرفراز نے نہیں پی۔ لیکن اس کی چائے ٹائیگر کو پینا پڑی۔ اس لئے کہ سرفراز کے انکار پر چائے اسے دے دی گئی۔

سرفراز کی حالت بڑی غیر تھی۔ ٹائیگر کے سمجھانے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد مسافر اپنی اپنی نشستوں پر چلے گئے۔ جب گھٹکل جکشن پر گاڑی رکی تو ریلوے پولیس اسٹیشن کے سپاہیوں کو بلا کر رپورٹ درج کرائی گئی۔ جب رپورٹ درج کرائی جا رہی تھی تو عطیہ کا چہرہ قہر ہو رہا تھا۔ اس پر سراپسیکی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کے بسترے سے اس کے دل کا خوف عیاں تھا۔ وہ اس کے پس منظر سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے اس نے آخری وقت تک مخالفت کی تھی اور سرفراز کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ رپورٹ کرانے کی حماقت نہ کرے۔ لیکن وہ باز نہیں آیا تھا اور اپنی ضد پر اڑا رہا تھا۔ لیکن عطیہ جانتی تھی کہ اگر بریف کیس

پولیس کے ہاتھ لگ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ سرفراز کی اپنی کھوپڑی تھی۔ اس لئے اس کی سمجھ میں عطیہ کی بات نہیں آئی تھی اور ہٹ دھرمی دکھاتا رہا۔ اس نے ان کے معاملے میں زیادہ دخل نہیں دیا۔ عطیہ کے کہنے پر اس نے صرف ایک مرتبہ سرفراز کو سمجھایا تھا۔ وہ ایک خاموش تماشائی کی حقیقت سے ڈرامہ دیکھ رہا تھا جو بے حد دلچسپ، تھیرانگیز اور سنسنیز خیز اور قدم قدم پر چونکا دینے والا تھا اور اس کے اشتیاق اور تجسس میں لمحہ بلمحہ بے پناہ اضافہ ہو رہا تھا۔

جب پولیس نے رپورٹ درج کرتے وقت زیورات کی تفصیل پوچھی تو تب کہیں جا کر سرفراز کو ہوش آیا۔ عقل ٹھکانے لگی۔ وہ چکرایا اور گر بڑا سا گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر عطیہ سے کہا۔ ”تمہی بتا دو۔“

”اس بریف کیس میں میرا ایک سات تو لے کا سونے کا سیٹ اور تین سونے کی جڑاؤ انگوٹھیاں تھیں۔“ عطیہ نے بتایا۔

”آپ کو اس کی مالیت کا کچھ اندازہ ہے.....؟“ پولیس افسر نے دریافت کیا۔

”جی نہیں.....“ عطیہ نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ ”میرے والد نے جینر میں دیا تھا۔ والدین مالیت نہیں بتاتے ہیں۔“

”اس بریف کیس میں اور کیا کیا چیزیں تھیں..... رقم کتنی تھی.....؟“

”ان کے میرے نقلی اسناد..... رقم پانچ ہزار تھی۔“ عطیہ بولی۔

عطیہ نے بڑی غلط بیانی سے کام لیا تھا تاکہ پولیس کو غلط راہ پر ڈالا جاسکے۔ پولیس کے اس بریف کیس کو پانے کی صورت پر ان پر آج نہیں آسکتی تھی..... جب کہ بریف کیس میں موجود زیورات کی مالیت لاکھوں کی تھی۔ جب اس میں ہندوستانی کرنسی نہیں بلکہ امریکن ڈالر تھے۔ اس نے کاغذات، ڈالر اپنے اپنی میں رکھ لئے تھے۔ اس نے پولیس کو بڑی خوب صورتی سے بے وقوف بنایا تھا۔ اس نے چپ سا دھ لی۔ کیوں کہ ابھی اس

ڈرامے کا ڈراپ سین کا وقت نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی موقع تھا۔ اس نے واقعات پر کڑی نظر رکھی ہوئی تھی اور غلت پسندی کا مظاہرہ کر کے حالات کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ماحول بڑا پرسرار ہو گیا تھا۔ جس نے اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔

جیسے گاڑی روانہ ہوئی عطیہ کی جان میں جان آئی..... اس نے فوراً ہی اپنی گھبراہٹ اور سراپسیکی پر قابو پایا تھا اور وہ پہلے کی طرح نارمل ہو گئی تھی..... کسی خیال کے تحت اس کے ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم ابھرنے لگا تو اسے دبانے اور اس کی نظروں سے چھپانے کے لئے وہ کھڑکی سے گردن نکال کر باہر جھانکنے لگی اور دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہی تھی۔

عطیہ کی اس حرکت نے ایک بار پھر سے اسے چونکا دیا۔

جب وہ اس کے معنی خیز تبسم کے بارے میں سوچنے لگا تو اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندائیں کر لپکا۔

اب اسے پوری طرح یہ اندازہ ہو گیا کہ عطیہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے..... وہ کسی بھی جرم پیشے سے دو ہاتھ آگے ہے۔ وہ اس عیار لڑکی کی سازش اور گہری چال کو بہت اچھی طرح سے سمجھ چکا تھا۔ اب اس کی نظروں کے سامنے اندھیر اور پردہ نہیں رہا تھا۔ سارے پردے ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے تھے۔ اب اس کا اصل چہرہ سامنے آ گیا تھا۔

عطیہ نے جو بریف کیس چلتی ریل گاڑی سے باہر پھینکا تھا وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہی تھا۔ اس نے جس جگہ بریف کیس پھینکا تھا وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق پہلے ہی سے اس کا کوئی ساٹھی موجود ہوگا۔ ورنہ اس قدر قیمتی ہیرے جو اہرات کے زیورات کو اتنی بے دردی سے باہر کون پھینک سکتا ہے۔

سرفراز کے یہ سارے زیورات تھے۔ ظاہر ہے کہ اس نے کسی جیولر شاپ میں ڈاک مار کر حاصل کئے ہوں گے۔ ایک گھر سے اتنے سارے زیورات مل نہیں

سکتے..... چاہے وہ کروڑ پتی ہی کیوں نہ ہوں..... یہ بھی ممکن تھا کہ سرفراز نے دو تین جگہ ڈکیتی کی واردات کی ہو۔ لیکن اس بریف کیس میں صرف زیورات تھیں۔ رقم نہیں تھی..... جو کئی وہ ڈاکر کی صورت میں جسے عطیہ نے اپنے اپنی میں رکھ لی تھی۔ اگر مزید رقم ہوتی تو وہ یقیناً اسے اپنی اپنی میں رکھ لیتی۔

دوسری جانب عطیہ نے سرفراز کے اہم ضروری کاغذات، پاسپورٹ اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ اپنے قبضے میں کر لئے تھے شاید اس لئے کہ سرفراز اسے بیچ منہجہ دار میں چھوڑ کر ملک سے فرار نہ ہو جائے۔ اب وہ آسانی سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔

سرفراز کی ذہنی حالت بڑی ابتر تھی۔ ٹائیگر نے اس سے کہا۔

”تم اپنا دل خراب نہ کرو..... جو کچھ بھی ہوا تمہاری غفلت سے ہوا۔“

”انکل.....! میں یہ کبھی ہوں کہ آدمی کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے۔“ عطیہ نے کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا..... فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں..... اس میں اس کی یقیناً کوئی مصلحت ہوگی..... وہ اس سے دگنا بھی دے سکتا ہے..... شرط یہ ہے کہ اس کی ذات پر توکل اور صبر کیا جائے۔“

ایک عمر رسیدہ مسافروں میں جو دوسری طرف بیٹھے تھے۔ وہ سرفراز کی دل جوئی کی غرض سے آگئے تھے۔ ان میں سے ایک نے عطیہ کی بات سن کر کہا۔ ”جراک اللہ بیٹے..... آفرین ہے تمہاری بیوی پر یہ کس قدر حوصلہ مند اور صابر ہے۔“

ان بزرگ کی اہلیہ نے سرفراز کے سر پر مشفقانہ انداز سے ہاتھ پھرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بیوی ٹھیک کبھی ہے..... اللہ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے..... زیادہ غم زدہ اسے ہونا چاہئے تھا..... اس نے اتنا اثر اور صدمہ نہیں لیا جتنا تم لے رہے ہو۔“

(جاری ہے)

قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

بہت بے کیف لمحے ہیں عجب بوجھل سا جیون ہے
نغم سے دل بہلتا ہے، نہ خوشیاں راس آتی ہیں
(بلقیس خان.....پشاور)

میں کھلونا ہوں مجھے ہاتھ مت لگاؤ تم
کسی شوکیں میں رکھ کر مجھے سجالو تم
میری آنکھوں میں کبھی دیکھو بھی
میرے چہرے پر کبھی پیاری سی نظر ڈالو تم
(عثمان غنی.....پشاور)

نہ ستاؤ ہمیں ہم ستائے ہوئے ہیں
جدائی کا تیری ہم غم اٹھائے ہوئے ہیں
کھلونا سمجھ کر ہم سے یوں نہ کھیلو دوست
ہم بھی تو اسی خدا کے بنائے ہوئے ہیں
(نوش خان.....کوٹ مظفر میلی)

بے ربط خیالات کی دنیا سے نکل جا
تو ساتھ زمانے کے کسی روز بدل جا
بے نام انگلوں کا سہارا نہ لیا کر
کر دفن تمناؤں کو اس طور سنبھل جا
(محمد وارث آصف.....وال بھراں)

ہم ہر شب تمہارے ہجر میں تڑپا کرتے ہیں
ہر پل تمہارے ملنے کی فریاد کرتے ہیں
چلے آتا جب کبھی کسی شب خیال آئے ہمارا
ہم ہر روز، ہر سانس سے پہلے تمہارا انتظار کرتے ہیں
(راجہ باسط مظہر.....گوجر خان حامد تھنگی)

زندگی کے حسین سفر میں انسان بدل جاتے ہیں
ساتھی دامن چھڑا کے کہیں دور نکل جاتے ہیں
پہلے دل جیتے ہیں تو باتوں باتوں میں
بے دردی سے چھوڑتے ہیں جب دل بہل جاتے ہیں
نفرت کی آندھیاں آتی ہیں قدم قدم پہ حسنِ حلیم

پھر بار بار محبت کے کنارے دہل جاتے ہیں
(محسن عزیز ایندھلیم.....کوشا کلاں)
کچھ ایسے حادثے زندگی میں ہوتے ہیں فراز
کہ انسان بچ تو جاتا ہے مگر زندہ نہیں رہتا
(افشاں رمضان.....سرگودھا)

جس طرف نظر کروں اسی کا پر تو ہے
وہ میرے دھیان کے سب راستوں میں رہتا ہے
پھنچ کر اس سے پریشان بہت ہوں میں بھی
سنا ہے وہ بھی بڑی الجھنوں میں رہتا ہے
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا ہی نہیں
اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی
(نسیم انجم.....نگن پور)

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
(مس فوزیہ کول.....نگن پور)

اتھار ہم کریں کہ ادھر سے ہو ابتدا
برسوں گزر گئے ہیں یہی سوچتے ہوئے
(محمد اسحاق انجم.....نگن پور)

رب تجھے عروج ایسا نصیب کرے
کہ ہر شخص تیرے نصیب پر فخر کرے
ہر موڑ پر ہوں فرشتے ساتھ تیرے
ہر غم میں حفاظت تیری خدا کرے
(نورین اعظم.....راولپنڈی)

یہ چاہتیں یہ پذیرائیاں بھی جھوٹی ہیں
یہ عمر بھر کی شناسائیاں بھی جھوٹی ہیں
تمام الفاظ و معانی بھی جھوٹی ہیں
ہمارے عہد کی سچائیاں بھی جھوٹی ہیں
(انتخاب آستر)

دل پر شوق کو پہلو میں دبائے رکھا
تجھ سے بھی ہم نے تیرا چھپائے رکھا
جانے کس حال میں ہیں کون سے شہروں میں ہیں وہ
زندگی اپنی جنہیں ہم نے بنائے رکھا
(انتخاب: محمد نوید انجم.....سوحا وہ، چکوال)



ہم ایسے سادہ کے پھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں سہارے
اپنے اعمال ہی ملتے ہیں سدا مصیبت کی صورت
اور ہم کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم مصیبت کے مارے
ہم کو تباہ نظر، کم ہمت، ہم بے شعور
چھوڑ دیا خود کو ہم نے ہر موج کے دھارے
حوصلہ کہاں ہم میں طوفانوں سے ٹکرائیں
بس چلتے رہتے ہیں ہم تو کنارے کنارے
(اقصیٰ رباب.....فیصل آباد)

تیری یاد جو سینے سے لگا رکھی ہے
ہم نے دنیا میں الگ دنیا بسا رکھی ہے
ہم کو معلوم نہیں چاہت کے تقاضے لیکن
ہم نے تیری باتوں کے سوا ہر بات بھلا رکھی ہے
سفر مشکل ہے معلوم ہے لیکن
تو ہمارا ہے تو ہر فکر مٹا رکھی ہے
تو بھلا دے تو بھلا دے لیکن ہم نے
تیری خوشبو بھی تعویذ بنا رکھی ہے
تو الگ ہو تو ہر بار یوں لگتا ہے
زندگی موت کے پہلو میں بٹھا رکھی ہے
تیری باتیں تیرا لہجہ تیرا چہرہ ہم دم
تجھ میں خالق نے ہر چیز جدا رکھی ہے
(پیر نوید شاہ ہاشمی.....ٹنڈو جام)

آج بھی تپتی دھوپ کا صحرا.....
تیرے نرم لبوں کی ٹہنم.....
سائے سے محروم رہا.....
آج بھی پتھر، جبر، کالجہ صدیوں سے بے خواب رتوں کی
آنکھوں کا منہ بوم رہا.....
آج بھی اپنے وصل کا تارا.....
راکھ اڑاتی شوخ شفیق کی منزل سے معدوم رہا.....
آج بھی شہر میں پاگل دل کو.....
تیری دید کی آس رہی.....
مدت سے گم سم تہائی، آج بھی میرے پاس رہی

کرتے ہیں بات گرمی بازار دیکھ کر
ہم بیچتے بھی ہیں خریدار دیکھ کر
اپنے کئے پہ آج پشیمائیں ہوں مگر
دل دے دیا تھا اس کو طلبگار دیکھ کر
اس دیس کا تو ہی نگہاں اے خدا!
دل ڈر رہا ہے وقت کے آثار دیکھ کر
بھٹکے ہوئے ہیں آج بھی منزل سے اپنی وہ
جو رک گئے تھے سایہ دیوار دیکھ کر
لب کھولنے سے پہلے ہی خاموش ہو گئے
آنکھوں میں اس کی صورت انکار دیکھ کر
دنیا سمجھ رہی تھی جسے بے وفا جلیں
وہ رو پڑا تھا مجھ کو سردار دیکھ کر
(حکیم خان حکیم.....کابل پورموی)

ساتھ دے نہ سکے میرے غمگسار کبھی
تجھ سے کیا کرتے تھے ہم پیار کبھی
ٹوٹتی ہے تیرے وعدوں کی زنجیر اب
سکون کی لہر آتی نہیں پس دیوار کبھی
پلٹ کے لی نہ خبر تو پھر میری کبھی
پائے نہ ہم نے خوشی کے آثار کبھی
خوش ہیں ہم بھی گزرے دنوں کی طرح
دفا کرتے نہیں ہیں آج کل کے یار کبھی
جان کے ساتھ رہتی ہے غم کی مجبوری جاوید
اثر دیکھا نہیں ہم نے پھولوں کے پار کبھی
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

چلو یونہی سہی، چلو تو سہی کچھ پل ساتھ ہمارے
پھر بھول جانا بے شک کہ کبھی ہم تھے تمہارے
زندگی میں اکثر راہبر بن جاتے ہیں راہزن

آج بھی شام اداس رہی.....

آج بھی شام اداس رہی.....

(انتخاب: راجہ باسط مظہر..... گوجران، حامد جھنگی)

وقت رخصت میں تیرا مجھ سے لپٹ جانا
لیکن پھر وہ ارادہ سا بدل جانا
میرا کہنا کہ کیسے گزریں گے پل
تیرا کہنا کہ مجھے بھول جانا
وہ میرا پھر سے ملنے کی تمنا کرنا
روتے روتے تیرا اچانک منہ بھل جانا
کیسے بھولوں گا میں وہ گزرے ہوئے پل
کبھی لڑنا جھگڑنا محبت سے اور وہ تیرا مجھے منانا
تیری آغوش میں سر رکھ کر سو جانا
اور تیری آنکھوں کے سمندر میں کھو جانا
میں نہ کہتا تھا کہ محبت دکھ دے گی نوری
تیرا کہنا کہ محبت ہی تو ہے جنت جاناں
(غلام نبی نوری..... کھڈیاں خاص)

کیوں آنکھ بھری بھری ہے ہوا تو کچھ ضرور ہے؟
نہ لبوں پہ ہنسی ہے ہوا تو کچھ ضرور ہے
کہیں دل پریشاں تو نہیں؟
کہیں لبوں پہ کوئی صدا تو نہیں؟
کہیں بجھا کوئی دیا تو نہیں؟
شائیں لٹی لٹی ہیں ہوا تو کچھ خیر ہے؟
کہیں ہوا کوئی خفا تو نہیں؟
کہیں ادھوری کوئی دعا تو نہیں؟
کہیں پھول کوئی لٹا تو نہیں؟
نہ موسم میں تازگی ہے ہوا تو کچھ خیر ہے؟
کیوں آنکھ بھری بھری ہے ہوا تو کچھ ضرور ہے؟
(مس فوزیہ کنول..... منڈی ننگن پور)

وہ حسن مجسم کمال اس کی آنکھیں
سراپا محبت جمال اس کی آنکھیں
جھکائے تو لگتی ہیں زیور حیا کا

اٹھیں تو کریں پھر سوال اس کی آنکھیں
ملیں تو میں دو جہاں دے کے لے لوں
وہ چہرہ وہ آنکھیں وہ زلفیں
اگر کوئی پوچھے کہ دنیا میں کیا ہے
دنیا دیوانہ کہے گا مثال اس کی آنکھیں
(افشاں رمضان..... سرگودھا)

یہ کیسی جہر تیں ہیں موسوں میں
پرنے بھی نہیں ہیں گھونلوں میں
بھڑک اٹھیں گے شعلے جنگلوں میں
اگر جنگلوں بھی چپکے جھاڑیوں میں
بہت تنہا ہے وہ اونچی حویلی
میرے گاؤں کے کچے گھروں میں
(عروج مایین ط..... سرگودھا)

یہی سوچا ہے اب میں نے اس سے پہلے کہ میں مرجاؤں
سا جاؤں نگاہوں میں ترے دل میں اتر جاؤں
میں کوئی کوئی سی رہتی تھی آئینے سے خفا ہو کر
تیرے آنے کی آہٹ ہے کہ شاید اب سنور جاؤں
میں درد لا دوا پاکر مسیا بن گئی سب کی
دشمن بھی نہ بھولے گا کچھ ایسے کام کر جاؤں
عجب یہ معاملہ ہے جو دھڑکن بن گیا میری
لودیتی نگاہوں میں جو دیکھوں رنگ اپنا تو ڈر جاؤں
تو سر بلند ہو کر دواؤں کا ہنر پاکر اوج گام تک پہنچے
میں بن کر اب دعا تیری فلک تک بے بال و پر جاؤں
کہ ذاتوں کی مسافت نے تھا کا ڈالا شفیق مجھ کو
سب تاریک ہے لیکن پلٹ کر کس کے گھر جاؤں
(شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالہ یار)

ہم خون تمنا کرتے رہے معصوم اشارہ ہو نہ سا
چلن تو اٹھی ہمہم لیکن افسوں نظارہ ہو نہ سا
میکھل تمنا کی خاطر ہم ذوق پرست بھول گئے
یہ وحشت دل یہ جوش جنوں، افسوں گوارا ہو نہ سا

یہ حسن مکمل کیا کم تھا، پھر دل کے بھی مالک بن بیٹھے
دل ہی نہ رہا تھا کہنے میں یوں اس سے کنارہ ہونے کا
یوں جام پلائے ساتی نے ہر رند نے پی خوش ہو ہو کر
کل بزم میں میری جانب ہی ساتی کا اشارہ ہونے کا
اف جگر کی تہا راتوں میں یہ ساتھ بھی اپنا دے نہ سا
غم مجھ کو پیارا ہو تو گیا میں غم کو پیارا ہو نہ سا
ساحل پہ کھڑے کچھ کہتے رہے یہاں شمشیدہار میں تھی
موجوں نے لیٹا ہنس ہنس کر لفظوں کا سہارا ہو نہ سا
آ آ کے تڑپتی ہے بجلی امتیاز بہار گلشن پر
ہم چھوڑ کے ایسی حالت میں جائیں یہ گوارا ہو نہ سا
(ایس امتیاز احمد..... کراچی)

یہ شب فراق، یہ بے بسی ہے قدم قدم اور یہ اداسیاں
میرا ساتھ کوئی نہ دے سا میری حسرتیں ہیں دھواں دھواں
میں جو تڑپ تڑپ کے جاتا تو میرے خواب مجھ سے بچھڑ گئے
میں اداس گھر کی صدا سہی مجھے نہ دے کوئی بھی تسلیاں
یہ فضا جو گرد و غبار لئے میری بے کسی کا حزار ہے
میں وہ پھول ہوں نہ جو کل سا میری زندگی میں دفاں
چلی ایسی درد کی آندھیاں میرے دل کی بستی اجڑ گئی
یہ راکھ ہے بچھی بچھی اس میں ہیں میری نشانیاں
(محمد وارث آصف..... وال پھر ال میاٹوالی)

سوچوں کا اک عجب سا نشہ دے گیا مجھے
جاتے ہوئے وہ کیسی سزا دے گیا مجھے
لے کر وہ مجھ سے چاہتوں کے ان گنت چراغ
پلکوں پہ اک مچلتا دیا دے گیا مجھے
کس بات پہ خفا ہوا درویش آج صبح
جینے کی جاتے جاتے دعا دے گیا مجھے
سپنوں کی راکھ دل کا دھواں آرزو کی لاش
تھے وہ کیسے کیسے بیش بہا دے گیا مجھے
راہوں میں جس کی پھول بچھاتا رہا ہوں میں
آیا جو وقت وہ بھی دعا دے گیا مجھے
اجاز بندگی تو فقط اک خدا کی تھی

لیکن زمانہ کتنے خدا دے گیا مجھے
(بشیر اعجاز..... جگدنا معلوم)

مجھے تلاش ہے اس کی جو صرف میرا ہو
میرا نصیب بنے میرے دل کے پاس رہے
میرے قریب ہو اتنا کہ سانس رک جائے
مجھی کو چاہے ہنسائے ستائے..... پیار کرے
وہ میری مانگ سچائے مجھ ہی کو وہ بہلائے
میں سوچتی ہوں کہ میری وفا کا شہزادہ
کہیں تو ہوگا زمانے کی بھیڑ میں کھویا
کبھی تو میرے لئے اس کا دل تڑپے گا
کبھی تو پیار کا شعلہ لبو میں بھڑکے گا
(نوشین خان..... کوٹ مظفر علی)

سمندروں کے موتی ہو تم ساحلوں پر رہتی ہو باہی
دل میں بستی ہو تم، دعاؤں میں رہتی ہو باہی
خوشبو کی طرح ہواؤں میں رہتی ہو تم
دھوپ ہو تم مگر چھاؤں میں رہتی ہو تم
جسم میں رہتی ہو، روجوں میں رہتی ہوں تم
بھگوان بن کر دیوتاؤں میں رہتی ہوں تم
قسمت کی دھنی ہو اس قدر تم
ہماری ہی نہیں ہاشم بھائی کے دل کی بھی رانی ہو
(عاصمہ رمضان..... پنڈرا دھان)

کس سمت ہے مگرا میرا
ختم ہوتا نہیں سفر میرا
ہر طرف وحشتوں کے سائے ہیں
جانے کون سا ہے گھر میرا
اک بے نام سی اذیت میں
زندگی کھو گئی مسافت میں
کیسا کردار ہے کہانی میں
زندگی جل رہی ہے پانی میں
(سنبل مایین ط..... سرگودھا)

☆☆



بدوعا

راجندر سنگھ بیدی

نوجوان پر اچانک ایک اذیت ناک بیماری کا غلبہ ہوا اور وہ بیماری نوجوان کے تصور میں بھی نہیں تھی کہ اس بیماری سے اس کا پالا پڑسکتا ہے اور کوئی اور بھی یقین نہیں کرسکتا تھا لیکن جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا.....

معاشرتی حقیقت کو اجاگر کرنے والے معروف رائٹر کے قلم سے ایک دلگداز اور حساس تحریر

ابھی میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ اوپر تلے تین آوازیں سنائی دیں:

”آج پھر پچھتکن گیر دیا لو کہیں؟“

”ارے چوہا ہی سلگالیا ہوتا۔“

”اور نہیں تو بھوسی ہی نکال لی ہوتی۔“

اور تینوں آوازیں ایک ہی آدمی کے منہ سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جن کا جواب خاموشی کے سوا اور یہ آوازیں میانی کوٹھڑی سے آرہی تھیں۔ زمین

کچھ کہتے کہتے رہ جانا دلیری میں مگر زیادہ تھی اور رکتے رکتے کہہ جانا جتنی بے مہر، مہربان اتنی واجد یہ بیار تو ایسا ہوتا ہے میرے شانے پر سر نہادہ تھی جو دل میں درد سموتا ہے (پروفیسر ڈاکٹر واجد گینگونی.....کراچی)

اب بیگی بیگی شاموں میں اک چہرہ ہر پل آنکھوں میں جب بھی محبوب نے لی انگڑائی ہنستا بھی ہے، روتا بھی ہے زندگی دار ہر نظر آئی! دل میں درد ڈبوتا بھی ہے آدمی زندگی کے میلے میں پھر نظروں سے کھوجاتا ہے خود تماشا ہے خود تماشاکی اور خوابوں کو مہکاتا ہے گرچہ پیشا ہوں بزم یاراں میں کہ اک احساس مٹانے کو دل میں درد پسانے کو ہر دھڑکن میں، ہر آنگن میں کہ جھٹکے ہاتھ کے ٹککن میں یہ رنگ نظر بس آتا ہے ایسا اکثر ہو جاتا ہے دل کا داغ اٹوکھا ہے خام یہ سب تو دھوکا ہے (فریدہ خانم.....لاہور)

جب ملاقات ہے ارادہ تھی اس میں آسودگی زیادہ تھی نہ توقع، نہ انتظار نہ رنج صبح جبراں نہ شام وعدہ تھی نہ تکلف نہ احتیاط، نہ غم دوستی کی زبان سادہ تھی لعل سے لب چراغ سی آنکھیں ناک ستواں، جبین کشادہ تھی حدت جاں سے رنگ تابنا سا ساغر افزوز، موج بادہ تھی زلف کو ہمیری کا دعویٰ تھا اس کے لہجے میں ایک مستی ہے پھر بھی خوش، قاتمی زیادہ تھی اس کی باتیں سنوروں والی اپرا تھی نہ خود تھی نہ پری آپ اپنا خیال کر رانا

گفتگو کر نہ پاگوں والی (قدیر رانا.....راولپنڈی)

گیسو چمک رہے ہیں جگنو چمک رہے ہیں پلکوں کے یہ ستارے سو چمک رہے ہیں غمگین ہے رقصہ گھنگھرو چمک رہے ہیں سب زخم یں کے میرے خوشبو، چمک رہے ہیں آنکھوں میں کب سے عاطر آنسو جھلک رہے ہیں (رانا حنیف عاطر.....)

کوئی ہار گیا کوئی جیت گیا سال بھی آخر بیت گیا تنہی سپنے سجائے آنکھوں میں کبھی بیت گئے پل باتوں میں کچھ تلخ لمحات بھی تھے کچھ حادثے اور صدمات بھی تھے پر اب کے برس اے دوست میرے میں نے رب سے دعا یہ مانگی ہے کوئی پل نہ تیرا اداس گزرے کوئی روگ نہ تجھے راس گزرے تو پھولوں کی طرح کھلا کرے کوئی شخص نہ تجھ سے گلا کرے ہم برا سوچتے نہیں یارو طبیعت قلندروں والی تو خوش رہے آباد رہے تیرا خواب مگر آباد رہے ایک صحرا ہے خانہ دل میں تو جو چاہے وہ ہو جائے تو جو مانگے وہ مل جائے (بلیق خان.....پشاور)

☆☆

شمع بیوٹی پارلر



Price : 300/-

میک اپ کی اہمیت کیا ہے؟

جب میک اپ اچھا ہو تو حسن میں نکھار، دلکشی نظر آتی ہے اور پھر میک اپ کرنے میں ہر خواتین کا اپنا ہنر، سلیقہ اور نفاست بھی ظاہر ہوتا ہے۔

پیاری بہنیں! ایک بیوٹیشن ہونے کے ناطے، میں کہہ سکتی ہوں کہ میک اپ بھی ایک فن ہے۔ ہر کام میں ماہر ہونے کی لئے تربیت اور پریکٹس ضروری ہے اور بغیر کسی ماہر کے سہارے کے کسی بھی کام میں ماہر ہونا مشکل ہے اور میک اپ کے فن میں ماہر ہونے کے لئے پیاری بہنوں کے لئے یہ کتاب بڑی تگ و دو اور محنت شاقہ سے تیار کی گئی ہے۔ بڑی حد تک یہ کتاب خواتین کے لئے میک اپ میں معاون و مددگار ثابت ہوگی اس کتاب میں میک اپ کے علاوہ جلد کی حفاظت، تاجہ پیروں کی حفاظت، بناؤ سنگھار، اور جدید دور کی میک اپ کی اشیاء کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ صحت مندر رہنے کے راز بھی اس کتاب میں درج ہیں۔

صابری دار لکتب

قدانی مارکیٹ اردو بازار لاہور

اپنے بیچوان کی نے کو چار پائی کے نیچے پھنسا دیا۔ نورے نے روٹی کا لقمہ سانس ہی میں رہنے دیا اور ہاتھ ماتھے پر لے جاتے ہوئے بولا: ”بابو جی! ساہ سلام (صاحب سلامت)۔“

”سلام!“ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا، ”ارے یار تم لوگ بالکل چوروں کی طرح یہاں آ چکے۔“

”اور کیا وف تھوڑے ہی بجاتے۔“ جہاں نے خلاف توقع مسکراتے ہوئے کہا۔ دراصل ہونٹوں بلکہ مونچھوں کا یہ خوشگوار پھیلاؤ اور ماتھے کے ناگوار شکن مل جل کر ظاہر کرتے تھے کہ اس مسکراہٹ میں مسکراہٹ کم ہے اور رشوت زیادہ..... تاکہ اس کے اجڑے جواب کا برا نہ منادوں۔

”شاید میں تمہاری کچھ مدد کرتا۔“ میں نے کہا اور میانی کوٹھڑی کے چاروں ابرو سوالیہ نشان بن کر مجھے گھورنے لگے۔ میری نے ان شرمندہ نقل سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا: ”مثلاً میں چوہدری کو کہہ کر یہاں سپیدی ہی کروا دیتا، اور نہیں تو کرائے میں ہی رعایت ہو جاتی۔“

اب یہ بات واقعی قابل غور تھی۔ جہاں اور نوراً سوچنے لگے۔ سادہ لوح نوراً اپنے پیہرے سے واقعی نمون سانظر آ رہا تھا لیکن جہاں ابھی تک دل میں کہہ رہا تھا: ”امیر لوگ کتنے چالاک ہوتے ہیں۔ یہ مجھے ہی بتا دیا ہوتا“ انداز اسی وقت اختیار کرتے ہیں جب کسی کی نیل اپنے آپ منڈھے چڑھ جاتی ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ انہیں تو ان لوگوں کا یہاں آنا کبھی بھی برداشت نہ کرتا۔ وہ فلسفے کا غالب علم تھا۔ دماغ کا طھی تھا۔ بالوں میں تیل مل لگتا جس کی وجہ سے بال ہمیشہ سیاہ گوش کے کانٹوں کی طرح کھڑے کے کھڑے رہتے اور دوسرے کو اتفاقاً چھو جانے سے اس کی سزا دیتے۔ کچھ ان کے خنکے اور ٹھنکے والے پن سے پتا چلتا کہ ملکہ سہا کی نسل سے ہیں۔ وہ فلسفے کے طالب علم ہونے کی وجہ سے دوسروں کے لئے مجسم شر

سیڑھیاں پھیلا گئے والا خورہ اور ڈرپوک جو چند ایک لقمے زہر مار کر رہا تھا۔

جہاں ایک بیڑہ پاتا تھا جو ہر وقت نورے کی گردن پر سوار رہتا۔ مثلاً: چوہا سگائے تو نوراً آٹے میں سے بھوسی نکالے تو نوراً، برتن ماتھے تو وہی اور جو کھنگالے تو وہی۔ میاں جہاں بھی بچھائی پر آ لیتے اور کچی پکانی کھائے تو وہ بھی گویا نورے پر احسان کرے۔ میں اور میرا ساتھی اسٹین ان کی قبر تک سے واقف تھے۔ اس سے پہلے یہ برادر تعلیم الفرقان والوں کے پیچھے رہتے تھے جہاں ایک سفلی بنگال ہمیشہ اوپر کی چھت سے گوبھی کے ذمصل، پیاز کے جھلکے، پھلیاں یا بچا کھچا بھات ان کی منڈھیا پر پھینک دیتی تھی اور یہ ہمیشہ موٹی موٹی گالیاں دیا کرتے تھے۔ وہاں بھی نوراً ویسے ہی جہاں کا دتیل تھا۔

آخر ایسا کیوں تھا؟ یہ بھی اسٹین اور میرے دوسرے ساتھی کئی بار سوچتے لیکن ہمیں آخر دم تک پتانہ چل سکا۔ البتہ نورے کی حرکات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اکثر خط اٹھایا کرتے۔ نوراً سخت جذباتی آدمی تھا۔ اس کے جذبات کا خزانہ کانوں اور آنکھوں کے اس قدر قریب تھا کہ ادھر کانوں سے بات سنی اور ادھر ساوان بھادوں کی جھڑی ہے کہ لگ رہی ہے، چھما چھم، چھما چھم، اور ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی، تاوقتیکہ زمین میں کوٹیاں نہ دہائی جائیں یا کوٹھے کے منڈیر پر چھتھروں کا ایک بڑھانہ کھڑا کیا جائے۔ بس اس کے جذبات کے خزانے کو ذرا چھیرنے کی ضرورت تھی۔ یا پھر اس کے ماضی کی راکھ میں چند اور کونسلے تھے جنہیں وہ اکثر موقع بہ موقع اٹھاتا، تھمتھتا رہتا اور جنہیں سرد کرنے کے لئے وہ آنسوؤں کا سیلاب بہا دیتا۔ ہمیں اس لم دھڑ گئے، چھ فٹ لمبے، منڈھیا میں ہمیشہ کمر کمان کر کے چلنے والے انسان کو رلا کر مزا آتا تھا۔

میں تین چار سیڑھیاں اتر کر عین نیم کے چھتے کے مقابل کھڑا ہو گیا اور کہا: ”اے نورے!“

میاں جہاں اٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گیا، تعظیماً! اور

اور پہلی چھت کے درمیان ایندھن اور فروعات رکھنے کے لئے جو گجھ تھی وہاں میں نے کٹڑی کے پشتوں اور چند ٹوٹے ہوئے کواڑوں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا تھا۔ واللہ اعلم وہ پتھر اور کواڑ ہی بولنے لگے تھے۔ ان دونوں میں کسی خاص مقصد کے پیش نظر پریوں کی کہانیاں پڑھ رہا تھا اور پھر آپ جانتے ہیں کہ دیو پری کے قصے پڑھنے کے بعد کیا دنیا کے ممکنات ہے جو آپ کے سامنے کھلتی ہی چلی جاتی ہے۔

پہلی چھت پر ہم کالج کے چند چھوکرے اکٹھے رہتے تھے۔ بانی کے کم بخت یا تو گرینڈ کیرے کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور یا پھر بین الصوبائی میچ ویج دیکھنے گئے ہوں گے۔ اس وقت ان میں سے وہاں ایک بھی نہیں تھا۔ میں نے ہمت جی کی اور قدم آگے بڑھایا۔ روشنی واقعی میانی کوٹھڑی سے آرہی تھی۔ ایک عارضی سا دیا جرم سلور کی ایک کٹوری میں سروس کا تیل اور بتی ڈال کر اور اسے آنکڑوں رکھ کر جلا دیا تھا جس میں سے ایک کالی لاٹ اٹھ کر اوپر کی دیواری تختی کو سیاہ کر رہی تھی۔ کالے کالے پھول تختی کے ساتھ چٹ رہے تھے اور کچھ دیر کے بعد کٹوری کے اندر باقی پتھر گرتے۔ بتی مدھم مدھم ٹھٹھانے لگتی، لیکن پھول پھرتی کا حصہ ہو کر جلنے لگتے۔ قریب ایک شخص چار پائی پر لیٹا ہوا ایک میلہ کیلے چیتھروں لیٹے بیچوان کے شش پر کش لگا رہا تھا۔ بڑا پسند تھا اسے اپنا بیچوان:

”ہم کو اپنی گڑگڑی اور بیچوان پر ناز ہے۔“

”خدا کی قسم! یہ تو اپنا نوراً ای ہے۔“ میں نے اک لمبی سی ”اوہو“ کے بعد کہا۔ اور اس کے ساتھ جہاں نورے کا سایہ، اس کے وجود کا نتیجہ صرت، جس کی مونچھیں متواتر تیل لگانے اور کھینچنے سے اور بڑی ہو گئی تھیں۔ اس کے غیغ اور چاہ زخمدان والے سیاہ چہرے پر ایک عجب لعنت سی برس رہی تھی، جسے خوبانی اور آلو بخارے کے بیجوں سے نکالے ہوئے ستے، بدبو دار اور بے حد چکنے تیل نے اور بھی چمکا دیا تھا، اور اس کے سامنے نوراً بیٹھا تھا۔ کھلے کھلے ہاتھ پاؤں، چار چار

ہوتے اور اپنے لئے جسم سکون مانگتے۔ اسٹین کو بھلا جہاں اور نور کا یہاں آنا کیسے بھاتا۔ لیکن وہ خاموش محض اس خیال سے ہو رہا کہ شاید جہاں اور نور امیرے کوئی عزیز ہیں۔

اکثر نیچے سے گالیوں کی آوازیں، بچپان کی گڑ گڑ، تنے ہوئے پیٹ کے خراٹے اور کھانکھان کی شاق سنا کر دیتی اور اسٹین اپنے سلو جزم نگہاں ہوا پکار اٹھتا: ”وہ نورے کو پڑ رہی ہیں بے بھاد کی“ اور پھر وہی سلو جزم۔ کچھ دیر کے بعد: ”ارے بچاؤ! خدا کی قسم مار ڈالے گا بے چارے کو وہ موچھل“۔ لیکن افسانہ نگار داؤد اور وہی رفیق کو کچھ سے اس بات میں اتفاق تھا کہ ان لوگوں کے یہاں آنے سے ہماری زندگی میں رومان کی جگہ مسئلہ حیات نے لی تھی۔ داؤد سوچتا تھا کہ جنہیں مار پڑتی ہے وہ ہمیشہ مار کھانے کے لائق ہوتے ہیں۔ اسٹین اور داؤد اس بات پر جھگڑنے لگتے اور میری حالت اس جنگ میں ایسی ہی ہوتی جیسے دو بڑے ملکوں کی جنگ میں کسی غیر جانبدار یا Buffer ریاست کی ہو سکتی ہے۔

ایک بات پر ہم چاروں متفق تھے کہ ماں باپ سے دور، نظم و نسق سے کوسوں پرے، رات کے ایک بجے جب ہم گلیوں میں جھانکتے، ہانپتے کانپتے مکان کی طرف آتے تو ہماری میڑھیاں ان لوگوں کی وجہ سے آخری تنکا ثابت ہوتیں۔ میانی کوٹھڑی کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوتا اور دیے کی روشنی نور ہدایت کی طرح ہمیں ازلی گھر کی راہ دکھاتی جہاں ہمیشہ دنیائے بازار کے دھول دھپے، گالی گلوچ، سردی اور گرمی کے خلاف دوستوں کی محبت، والدہ کا پیار سے بھرا ہوا خط، لحاف اور بچکی کا پنکھا میسر آتے ہیں۔ جہاں اور نور خدا جانے کوئی منہ بنے تھے جو ساری رات آتش پرستی کرتے تھے۔ لیکن کچھ بھی ہو ہمیں رات کو میڑھیوں میں دیئے کی روشنی چاہئے تھی اور اس سلسلے میں ہم منہ پرستی تک کے لئے تیار تھے۔ اور خلاف اس کے نور کو روڑ صلواماتیں اس چوہدری کو سنواتے جو ہمیں میڑھیوں میں

ایک بچکی کا ہنڈا تک لگوا کر نہیں دیتا تھا۔ خدا جانے میرے کہنے پر چوہدری جہاں اور نورے کی میانی کوٹھڑی میں سپیدی اور کرائے میں تخفیف کیسے کر دیتا۔ ایک دن میں اور اسٹین رات کے دو بجے گھر لوٹے۔ ان دنوں شہر میں ایک صنعتی نمائش آئی ہوئی تھی۔ بس اس کارنیوال میں ہم ”تیر و تفنگ“ کا ایک کھیل کھیلتے رہے۔ گھر لوٹے تو نہ صرف نیم چھتے کا دیا جل رہا تھا بلکہ منہ بنے جاگ بھی رہے تھے۔ جرمن سلور کی کٹوری کے عین اوپر دیواری سختی پر ایک سیاہ سیلیک ٹائپ یعنی شوٹنگ سانچے کی طرف اٹھ رہا تھا اور نور جہاں کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔ اسٹین ایک اشتراکی بھی تھا، اور آپ جانتے ہیں کہ اشتراکی، خواہ وہ عملی ہوں یا ”کرسی نشین“ و تبدیل ہونے یا لفظ Exploitation سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔ ”تیرا زہر بند ہو جائے“ اسٹین نے آنکھیں نکلاتے ہوئے زیر لب کہا ”سارا دن بے چارہ روڑی کوٹنے کوٹنے تھک گیا ہوگا۔ پھر گھر کا دھندا کیا کم ہے اور اب ہے کہ دو بجے تک اس کے پاؤں داب رہا ہے۔“

شاید اسٹین بول پڑتا لیکن جہاں نے اس کے کانوں میں ایک خوش خبری ٹھونس کر بات آئی گئی کر دی۔ اور وہ خوش خبری یہ تھی کہ ڈاکٹر اسٹین کا مٹی آرڈر لے کر آیا تھا، اگر چہ اسے پا کر لوٹ گیا۔ اسٹین پیسوں کے متعلق سوچنے لگا۔ اشتراکی کو بھی دیکھ نہ ہونے سے جو تسکین ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ باعث راحت اس کے گھر سے آیا ہوا مٹی آرڈر ہوتا ہے۔

”کتنے کا تھا؟“ اسٹین نے اس امید پر سوال کیا کہ شاید منہ بنچوں میں سے کسی کو پتا ہو۔ دراصل ہم دونوں کو امید نہ تھی کہ مٹی آرڈر کی مالیت کے متعلق یہ لوگ جانتے ہوں گے، لیکن ”پچاس کا ہے اور میر پور خیر پور سے آیا ہے“ نورے نے قدرے اونچی آواز سے کہا۔ ”واہ رے نورے!“ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیا۔ ”ارے بڑا بد معاش ہے تو تو۔“

اس کے بعد ہم رات کے سناٹے میں بیچتے، جوتوں سے شور مچاتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ کمرے کا دروازہ رفیق اور داؤد نے کھولا تھا۔ اندر گھستے ہوئے اسٹین کے دماغ میں پھر نورے اور اس کے پاؤں ڈبانے کی تصویر گھوم گئی۔ اس نے اپنی گزری کی موٹی ٹیغ کاٹن کھولتے اور اسی گزری کی ٹائی کی گرہ کو ڈھیلا کرتے ہوئے کہا: ”میرے بس کی بات ہو تو جہاں کو اسی مکان کی کنگنی پر کھڑا کر کے نیچے دکھادے دوں اور صبح سب سے پہلے اس کی موت پر آنسو بہاتے ہوئے زندگی کی صحیح تصویر پیش کر دوں..... ہے نا؟ اور دیکھو، کم بخت نورے کو مالیت کس طرح یاد ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کہاں سے آئے ہیں۔“ میں نے کہا: ”کون جانے اسے یہ بھی پتا ہو کہ کہاں پیسے رکھے جاتے ہیں۔“ اسٹین نے اپنے سیاہ گوشے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ”ارے یار سچ مجھے نہیں ہم پر ہی ہاتھ صاف نہ کر جائیں۔“

اس کے بعد میں داؤد کے بستر میں گھس گیا۔ میری چار پائی کی پانکٹی ٹوٹ گئی تھی اور چار پائی اچھا خاصا ٹنواں بن گئی تھی۔ صبح اٹھتے ہی بے تحاشا گالیوں اور مار دھاڑ کی آواز سنا کر دی، اور پھر وہی: ”ارے تو نے اتنی کنگنی ضائع کر دی ہے۔ کچھڑی کے لئے تو اتنے سے ہی چاول کافی تھے۔ اب بے اوکتے کے بیچ!“

اسٹین بولا: ”بھئی اب مجھ سے نہیں رہا جاتا۔“ داؤد کا نظریہ بدستور رجعت پسندانہ تھا: ”جو مار کھانے کے لائق ہوتے ہیں انہیں مار ہی پڑنی چاہئے۔“ لیکن آج وہ بھی میرے اور اسٹین کے ساتھ مل کر ہو رہا تھا کہ بے چارے نورے کے ساتھ صریحاً لڑائی ہو رہی ہے۔ داؤد نے ایک افسانے کو میز پر رکھا اور دوسرا افسانہ پچھڑ دیا۔

”ارے یار بلاؤ تو اس نورے کو۔“ اس نے مجھے تحکمانہ انداز سے کہا۔

لحاف کا اندرونی حصہ باہر کی برفانی سردی کے مقابلے پر کم تکلیف تھا لیکن اس تحکمانہ انداز اور

نورے کے پس جانے کے خیال نے اس میں وہ گرمی پیدا کر دی کہ میں لحاف کو پھینکے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے نورے کو بلایا۔ نورامنہ میں کچھ بڑا رہا تھا لیکن داؤد کے سامنے آ کر وہ یوں کھڑا ہو گیا جیسے اردلی اپنے صاحب کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔

داؤد نے بات شروع کی: ”ابے نورے! تمہارے کتنے ہاتھ ہیں؟“

داؤد ہمیشہ ایسی بات سے سلسلہ گفتگو شروع کرتا تھا جس میں حیرت کا عنصر موجود ہو۔ نوراس سوال پر قدرے حیران ہوا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے ادھر ادھر دیکھا، جیسے کتابت میں پڑھنے سے پہلے اسے سوگھ لیتا ہے۔ اور پھر وجدانی طور پر ایک موافق ماحول کی بو پا کر سکون سے بولا: ”دو۔“

”جہاں کے کتنے کان ہیں؟“

”دو!“

”تمہاری کتنی آنکھیں ہیں؟“

”دو۔“

”تم کیا کھاتے ہو؟“

”میری میس ساڑھے بیس کے قریب بنا لیتا ہوں

مہینے میں۔“

”اور جہاں کیا بنا تا ہے؟“

”سولہ سترہ روپے۔“

”تو بھاگ جاؤ یہاں سے اتحق کہیں کے۔“

تمہاری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ مار کھاتے رہو، راستے میں پڑے ہوئے روڑے کی طرح راہ گیروں کی ٹھوکریں کھاؤ..... جاؤ۔“

نورے نے چادر کو اپنے گرد لپیٹا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے چلا گیا۔ اسٹین اور میں نے داؤد کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بلند اور ناشائستہ سا قہقہہ لگایا۔ اسٹین بولا: ”ارے داؤد! تم مجھے عجیب آدمی ہو۔ باتیں کرتے میں بھی تمہارا اپنے افسانے کا ہی انداز ہے۔ ایک نفسیاتی اختتام پر آ کر بس کر دیا۔ ارے نورے کے سے آدمی کو ہمرنگ چاہئے۔ ہمرنگ..... سمجھے؟ عوام

بمیرنگ چاہتے ہیں۔ بات ان پر واضح اور ہر ادھر اکر ٹھونسنی چاہیے۔ ان کی نفسیات یہی ہے کہ زیادہ نفسیات سے کام نہ لیا جائے۔ صاف کہو: بھیجی اس طرح کے ہاتھ، کان اور کمائی ہوتے ہوئے بھی جہاں سے کیوں دب رہے ہو؟

اس پر ایک اور فرمائش قہقہہ بڑا۔ رفیق ہنستے ہوئے اس مرنے کی مانند اچھلا جس کی گردن ایک ہی ضرب میں بدن سے علیحدہ کر دی گئی ہو۔ ہم نے پھر نورے کو بلایا اور جہاں کے خلاف اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ نورے میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہو گئی۔ اس کے جسم کے پٹھے پھر کٹے لگے۔ چادر میں سے اس نے اپنے لمبے لمبے بازو نکال لئے اور جہاں کے ساتھ لڑائی کا تصور ذہن میں لاتے ہوئے بولا: ”جج جج اس نے مجھے نامرد سمجھ رکھا ہے۔ ایک دفعہ وہ چکری دوں کر.....“ اور نورے پر حقیقت کا انکشاف ہونے لگا اور آج وہ جان سکا کہ اسے مار پڑ رہی ہے۔ اس کے منہ کے ایک طرف کف کی ایک نفرت انگیز مگر متبرک، تحریریں مگر تعمیری سی تحریر دکھائی دینے لگی۔ اسٹین نے بالکل لیٹن کا سا کام کیا۔ ایک عام آدمی کے ذہن و لاشور میں یہ احساس بھر دیا کہ اسے دبا جا رہا ہے۔

نورے کے جانے کے بعد رفیق، نلیش کی طرح پوچھنے لگا: ”تمہارا کیا خیال ہے، پھنسی تو نمودار نہیں ہوگی؟ ڈاکٹر بالی نے کہا تھا کہ تین ہفتے سے چھ ہفتے تک میعاد ہوتی ہے، اور اب چوتھا ہفتہ جا رہا ہے اور کوئی نشان نہیں۔ اور میں کل کی نسبت آج کمزور نہیں دکھائی دیتا کیا؟“ میں نے رفیق کو یقین دلاتے ہوئے کہا: ”بھیجی پھنسی نہیں ہوگی۔“ لیکن وہ کہنے لگا: ”تم میرا جی رکھنے کے لئے کہہ رہے ہو۔ خدا کی قسم کھاؤ“ میں نے تنگ آ کر ہمدردی سے عاری، اتنی اوچی آواز میں قسم کھائی کہ رفیق نے مغموم و مایوس ہو کر اس کا ذکر بند کر دیا۔ لیکن صرف اسی وقت کے لئے!

بڑے مزے کی بات ہوئی۔ نورہمارے یہاں تو سچ پا ہوا لیکن جہاں کے پاس گیا تو بولا: ”دیکھو بھیا یہ باو

لوگ مجھے تمہارے خلاف اکساتے ہیں۔ کہتے ہیں تم اس کے دہل ہو۔ اب بھلا میں کہاں ہوں تمہارا دہل؟“ اور بدستور اٹھا چوہا صبح کی ٹاپوں، کے لئے سلگنے لگا۔ داؤد کہنے لگا کہ اس میں سارا تصور لیٹن یا اسٹین کا ہے۔ اگر میرا افسانوی طریقہ برتا ہوتا تو بات پھر لوٹ کر اس کے ذہن میں آتی، چوٹیں لگتی اور بس جاتی، اور جہاں کا نام لینے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ یہ فرق تھا لیٹن اور گور کی میں، اسٹین اور داؤد میں۔

رفیق نے یاس آلود لگا ہیں اور اٹھائیں اور موضوع کو ٹانگ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا: ”تہذیب حاضر جسم اور روح کی بیماریاں پیدا کرتا جانتی ہے۔ اس کے پاس پھنکار ہے لیکن علاج اور نشئی نہیں۔ مریض کے دوسرے سوال کا جواب دینے کا صبر و حوصلہ بھی نہیں۔ اور یہ آئینہ کہاں تک مددگار ہے۔ دیکھ اس میں مجھے اپنا رنگ زرد دکھائی دیتا ہے۔ میں اسے توڑ دوں گا۔“ اور نیور تھینک رفیق نے آئینے کو باہر پھینک کر اس کے ٹکڑے کر دیئے۔

اب ہم جہاں سے چھیننے لگے لیکن جہاں ”بیٹا باہر تو نکل“ کی انداز کے باتیں کرنے لگا۔ ہم نے بھی ڈنڈ پیلے، ماش کی، موگر اٹھا کر پشوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہا: ”لے نکلتے ہیں، کر لے جو کرنا ہے۔“ اور جہاں مرعوب ہو گیا۔ نورے کے متعلق ہم نے سوچا ”نورا جائے جہنم میں۔ ہمیں اس سے کیا غرض؟ داؤد کا نقطہ نگاہ درست ہے، بلکہ اسے جتنی بھی پڑیں تھوڑی ہیں!“

ہمیں نورے کی اس بیماری کے متعلق ابھی تک حیرت تھی لیکن ہم نے اسے کمتری کے احساس کا سارا سوائے عام نام دے کر کمال بے صبری اور بے حوصلگی سے اپنے ذہن کو فارغ کر دیا۔ ایسا کیسی ایک دن جہاں نورے کو اپنی دوستی اور رفاقت کے قابل نہ سمجھ کر علیحدہ ہو گیا۔ اس وقت نورے نے جہاں کی منتیں کیں، آنسو بہائے لیکن جہاں تھا کہ برابر کہے جا رہا تھا کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی رہے۔

داؤد چیخا، اسٹین نے نفسیات کی ایک کتاب

جلائی اور ہم دونوں نے مل کر ایک بے ربط اور بے سری آواز میں ہند کا قومی ترانہ: ”سلامت رہے ہمیشہ فرمانروا ہمارا“ گایا۔ گانے کے بعد رفیق نے کہا کہ دیکھو بھی سستی ہی جان چھوٹی ہے اور نورہ کہہ مانتا ہی نہیں ”ابے نورے!“ پھر آہستہ آواز اور دانت نہیں کر ”ابے نورے!“ اور نورہ ہے کہ صدیوں سے غلام چلے آئے والوں کی طرح اپنی غلامی میں ہی نجات سمجھنے لگا ہے اپنے پاؤں کی پیڑی کو ہی اپنا زور سمجھتا ہے۔

لیٹن جہاں چلا گیا اور ایک شخص فرد کا فاروق نے جہاں کی جگہ لے لی۔ دانے قسمت! اب نورہ فرد کے کاغلام تھا۔ لیکن تجب کی بات تھی کہ ایک دن نورے نے احتجاج کیا۔ بات یوں ہوئی کہ فرد کے نے کسی بات سے دھکی ہو کر نورے سے کہا: ”جاتیرا خانہ خراب ہو۔“

نورے کو کچھ یاد آ گیا۔ آنسو تھے کہ بے تحاشا لٹہ رہے تھے۔ ایک بات کا اضافہ ہوا۔ روتے روتے کھٹکھی بندھ گئی۔ نورہ بار بار یہی کہتا تھا کہ تو نے مجھے مار لیا ہوتا، پیٹ لیا ہوتا لیکن یہ الفاظ مجھے نہ کہے ہوتے۔ فرد کے نے نورے کو دلاسا دیا لیکن نورہ تھا کہ برابر روئے جا رہا تھا: ”ہائے! تو نے مجھے یہ نہ کہا ہوتا۔“

اسے منانے کے لئے فرد کا گھر بیٹھ رہا اور گیرج شاپ، جہاں کہ وہ کام کیا کرتا تھا، نہ گیا۔ ہم نے بھی کالج سے چھٹی کی اور نورے کو کریدنے لگے۔ جب نورہ بولنے کے قابل ہوا تو کہنے لگا: ”چھوٹے ہوتے میرے ماں باپ مر گئے۔ بھائی نے بالاپوسا اور نوجوان کیا۔“

اور نورہ پھر رونے لگا۔ اس کی آنکھیں میانی کرے کے ایک بپٹے پر چربی ہوئی تھیں، لیکن گردش ایام پیچھے کی طرف دوڑ گئی تھی اور نورہ تصور میں اپنے بھائی کے پاس کھڑا تھا۔ کچھ دیر کے بعد خود ہی نورے نے بات مکمل کرنے کی اک ہٹ محسوس کی اور بولا: ”مجھے مرغ پالنے کا بڑا شوق تھا تو بڑے بھیا نے مرغ مہیا کئے۔ میں انڈا پوک کی پچانت دار مرض پسند کرتا تھا تو اس نے بہت سی ٹیٹھیں سلا دیں۔ گھر میں بھادج کو زیادہ باجرے کی روٹی پکانے کا حکم تھا کیونکہ وہی روٹی مجھے پسند تھی۔ لیکن

میں اس کے پاس نہ رہا اور بھاگ گیا۔ ایک آٹے کی چکی پر چھ ماہ کاٹ کر گھر لوٹ آیا۔ پھر بھاگا، پھر لوٹ آیا، اور آخر میں نے بھائی کو اس حالت میں چھوڑا جب کہ اس پر فاج گرا تھا۔ اس نے تنگ آ کر مجھے ایک بد دعا دی جو کہ مجھے آج یاد آ رہی ہے۔ اس نے کہا: ”نوری! وہ مجھے ہمیشہ لاڈ سے نوری ہی کہا کرتا تھا۔“ یہاں کچھ دیر رکنے کے بعد فوراً بولا ”اس نے کہا: ”نوری! تو زندگی میں کسی کا گناہ نہیں بنا جاتیرا گناہ بھی کوئی نہیں ہے گا۔“

اس کے بعد کچھ دیر خوشی رہی جس کے بعد نورے نے کہا: ”وہ دن اور آج کا دن، میرا تو کوئی گناہ نہیں بنتا۔ اور آج فرد کا کہہ رہا ہے جاتیرا خانہ خراب ہو! میں اپنے دوست کے لئے کیا نہیں کرتا۔ کینے سے کمینہ کام بھی کرتا ہوں اور جب کوئی میرا دوست مجھے چھوڑتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ یہ سب بھیا بلاتی کی بددعا کا اثر ہے!“

رفیق، داؤد، اسٹین اور میں..... چاروں نے یہ بات سنی اور دم بخود رہ گئے۔ ”اسے نورہ کہتے ہیں۔“ داؤد بولا۔ اسٹین نے گہری سوچ سے سر اٹھایا اور بولا: ”اپنی دق سے مرئی ہوئی ماں کی میں نے خدمت کی اور مرنے سے پہلے اس نے کہا: جابج! تو زندگی میں بڑا سکھ پائے گا۔“ اور اسٹین نورے کے ہی انداز میں بولا: ”وہ دن اور آج کا دن جب کوئی پرستار میری زندگی میں آتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری ماں کی دعائے خیر کا اثر ہے!“

رفیق بولا: ”لوگوں کو منہ سے بات نکالتے ہوئے کچھ سوچ لینا چاہئے۔ تم نہیں جانتے تھے کہ نیورس جنینک کے لئے ایک معمول سا قہر کیا معنی رکھتا ہے۔“ اس وقت داؤد اور میں خاموش تھے۔ شاید ہم بھی اپنی ماضی کی راکھ میں چند سلگتے ہوئے کوئلوں کو اٹھل پھل کر رہے تھے۔



بے چین روح

شہزادہ چاند زیب عباسی - کراچی

پورے کمرے میں ہولناک تاریکی کا راج تھا نوجوان محوے خواب تھا کہ کسی نے اسے اچانک جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں مسلیں اور سامنے دیکھا تو اس پر جیسے کپکپی طاری ہو گئی۔ سامنے ایک مجسم روح کھڑی.....

سنسن اور پرہول اندھیرے میں خراماں خراماں دل و دماغ پر خوف کا سکہ بیٹھاتی کہانی

میں موجود تھی۔ بچے کی گردن کسی تیز دھار ہتھیار سے کاٹی گئی تھی۔ بچے کی لاش اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دوبارہ دریا کے پانی میں جا گری۔

”یا اللہ خیر۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ چند بچوں کی مزید گردن کی لاشیں بہتی ہوئی کنارے پر آ پہنچی تھیں وہ لرزتی کانپتی ٹانگوں سے اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگا جو اس دریا سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔

☆.....☆.....☆

گرجتے بادلوں کی دل دہلا دینے والی آواز میں پوچھا اپنے نومولود بیٹے کو اٹھائے بھاگ رہی تھی اس کا پتی راکش دس سالہ بیٹا دیکھ دوسرا بیٹا پانچ سالہ پردیپ اور سات سالہ بیٹی مانی بھی اس کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ تیز بھاگنے سے ان کا سانس پھول رہا تھا وہ دوڑتے ہوئے بری طرح ہانپ رہے تھے گرجتے بادلوں کے ساتھ ساتھ برسی بارش میں وہ بھیگ چکے تھے سردی انہیں اپنی ہڈیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

رات آدھی سے زائد بیت چکی تھی، اس پر موسلا دھار برسی بارش میں بھاگنا ان کی مجبوری تھی۔ مہاراج پرکاش کے سہیلی موت کی طرح ان کے تعاقب میں تھے۔ ہندوستان میں واقع اس ریاست

صالح محمد دریا کے کنارے بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ رات آدھی سے زائد بیت چکی تھی۔ صالح محمد پانچ وقت کا نمازی اور تہجد گزار تھا اس وقت بھی وہ تہجد کی نماز کے لئے وضو کر رہا تھا اچانک موسم تبدیل ہو گیا۔ بادل گرجنے لگے ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو گئی اس نے ہاتھوں کے چلو میں پانی لے کر جیسے ہی چہرے کے قریب لایا۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس چھا گیا۔ کیونکہ اس کے خوف زدہ ہونے کی وجہ اس کے ہاتھوں کے چلو میں موجود پانی تھا۔ جو خون کی طرح سرخ ہو رہا تھا اس نے لرزتے کانپتے ہاتھوں کے چلو میں موجود پانی کو سونگھا تو اس کے شے کی تصدیق ہو گئی پانی سے انسانی خون کی بو آ رہی تھی۔ اس نے چلو میں موجود پانی کو گرا دیا اور لرزتی کانپتی ٹانگوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی نظریں دریا پر جمی ہوئی تھیں۔ انسانی خون پیچھے کہیں سے دریا کے پانی میں بہتا ہوا آ رہا تھا۔ اسی وقت اس کی نظریں پانی میں بہتی ہوئی کسی چیز پر پڑیں جو کنارے کی طرف آ رہی تھی۔ وہ کنارے پر کھڑا بخور اس چیز کو دیکھتا رہا۔ قریب آنے پر ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا خوف اور ڈر سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ وہ کسی نومولود بچے کی لاش تھی جو اس کے ہاتھوں

کا مالک مہاراج پرکاش انتہائی ظالم اور سنگدل انسان تھا۔ چندہ ماہ قبل اس کے دست راست علم نجوم کے ماہر نارائن نے انکشاف کیا کہ اس اماؤں کی رات اس ریاست میں ایک بچہ ایسا پیدا ہوگا جو مہاراج کی موت کا سبب بنے گا۔

چنانچہ مہاراج پرکاش نے حکم دے دیا کہ اماؤں کی آنے والی رات میں ریاست کی کوئی عورت لڑکا نہ جنے اور جس کے گھر بھی اس اماؤں کی رات لڑکا پیدا ہوگا اس بچے کو اور بچے کے والدین کو مہاراج کے سپاہی قتل کر دیں گے۔

اس اماؤں کی رات کو ریاست میں درجنوں بچوں نے جنم لیا جنہیں مہاراج اور نارائن نے نہایت بے رحمی سے قتل کروا کر دریا میں پھینکوا دیا۔

راکیش اور پوجا اپنے نومولود بچے کی زندگی بچانے کے لئے اپنے پر پیار کے ساتھ رات کو گھر سے بھاگ گئے، مہاراج کو ان کے فرار کی خبر مل گئی چنانچہ مہاراج کے سپاہی گھوڑوں پر سوار ان کا پچھا کر رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے وہ جنگل میں داخل ہو گئے۔

اچانک انہیں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں لگیں۔ موت ان کے سر پر پہنچنے والی تھی۔ اب ان میں مزید دوڑنے کی ہمت نہ تھی۔

اچانک دس سالہ دیپک بھاگتے بھاگتے ایک چھوٹے کھائی نما گڑھے میں چلتا ہوا ہوا گر گیا۔

اسی وقت گھوڑوں پر سوار نصف درجن مسلح سپاہیوں نے انہیں گھیر لیا۔ ان میں مہاراج کا دست راست نارائن بھی تھا۔ ”خبردار اب بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ہم کو بلی چلا دیں گے۔“ نارائن غصے سے چلایا۔ وہ ٹھنک کر اپنی جگہ پر رک گئے، نارائن کے اشارے پر ایک راتفل بردار نے زبردستی نومولود بچے کو پوجا سے چھین لیا۔

”سردار یہ بچہ تو سردی اور بارش کی شدت سے مر چکا ہے۔“ پوجا سے بچہ چھیننے والا راتفل بردار جیسے چیخا۔ پوجا نے چیختے ہوئے اپنے نومولود بچے کی لاش

اس سے چھپٹ لی بچے پر نظر پڑتے ہی وہ رونے لگی۔ بچہ واقعی دنیا سے گزر چکا تھا وہ معصوم گھٹنوں بارش میں بھینکنے کی وجہ سے سردی سے مر چکا تھا شاید اسے مرے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی پوجا کو بھاگنے کے دوران اپنے نومولود بچے کی موت کی خبر بھی نہ ہو سکی تھی۔

”نہیں حویلی لے چلو، ان کا فیصلہ مہاراج کریں گے۔“ نارائن نے حکم دیا۔

انہیں بے دست دیا کر کے حویلی کی طرف لے جایا جانے لگا۔ بچے کی لاش پوجا سے چھین کر جنگل میں پھینک دی گئی تھی۔

”تم لوگوں نے مجھ سے غداری کی ہے جس کی سزا بہت بھیا تک ہے۔“ مہاراج کے حکم سے راکیش اور پوجا کو گتھر کے پے در پے دار کر کے قتل کر دیا گیا۔ پانچ سالہ پردیپ اور مائی کو اگرچہ زندہ رکھا گیا پر انہیں غلاموں میں شامل کر دیا گیا۔

رات نصف سے زائد بیت چکی تھی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسے نیند نہیں آ رہی تھی بلکہ اس کی وجہ وہ خواب تھے جو مسلسل کی روز سے اسے خوف زدہ کر رہا تھا وہ اکثر خواب میں دیکھتا۔

ایک عورت کفن پہننے اس کے سامنے کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے ”دیپک میں کب سے بے چین ہوں۔ تمہاری راہ تک رہی ہوں جلدی آؤ۔“ وہ اکثر یہی بات دہراتی۔

بھی وہ خواب دیکھتا، ایک جنگل سے جس میں ایک عورت اور مرد تین بچوں کے ساتھ بھاگ رہے ہیں۔ عورت نے ایک نومولود بچہ اٹھا رکھا ہے اسے نہ جانے کیوں ایسا لگتا تھا جیسے اس نے اس جنگل کو دیکھا ہے آج بھی وہ یہ خواب دیکھ کر آدمی رات کو بیدار ہو چکا تھا شاید سردی کے موسم میں بھی اسے خوف سے پسینے آ رہے تھے پوری رات اس نے روتیں بدل بدل کر جاگ کر گزاری۔ صبح پانچ بجے کے قریب وہ گہری نیند سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو دن کے بارہ بج رہے تھے اس

وقت وہ ناشتہ کر رہا تھا اس کے قریب ہی اس کی والدہ بلیس موجود تھیں اس کے والد زبیر احمد ایڈووکیٹ کورٹ جا چکے تھے۔ ”کیا بات ہے بیٹا! آج تم اتنی دیر سے اٹھے ہو اس کے باوجود بھی تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں لگتا ہے تم رات بھر سوئے نہیں۔“

امی! آج پھر میں نے وہی خواب دیکھا ہے خواب میں وہی عورت ہمیشہ کی طرح مجھے دیکھ کہہ کر بکارتی ہے دوسرے خواب میں ہمیشہ کی طرح ایک جنگل دیکھتا ہوں جو مجھے دیکھا بھالا لگتا ہے اس جنگل میں ایک عورت اور مرد بچوں کے ہمراہ بھاگ رہے ہیں نہ جانے کیوں مجھے وہ بچے بھی جانے پہچانے لگتے ہیں۔ وہ بچے تین روح نہ جانے مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ ان پر اسرار خواہوں نے میرا چین سکون چھین لیا ہے۔“

”تم کسی ماہر نفسیات کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔“

”امی میں کوئی نفسیاتی مریض نہیں۔ جو ماہر نفسیات سے رجوع کروں۔“ عثمان تڑپ اٹھا۔

”خیر چلو ناشتہ کر کے گھوم پھر آؤ دل بہل جائے گا۔“ والدہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا عثمان سر جھکانے ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ عثمان ایڈووکیٹ زبیر احمد کا اکھوتا بیٹا تھا والدین اس سے بہت پیار کرتے تھے عثمان کو ایک بات پر بہت حرمت ہوتی تھی کیونکہ ان کے گھر میں عثمان کی بچپن کی کوئی تصویر نہیں تھی اس بارے میں اس نے کئی بار والد اور والدہ سے پوچھا مگر انہوں نے اسے ٹال دیا۔

آج اس نے پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ گھر میں اپنے بچپن کی کوئی تصویر ڈھونڈے گا۔ ناشتہ کر کے اٹھا تو پتہ چلا والدہ بڑوں میں تھی ہوئی ہیں۔ اس نے موقع غنیمت جان کر گھر میں موجود الماریوں کی تلاشی لینا شروع کر دی ایک الماری سے کچھ اہلیم لے جس میں اس کی والدہ بلیس اور والد زبیر احمد اور رشتہ داروں کی تصویریں تھیں مگر اس کی کوئی بچپن کی تصویر نہ تھی آخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک الماری سے پرانا سا اہلیم ملا کھول

کردیکھتے ہی اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا وہ بلیس اور زبیر احمد کی جوانی کی تصویر تھی ان کے ساتھ ایک دس سالہ بچہ تھا بچہ ہو ہوا اس بچے کی طرح تھا جیسے اس نے کئی بار خواب میں ایک مرد اور عورت کے ساتھ جنگل میں بھاگتے دیکھا تھا وہ سوچنے لگا۔ ”اس بچے کا میرے والدین سے کیا تعلق ہے؟ اس تصویر کو انہوں نے کیوں چھپا کر رکھا ہے؟ کہیں یہ بچہ میں ہی تو نہیں؟ اگر ایسا ہے تو وہ مجھ سے اس بات کو چھپا کیوں رہے ہیں؟ وہ عورت مرد کون ہیں جن کے ساتھ وہ بچہ بھاگ رہا ہے؟“ سوچوں کی یلغار تھی جس نے اس کے ذہن کو چکر کر رکھ دیا تھا۔ والدہ کے گھر آنے کے بعد اس کی ہمت نہ ہوئی کہ اس سے کچھ پوچھتا وہ خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا کہ دوستوں سے گھل مل کر اپنے ذہن سے ان سوچوں کو جھٹکنے کی کوشش کرے گا۔

شام چھ بجے کا وقت تھا نئے ماڈل کی جیب سڑک پر درمیانی رفتار سے چل رہی تھی اس جیب میں عثمان، جاوید، ندیم اور ارسلان موجود تھے یہ جیب ندیم کی تھی ندیم ایک بہت بڑے صنعت کار آغا ناصر درانی کا بیٹا تھا وہ چاروں گہرے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ کلاس فیلو بھی تھے ندیم نے ملک بھر کی سیر کا پروگرام بنایا تو چاروں نے کالج سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے لی انہیں گھومتے ہوئے آج تیسرا روز تھا ندیم گاڑی خود ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ بقایا تین دوست پچھلی نشست پر براجمان تھے۔

ندیم نے گاڑی اچانک سڑک کے درمیان روک دی۔ ”اس سنسان سڑک پر اس طرح گاڑی کیوں روکی۔“ عثمان نے پوچھا۔

”سامنے سڑک پر کھو۔“ ندیم نے سڑک کی طرف اشارہ کیا انہوں نے دیکھا۔ گاڑی سے کچھ فاصلے پر سڑک کے درمیان ایک سفید رنگ کی بلی کھڑی تھی عثمان گاڑی سے اتر کر بلی کے پاس چلا گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بلی کو اٹھالیا حیرت کی بات یہ تھی کہ بلی آرام اور سکون سے اس کے ہاتھوں میں موجود تھی۔ اس نے اپنے آپ کو عثمان سے چھڑانے کے لئے کسی قسم کی جدوجہد نہیں

کی۔ عثمان بلی سمیت گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔
”گلتا ہے اس سے تمہاری رشتے داری ہے کتنے
آرام اور سکون سے تمہاری گود میں بیٹھی ہے۔“ ارسلان
ہنسا ندیم نے گاڑی چلا دی۔

کچھ دیر بعد ندیم اچانک خوف زدہ نظر آنے لگا
اس کے خوف زدہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ گاڑی اس کے
کنٹرول سے باہر ہو چکی تھی۔ بائیں سمت ایک سڑک
جاری تھی ندیم نے اسٹرینگ موٹر گاڑی کو بائیں سمت
والی سڑک پر لے جانا چاہا۔ مگر ناکام رہا۔ اسٹرینگ فل
گھمانے کے باوجود گاڑی سڑک پر سیدھی دوڑتی چلی
جاری تھی۔ ندیم نے بریک پر پاؤں کا دباؤ بڑھا کر اسے
روکنے کی کوشش کی جیپ روکنے کے بجائے تیزی سے
آگے بڑھنے لگی گاڑی کی رفتار اس وقت سو سے زائد تھی
ندیم کے چہرے کا رنگ خوف سے سفید پڑنے لگا۔

”خیریت تو ہے؟ تمہارے چہرے پر ہوائیں
کیوں اڑ رہی ہیں؟“ ارسلان نے پوچھا۔

”یاد عجیب بات ہے۔ گاڑی میرے کنٹرول
سے باہر ہو چکی ہے۔ اسٹرینگ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے
بائیں سمت والی سڑک پر لے جانے کے لئے اسٹرینگ
فل گھمایا اس کے باوجود یہ اپنی مرضی سے ایک ہی سمت
جاری ہے۔ یہ دیکھو!“ ندیم نے اسٹرینگ کو پوری قوت
سے بائیں طرف گھمایا۔

”انہوں نے دیکھا تو گاڑی واقعی سڑک پر سیدھی
چلی جاری تھی اور اس کے علاوہ گاڑی کے بریک بھی کام
نہیں کر رہے ہیں رفتار کم ہونے کے بجائے بڑھتی جاری
ہے۔ گلتا ہے کوئی مرنی طاقت گاڑی کو کنٹرول کر رہی
ہے۔“

ندیم کے الفاظ نے سب کو ہراساں کر دیا وہ
خوف زدہ ہو گئے۔ ”یار کیوں نہ گاڑی سے
کوڈ جائیں۔“ عثمان نے مشورہ دیا۔

”حق گاڑی کی رفتار اس وقت سو سے زائد ہے
اتنی رفتار سے چلتی گاڑی سے کوڈنا خود کشی ہوگی۔“
جاوید جھٹلا کر بولا۔

”یار جب سے یہ پراسرار بلی گاڑی میں سوار
ہوئی ہے اس وقت سے گاڑی ہمارے کنٹرول سے باہر
ہے کہیں یہ کوئی جن یا روح تو نہیں؟“ ندیم عثمان کی گود
میں بیٹھی بلی کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

ندیم کے تبصرے نے ان سب کو مزید دہشت
میں مبتلا کر دیا تھا۔ اب وہ خاموش بیٹھے خوف زدہ نظروں
سے بلی کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک اسی وقت بلی نے ماؤں
کی آواز نکالی اور تیز رفتاری سے چلتی گاڑی کی کھڑکی سے
کوڈ گئی بلی کی اس غیر متوقع حرکت سے وہ بھونچکے رہ گئے۔
”گلتا ہے تمہاری بات کا برہان ملے گا۔“ جاوید ندیم
کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ یہ بات اس نے مزاح کے
انداز میں کہی تھی کہ اس کے دوستوں کے دل سے خوف
نکل جائے۔ اب بچنے کی ایک ہی صورت ہے کسی نہ کسی
طرح گاڑی کا ایندھن ختم ہو جائے۔ گاڑی خود بخود روک
جائے گی۔ ”ندیم اس کی بات پر دھیان دیے بغیر بولا۔“
منشی قل ہے ایندھن ختم ہونے تک گاڑی پتہ نہیں لہاں
تک پہنچ جائے گی۔“ ارسلان نے ہونٹوں پر زبان
پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ حیرت اور خوف سے گاڑی کو انجان راستوں
پر تیز رفتاری سے چلتے دیکھتے رہے۔ سڑک رات کے اس
پہر سنسان تھی کبھی کبھار ایک آدھ گاڑی دکھائی دیتی۔ تو وہ
شور مچا کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر کوئی بھی
ان پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔ بلکہ گاڑی میں موجود افراد
حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھا کر
آگے نکل جاتے۔ وہ چاروں حیرت اور خوف کے لے
چلے جذبات سے گاڑی کو اپنی مرضی سے چلتے ہوئے
دیکھتے رہے۔ ارسلان تو قرآنی آیات پڑھنے لگا۔ اس
کے دیکھا دیکھی باقی دوستوں نے بھی زیر لب قرآنی
آیات پڑھنی شروع کر دی تھیں ان کا یہ پراسرار اور خوفناک
سفر کافی دیر تک جاری رہا۔ صبح تقریباً چھ بجے کے قریب
ان کی جیپ ایک سرسبز گاؤں میں جا کر رکی۔ چاروں
جلدی سے نیچے اترا آئے۔ ”یہ کوئی جگہ ہے؟“ عثمان بولا۔
”ایسا کرتے ہیں پیدل آگے چلتے ہیں۔“ جیسے

ہی کوئی نظر آیا تو معلوم ہو جائے گا یہ کوئی جگہ ہے؟“ ندیم
بولا۔ اور پیدل ناک کی سیدھ میں چل دیئے۔

”کچھ دور چلنے کے بعد سامنے سے ایک صحت
مند بوڑھا آدمی آتا دکھائی دیا۔“ باباجی یہ کونسا علاقہ
ہے؟“ ندیم نے اس سے پوچھا۔ ”پٹنیا یہ انڈین سرحد
کے قریب واقع گاؤں پریم نگر ہے تم لوگ یہاں کیسے
آئے؟ شکل سے تو تم لوگ شہری دکھائی دیتے ہو۔“ اور
بوڑھا انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”باباجی راستہ بھٹک کر ادھر آ گئے ہیں آپ شہر کی
طرف جانے والی سڑک کا ایڈریس بتادیں شاید ہمیں کسی
سے لفٹ مل جائے۔“ عثمان بوڑھے کی طرف امید بھری
نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ بوڑھا انہیں راستہ
سجھانے لگا۔ وہ اس کا شکر یہ ادا کر کے اس کے بتائے
ہوئے راستے پر پھل پڑے۔ ابھی تک کسی آبادی کے
آثار دکھائی نہ دیئے تھے۔ ایک جگہ پانی کا چشمہ دیکھ کر وہ
بے تابی سے آگے بڑھے ہاتھوں کے چلو سے خوب
برہو کر پانی پیا اور آگے بڑھ گئے۔ کافی دیر چلتے رہنے
کے باوجود نہ ہی کوئی آبادی دکھائی دی اور نہ ہی کوئی
سڑک نظر آئی وہ چلتے چلتے تھک چکے تھے۔ بھوک بھی
لگنے لگی تھی کھانے پینے کا سامان گاڑی میں چھوڑ کر آئے
تھے اس لئے بھوکے پیٹ پیدل چلتے رہے کافی دیر بعد
انہیں ایک عمارت دکھائی دی۔ قریب جانے پر معلوم ہوا
وہ کوئی مندر تھا۔ ”مندری حالت سے لگتا ہے یہ کافی قدیم
مند ہے۔“ ارسلان نے تبصرہ کیا۔

”چلو اندر چلتے ہیں ضرور کوئی نہ کوئی موجود ہوگا
اور ہم اس سے سڑک کی طرف جانے والا راستہ معلوم
کر لیں گے۔“ ندیم بولا۔

”وہ چاروں مندر میں داخل ہو گئے ہال نما
مرے میں چاروں طرف دیوٹی دیوتاؤں کی مورتیاں
لی میس ایک طرف کالی کا بڑا سابت موجود تھا۔ چھت
سے پیتل کی گھنٹیاں لٹک رہی تھیں ہر طرف سناٹا
مایا ہوا تھا حیرت کی بات یہ تھی کہ مندر میں کوئی ذی نفس
نہ تھا۔“ یار جلدی سے باہر چلو۔ مجھے تو وحشت

ہو رہی ہے۔“ عثمان بولا۔

اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں، پیتل کی گھنٹیاں
ہوا کے چلنے سے جھنجھکیاں جن کی آواز اس ہال نما کمرے
میں گونج رہی تھی اچانک مندر میں بلی کی میاؤں کی آواز
سنائی دی۔ چاروں نے آواز کی سمت دیکھا تو خوف سے
ان کی ریزہ کی ہڈی میں سرد لر دوڑ گئی کیونکہ وہ وہی بلی تھی
جو انہیں سڑک پر لٹی تھی اور پھر چلتی گاڑی سے راستے میں
کوڈ گئی تھی۔

”جلدی باہر چلو۔“ عثمان چیختے ہوئے بولا۔

اسی وقت پورے مندر میں گھپ اندھیرا چھا گیا
اور ہال نما کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔
اس گھپ اندھیرے میں بلی کی آنکھیں چمکنی ہوئی دکھائی
دے رہی تھیں۔ ڈر اور خوف سے ان کے جسم سے پسینہ
بہنے لگا ان چاروں کو کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ ا
ندازے سے دروازے کی سمت بھاگے دوڑتے ہوئے
عثمان کو شوگر لگی اور وہ چیخا ہوا گر پڑا اسے یوں لگا جیسے وہ
کسی کھائی میں گر رہا ہو وہ تیزی سے نیچے کی طرف
گر رہا تھا۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اسی
وقت اس کے جسم کو جھک لگا تو اس نے کراہتے ہوئے
آنکھیں کھول دیں وہ ایک طویل سرنگ میں مٹی کے ڈھیر
پر پڑا تھا۔ ایک طرف ہلکی سی روشنی دکھائی دے رہی تھی وہ
اٹھا اور روشنی کی طرف بڑھنے لگا کہ شاید یہاں سے باہر
نکلے گا کوئی راستہ دکھائی دے وہ چلتا رہا مگر روشنی کے
قریب نہ پہنچ سکا وہ سرنگ شیطان کی آنت کی طرح لمبی
تھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی چلتے چلتے اس
کے پاؤں تھک گئے وہ مایوس ہو کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ
اگر وہ یہاں سے نہ نکل سکا تو بھوک اور پیاس سے
مر جائے گا یہ سوچتے ہی وہ دوبارہ کھڑا ہوا اور تیزی سے
چلتے لگا۔ وہ رے کے بغیر گھنٹوں چلتا رہا۔ مگر سرنگ کا اختتام
نہیں ہوا تھکن سے اس کا جسم دھنکے لگا تھا پیاس کی شدت
سے اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اسے اپنے حلق میں
کانٹے سے چیتے محسوس ہو رہے تھے یوں لگتا تھا کسی بھی
لحمے پیاس کی شدت سے اس کی جان نکل جائے گی چلتے

چلتے وہ بے دم ہو کر گڑا اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ ”کیا میرا آخری وقت آ گیا ہے۔“ یہ سوچتے سوچتے اس نے آنکھیں موند لیں۔

”تم نکھیں کھول! میرے لعل، میں آگئی ہوں۔“ اس کے کانوں سے ایک نسوانی آواز نکل گئی۔ اس نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں حیرت و خوف سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کی نظروں کے سامنے وہی عورت کھڑی تھی جو مسلسل اس کے خوابوں میں آتی رہی تھی۔ بالکل وہی شکل و صورت کفن جیسے لباس میں ملیوں ”کک..... کون..... ہو..... تم؟“ عثمان نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”میرے بچے برسوں سے تیری راہ تک رہی ہو۔ تیرے بھائی اور بہن ظلم کی بجلی میں پس رہے ہیں مہاراج نے ان معصوموں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔ اب سے آ گیا ہے اس کے ظلم کے خاتمے کا تمہیں اپنے باپ، معصوم بھائی اور میرے خون کا بدلہ لینا ہے۔“ پراسرار عورت کے الفاظ سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تمہارا بیٹا نہیں، میرے والدین زندہ ہیں۔ میرا تعلق کسی مہاراج سے نہیں۔ میں پاکستانی ہو بھگ کراس سرنگ میں پھنس گیا ہو یہاں سے نکلنے میں میری مدد کرو۔“ عثمان کسی حد تک اپنے خوف پر قابو پا چکا تھا بولا۔

”تمہیں دیکھ تم کچھ نہیں جانتے۔ تم ہی میرے بیٹے دیکھ ہو تم اس وقت بہت چھوٹے تھے جب ہم مہاراج کے سپاہیوں سے جان بچانے کے لئے جنگل میں بھاگ رہے تھے۔ اور مہاراج کے کارندے موت کی طرح ہمارے پیچھے تھے۔ پھر تم کھائی میں گر کر بے ہوش ہو گئے مہاراج کے سپاہی ہمیں پکڑ کر لے گئے تمہارا معصوم بھائی جس کی پیدائش کو ایک روز گزر رہا تھا بھاگ دوڑ میں سر دی کی شدت سے مر گیا مہاراج نے تمہارے پتا کو اور مجھے قتل کروا دیا تمہاری بہن اور بھائی کو غلام بنالیا، اب بھی اگر تمہیں یقین نہیں تو تمہارے سینے پر سکہ کی طرح ایک کالا نشان ہے۔ اسے غور سے دیکھو تمہارے

خاندان کے ہر فرد کے سینے پر ایسا ہی نشان موجود ہوتا ہے تمہارے دادا کے سینے پر بھی تھا تمہارے باپ کے سینے پر بھی یہ نشان موجود تھا تمہارے بھائی پر دیپ کے سینے پر بھی یہ نشان ہے۔“ روح بولی اور عثمان حیران رہ گیا۔ حقیقت میں اس کے سینے پر بھی وہ نشان موجود تھا۔

”چلو میرے ساتھ اس سرنگ کا دوسرا دہانہ ہندوستان میں جا نکلتا ہے۔“ روح بولی۔

”میں اب مزید نہیں چل سکتا۔ نہ ہی تمہاری باتوں پر یقین کروں گا۔ مجھے ایسا کچھ یاد نہیں۔“ عثمان نے اسے جھٹلایا۔

”تم آتما کی شکتی نہیں جانتے تمہیں یہاں تک لانے میں میرا ہاتھ ہے۔ تم میرے زیر اثر یہاں تک پہنچے ہو تمہاری گاڑی میں جو بی سوار ہوئی تھی اور جس کی کومندر میں تم نے دیکھا تھا وہ میں تھی تمہاری گاڑی کومندر کے قریب میں نے ہی پہنچایا تھا۔“

”جب تم اتنی طاقتور ہو تو اپنا بدلہ خود کیوں نہیں لے لیتی؟“

”آتماؤں کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں مجھے یہ اختیار نہیں کہ کسی کی جان لے سکوں۔ ادھر میری آنکھوں میں دیکھو تمہیں سب یاد آ جائے گا۔“ روح بولی اور عثمان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر وہ ان چمکدار پراسرار آنکھوں کے سحر میں ڈوبنے لگا اس نے نظریں پھیرنا چاہیں مگر ناکام رہا۔ روح کی آنکھوں کے سحر نے اسے جکڑ لیا تھا اسے ایسا محسوس ہوا روح کی آنکھوں سے روشنی نکلی اور اس کی آنکھوں کے راستے اس کے دماغ میں داخل ہو گئی اس کے ذہن کے پردے پر جیسے فلم چلنے لگی اسے یاد آنے لگا دس سالہ دیکھ اپنے باپ کا ہاتھ تھا اسے بھاگ رہا تھا ماں نے نومولود بھائی کو اٹھا رکھا تھا۔

ان کے ساتھ ساتھ پردیپ اور ان کی بہن بالا بھی دوڑ رہی تھی رات کے اس پہر بارش برس رہی تھی اور پھر وہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر ایک کھائی میں گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسے ہوش آیا تو وہ کھائی میں پڑا تھا سر دی کی

وجہ سے اسے تیز بخار ہو رہا تھا کھائی اگرچہ زیادہ گہری نہ تھی لیکن دس سالہ بچہ حال بچے کے لئے ہار نکھنا ناممکن تھا وہ مدد کے لئے چیختے چلانے لگا۔ کچھ دیر بعد کسی نے کھائی میں جھانک کر پوچھا۔ ”کون ہے اندر؟“

”میں ہوں! مجھے بچاؤ۔“ وہ چیخا اور پر سے ایک صحت مند شخص اتر اتر اور اسے اٹھا کر کھائی سے باہر لے آیا بخار کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گیا۔

وہ ایک بے اولاد جوڑا تھا جو اس ریاست میں رہنے والے چند مسلمان گھرانوں میں سے ایک تھا۔ جو مہاراج کے مظالم سے تنگ تھے۔ قیام پاکستان کی تحریک زور پکڑ چکی تھی مہاراج جیسے انتہا پسند مسلمان گھرانوں نے وہاں سے ہجرت کرنے کی سوچی جنگل سے گزرتے ہوئے زبیر احمد نے بچے کی چیخ پکار سن کر اسے کھائی سے نکالا یہ جانے کے باوجود کہ بچے کا تعلق ہندو گھرانے سے ہے۔ انہوں نے بچے کی جان بچائی وہ چھپتے چھپاتے وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں ان کے قافلے پر حملے بھی ہوئے۔ ان حملوں میں زبیر احمد کے والد اور بھائی مارے گئے غرض بڑی مشکل سے وہ پاکستان پہنچے۔ جہاں اولاد کی طرح دیکھ کی پرورش کی۔

مسلمان گھرانے میں پرورش پانے کی وجہ سے وہ دیکھ سے عثمان بن گیا۔ ایڈووکیٹ زبیر احمد کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کے پیار و محبت نے عثمان کے ذہن سے بیتے پل کی بنیاد پر چھائیوں کے آثار تک مٹا دیے اب گزرے ماضی کی پرچھائیاں سامنے آتی ہی وہ تڑپ اٹھا۔

”ماں مجھے سب یاد آ گیا ہے۔“ وہ بے تاب سے ماں کی روح کی طرف بڑھا۔ ”ماں مجھے بہت پیاس لگی ہے۔“

”اب نہ ہی تم تھکے گے اور نہ ہی پیاس لگے گی میرے ساتھ چلو۔“ روح نے کہا۔ اور وہ اس کے شانہ بہ شانہ سرزدہ سا چلنے لگا، واقعی بھوک پیاس اور تھکن کا احساس اس سے غائب ہو چکا تھا۔ نہ جانے کب تک وہ

چلتا رہا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ ان کے پیدل چلنے کا سفر کب اختتام پذیر ہوا۔ صرف اتنا دیکھ پایا کہ سرنگ کے دہانے سے نکل کر وہ ایک مندر میں داخل ہو چکے ہیں یہاں بھی جا بجا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں موجود تھیں لیکن اس جگہ ذی نفس موجود نہ تھا۔ دیوار کے گھڑیاں نے بارہ بجے کا اعلان کیا گویا آدھی رات کا وقت تھا۔ وہ روح کے ہمراہ چلتا ہوا ہال نما کمرے سے باہر نکلے گا۔ ”یہ ہم کہاں آ گئے؟“ اس نے ماں کی روح سے پوچھنا چاہا۔ جواب نہ ملنے پر دیکھا۔ روح غائب ہو چکی تھی اس نے پلٹ کر سرنگ کے دہانے کی طرف دیکھا۔ سرنگ کا دہانہ اس طرح غائب تھا گویا کبھی یہ سرنگ تھی ہی نہیں۔

وہ گھبرا گیا اجنبی جگہ نا مانوس ماحول آدھی رات سے اوپر کا وقت نہ جانے یہاں کے لوگ اس سے کیا سلوک کرتے۔ اسے بھوک اور پیاس بھی لگنے لگی تھی۔ ایک جگہ بڑے سے بت کے قریب ایک کٹورے میں دودھ اور پھل رکھے تھے وہ بے تابی سے آگے بڑھا دودھ پینے کے بعد پھلوں سے پیٹ پوچا کی۔ پیٹ بھرنے کے بعد خطرے کا احساس دوبارہ جاگ اٹھا وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے ہال نما کمرے سے نکل گیا راہداری میں سے گزرتے ہوئے ایک کمرے کے بند دروازے کے قریب جیسے ہی پہنچا۔ اسے کمرے سے کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔

”نہیں بچاری! جی یہ پاپ ہے۔“ کمرے سے ایک کپکپاتی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ ”مورکھ یہ پاپ نہیں میری سیوا کرو گی تو سورگ میں جاؤ گی۔“ ایک مردہ قسم کی ہنسی کے ساتھ مردانہ آواز سنائی دی۔

اس نے دروازے کے کی ہول سے اپنی آنکھ لگا دی اندر ایک مکروہ صورت گنجا بچاری دھوٹی باندھے کھڑا تھا اس کے سامنے ایک خوبصورت نوجوان لڑکی کھڑی تھی جس کا لباس کھینچا ثانی کی وجہ سے جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا وہ کچھ دیر تک ان کے درمیان ہونے والی گفتگو منتظر رہا۔ اس دوران بچاری کی دست داریاں بھی

جاری تھیں پجاری اپنی لہجے دار باتوں سے بھولی بھالی لڑکی کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت کمرے کی لائٹ آف ہو گئی۔ کمرے سے لڑکی کی سکسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی یقیناً وہ اس سے دست دراز کی کر رہا تھا اور لڑکی چپ رہنے پر مجبور تھی۔

عثمان کو پجاری پر غصہ آ رہا تھا مگر وہ بس تھا۔ اجنبی جگہ پر پجاری سے الجھنا اسے مہنگا پڑ سکتا تھا۔ اور یہ بھی وہ لڑائی جھگڑے سے دور رہتا تھا وہ تیزی سے مندر سے باہر نکل گیا۔ وہ ایک سرسبز گاؤں تھا چاروں طرف لہلہاتے کھیت تھے رات آدمی سے زائد بیت چکی تھی گلیاں کو بچے نسان تھے۔ رات کے اس پہر اس سرد موسم میں کوئی آفتق ہی گھر سے باہر ہو سکتا تھا گاؤں دیہاتوں میں تو دوسرے ہی لوگ سرشام گھروں میں گھس جاتے ہیں عثمان کی قسمت اچھی تھی کہ اب تک کسی کتے سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ گاؤں کی ایک گلی میں اسے پیٹ پپ نظر آیا وہ تیزی سے لپکا پیاس بھائی اور آگے بڑھ گیا چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ ”وہ کہاں آپہنچا ہے؟“ اس کی ماں کی روح بھی غائب ہو چکی تھی جو اس کی رہنمائی کرتی۔ اسے اپنی بہن اور بھائی کو ظالم مہاراج کے چنگل سے آزاد کروانا تھا۔ جس کا کوئی اتاپتہ اسے معلوم نہ تھا۔ نہ ہی وہ مہاراج کو پہچانتا تھا نہ ہی اس نے اپنی بہن اور بھائی کو دیکھا تھا۔

کافی دیر تک چلتے کے بعد اسے ایک مکان دکھائی دیا وہ اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے سچ ہی کہتے ہیں اسے نیند آ گئی اس کی آنکھ کسی کے جھنجھوڑنے سے کھلی ایک درمیانی قد و قامت کا تیس سالہ شخص اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا اور ساتھ ہی کہہ رہا تھا۔ ”صبح سویرے میرے گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر سو رہے ہو۔ کون ہو بھائی؟“ شکل صورت اور چلیے سے تو تم ادھر کے نہیں لگتے۔“ عثمان نے اٹھتے ہوئے اسے بخور دیکھا وہ شکل سے سیدھا سادھا اور پیٹڈ لگتا تھا۔ ”بھائی پہلے یہ بتاؤ یہ کونسی جگہ ہے؟“ عثمان نے پوچھا۔

”یہ جے پور ہے۔“ وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ عثمان سنائے میں آ گیا۔ ”اس کا مطلب ہے میں اس وقت انڈین علاقے میں ہوں۔“ اس نے سوچا۔ ”تم ہو کون اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ میں یہاں کے تقریباً سبھی لوگوں کو جانتا ہوں۔“ وہ شخص بولا۔ ”میرا نام عثمان ہے، میرا تعلق پاکستان سے ہے۔ پراسرار طریقے سے یہاں پہنچا ہوں۔“ عثمان نے اپنی ساری روداد اسے سنا ڈالی، وہ حیران پریشان سانسٹا رہا۔ ”میرا نام مکیش ہے، تم ایسا کرو گھر کے اندر چلو، وہیں چل کر آرام سے بات کریں گے، گاؤں کے کسی فرد نے دیکھ لیا تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“ وہ چلتے ہوئے مکیش کے گھر میں داخل ہو گئے۔ وہ ایک کچا مکان تھا جس کا محن چھوٹا تھا محن کے آخر میں برآمدہ تھا اور دو کمروں کے دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ محن میں ایک طرف چٹاپوں کا چھپر سا بنا ہوا تھا جس میں تین بکریاں بندھی ہوئی اپنے سامنے رکھے گھاس کے کھڑے پر منہ مار رہی تھیں۔ وہ اسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہو گیا کمرے میں دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر بستر پڑے تھے وہ ایک چار پائی پر آئے سامنے بیٹھ گئے۔ ”دیکھو بھائی! مہاراج بہت خطرناک انسان ہے۔ آزادی سے پہلے وہ یہاں کا راجہ تھا آزادی کے بعد ریاست کا الحاق ہندوستان سے ہو گیا اب بھی اس کا بہت اثر رسوخ ہے تقریباً وہ پوری ریاست کا مالک ہے اس کے سپاہیوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ اسی علاقے میں قلعہ نما بڑی سی حویلی ہے میں زیادہ دن تمہیں اپنے یہاں نہیں ٹھہرا سکتا۔ کوئی ایسا ہندو بست کرتا ہوں کہ تم دوبارہ اپنے وطن جاسکو۔ ویسے بھی میں بہت غریب آدمی ہوں، میری پتی اور ایک چھوٹی سی پٹی ہے وہ لوگ کل سے میرے سالے کے گھر گئے ہوئے ہیں ماضی میں جو ہوا اسے بھول کر واپس چلے جاؤ۔ میرا مشورہ مانو تو اپنے ماضی سے نظریں پھیر کر لوٹ جاؤ، مہاراج کے ہاتھ چڑھ گئے تو مارے جاؤ گے وہ بہت ظالم انسان ہے غریبوں کی بہن بیٹیوں کو دن دھاڑے اٹھوا لیتا ہے اس کے ہاتھ بہت

سے انسانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں یہاں چھوٹی بھی اس سے چھپ کر نہیں رہ سکتی۔ اس کا دست راست نارائن علم نجوم اور کالے جادو کا ماہر ہے۔ اسے نہ جانے کیسے ہر بات کی خبر ہو جاتی ہے میں نے تمہیں یہاں ٹھہرا کر بہت بڑا رسک لیا ہے یہ رسک میں نے تمہاری بھولی بھالی صورت سے متاثر ہو کر لیا ہے۔ مہاراج کی اجازت کے بغیر اس علاقے میں کسی اجنبی کو ٹھہرانے کی اجازت نہیں۔“ مکیش بولتا چلا گیا۔

”مکیش بھائی میں خود یہاں نہیں آیا مجھے تقدیر نے برسوں بعد یہاں پہنچایا ہے اس میں بھی کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ ہے، تم فکر مت کرو، اللہ بہتر کرے گا۔“ رات کو وہ دیر تک جاگتے رہے باتیں کرتے رہے عثمان صبح نو بجے سو کر اٹھا چھوٹے گاؤں کے کچے دروازے پر اور کچھ توں پر چمک رہی تھی مکیش کھیتوں پر کام کرنے جا چکا تھا عثمان کا ناشتہ چھوٹے سے باورچی خانے میں تیار پڑا تھا عثمان نے پراٹھے کے ساتھ ساگ کھایا ایک طرف پڑی چائے گرم کر کے پی دن کے بارہ بجے مکیش واپس آ گیا ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی دستک اتنے زوردار طریقے سے ہو رہی تھی کہ ان دونوں نے سوچا دروازہ کسی بھی لمحے ٹوٹ کر گر جائے گا مکیش نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

نصف درجن افراد ہاتھوں میں رانٹلیں تھاے اندر داخل ہو گئے۔ ”کیا بات ہے؟“ مکیش نے پوچھا۔ وہ مکیش کو دیکھتے ہوئے جارحانہ انداز میں اندر داخل ہو گئے عثمان کمرے کے دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ وہ اس کے سر پر پینچ گئے۔ ”اؤے یہ تو ہو ہو اس کی طرح ہے؟“ ان میں سے ایک حیرت سے بولا۔

دوسرے نے گرجدار آواز میں کہا۔ ”ہاتھ اور ہاتھ اکرا آگے چلو۔“ تیسرے نے رانٹل کا دستہ لگا کر اس کے شانے پر مارا دو افراد نے سنبھلنے سے پہلے اسے عقب سے جکڑ لیا۔ اس کے بدن پر رانٹلوں کے ہت پڑنے لگے وہ درد کی شدت سے چیخنے چلانے لگا۔

مکیش ایک کونے میں کھڑا حیرت اور خوف سے اسے پٹنے دیکھ رہا تھا انہوں نے عثمان کو اٹھا کر نیچے چننا ضروری مرمت کے بعد اس کی تلاشی لی گئی پھر اسے گھسیٹ کر کھڑا کر دیا۔

کچھ دیر بعد وہ اونچی دیواروں والی حویلی کے اندر تھا حویلی کی دیواریں کافی موٹی اور اونچی تھیں۔ حویلی کی انتہی ایک قسم کا قلعہ تھا۔ اسے وسیع عریض محن میں پہنچا دیا گیا وہاں بیٹھنے کے لئے چند خوبصورت کرسیاں رکھی تھیں دو کرسیوں پر دو افراد براجمان تھے ان کے سامنے میز پر شراب کی بوتل پڑی تھی ہاتھوں میں گلاس تھے جن سے وہ وقفے وقفے سے چسکیاں لے کر شراب پی رہے تھے۔

ادھیر عمر کا صحت مند سا شخص جس کے بال یقیناً کلف زدہ تھے مہاراج پر کاش تھا۔ اس کے برابر والی کرسی پر اس کا دست راست نارائن بیٹھا تھا ان کی پشت پر دو خطرناک صورت افراد رانٹل ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے۔

ان سے کچھ فاصلے پر مکیش زمین پر پڑا تھا جس کے جسم پر کوڑے برسائے جا رہے تھے اس کے قتل سے لگا تار چھین لکل رہی تھیں عثمان کو کسی ملزم کی طرح مہاراج کے سامنے پیش کیا گیا تھا مہاراج نے شراب کا کھونٹ بھرا اور بولا۔ ”یہ تو بالکل فلمی سین ہے اس کی شکل بالکل اسی کی طرح ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں ضرور ان میں کوئی رشتہ ہوگا۔ اؤے پاپی تو کہاں سے آیا ہے؟ یہاں کا تو لگتا نہیں شکل سے تو تو معصوم لگتا ہے پر اس نارائن کا کہنا ہے کہ تو میرے لئے خطرہ ہے۔“

”نارائن لگتا ہے تیرے حساب میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے یہ بکری کا بچہ بھلا میرے لئے کیا خطرہ بنے گا۔“ مہاراج جناشت سے ہنسا۔

”مہاراج! اتنا گھمڈ مند کرو، تم مجھے نہیں جانتے یاد کرو، ماضی میں کئی سال پہلے تم نے اسی نارائن کے کہنے پر درجنوں معصوم بچے قتل کروادے تھے میرے معصوم بھائی کو بچانے کے لئے میرے والدین بھاگے تمہارے

کتوں نے انہیں تمہارے حکم پر قتل کر دیا۔ میرا معصوم بھائی مر گیا بھائی پر دیپ اور بہن کو تم نے غلام بنالیا تمہیں اپنے ظلم کا حساب دینا پڑے گا تمہارا یوم حساب آنے والا ہے شدت جذبات سے عثمان کی آواز کانپنے لگی تھی۔

”ہا ہا..... مہاراج ہنسا۔“ پردیپ اور مائنی کو لے آؤ۔ نوجوان تم نے میری سب سے بڑی الجھن دور کر دی میں سوچ رہا تھا کہ تمہاری شکل صورت پردیپ کی طرح کیوں ہے اب معلوم ہوا کہ تمہارا بھائی ہے۔“

”مہاراج کے حکم پر عثمان کو ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکی اور بیس، اکیس سال کے درمیان نوجوان کو لایا گیا عثمان حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا وہ ہو بہو عثمان کی طرح تھا دونوں کی شکل و صورت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ”چل بھئی تیرے بہن بھائی آ گئے اب ان سے آخری دفعہ ملو۔“ پردیپ اور مائنی بھی حیرت اور خوشی کے طے جلے جذبات سے اسے دیکھ رہے تھے۔

ایک طرف سے ایک درزشی جسم کا مالک دراز قد نوجوان آیا اس نے آتے ہی عثمان کے پیٹ میں گھسنے کی زوردار ضرب لگائی عثمان اس ضرب کے لئے تیار نہ تھا تکلیف کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی اس نے اس پر گھونسوں اور لالتوں کی بارش کر دی۔ مائنی چلائی ”بھگوان کے لئے میرے بھیا کو مت مارو۔“

”رک جاؤ رنجیت بننا! یہ نہ ہو کہ یہ سے سے پہلے مر جائے۔ ابھی اسے بہت کچھ دیکھنا ہے۔“ مہاراج نے اسے روکا۔

رنجیت مائنی کی طرف بڑھا اور اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر بولا۔ ”یہ بڑے مزے کی چیز ہے آج تک اسے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ آج تیری نظروں کے سامنے اس کے ساتھ بہت کچھ ہوگا۔“

”بکواس بند کر کتے ہمت ہے تو مجھے کھول کر دیکھ۔“ عثمان چلایا۔

”تیرا یہ ارمان بھی پورا کر دیتے ہیں بالک، کھول دو اس بکری کے بچے کو۔“ مہاراج نے اپنے کارندوں

کو حکم دیا اور بولا۔ ”ہم وچن دیتے ہیں اگر تم نے ہمارے بیٹے رنجیت کو شکست دے دی تو ہم نہ صرف تمہیں آزاد کر دیں گے بلکہ تمہارے بھائی اور بہن کو بھی چھوڑ دیں گے اگر تم ہارے تو تم لوگوں کا برا حشر ہوگا۔“

عثمان کو کھول دیا گیا حویلی کے وسیع عریض صحن میں ایک طرف اکھاڑہ بنایا تھا اس اکھاڑے میں مہاراج کے سپاہیوں کو تربیت دی جاتی تھی اس کے علاوہ ان کی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لئے ان کے درمیان مقابلے بھی کروائے جاتے تھے۔ عثمان اور رنجیت اکھاڑے میں آئے سامنے کھڑے تھے۔ سامنے کی نشستوں پر مہاراج، نارائن اور سپاہیوں کا سپہ سالار گوند بیٹھے تھے اکھاڑے کے اطراف درجنوں کی تعداد میں یہ دلچسپ مقابلہ دیکھنے کے لئے سپاہی بھی موجود تھے۔ اس پوری ریاست میں رنجیت سے بڑا کوئی فائز نہیں تھا، گنجی بختہ ہی رنجیت اسٹائن بنا کر کھڑا ہو گیا۔ ”آ جا میرے لال شیر سے بازوؤں کا زور دیکھیں، اس کے بعد تیری بہن کی باری ہے۔“ رنجیت نے اسے تاؤ دلا دیا۔

عثمان غصے سے کھولتا ہوا جاننا انداز میں آگے بڑھا رنجیت بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا، اس کی فرنٹ لک زوردار انداز سے عثمان کے سینے پر لگی۔ عثمان اڑتا ہوا اکھاڑے کے فرش پر گرا۔ اس نے اٹھ کر دوبارہ رنجیت پر حملہ کرنا چاہا رنجیت نے فضا میں فلا بازی کھا کر فلاٹنگ کلک اس کے سینے پر ماری عثمان لڑنے کے فن سے نا آشنا تھا۔ چنانچہ مارشل آرٹ کے ماہر رنجیت سے بری طرح پٹ رہا تھا کچھ دیر بعد نیچے پڑا ہانپ رہا تھا اس کی بدن کا جواز جوڑ دکھ رہا تھا رنجیت نے اسے بری طرح چٹا تھا۔ رنجیت نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکال کر اس سے کچھ فاصلے پر پھینکا اور بولا تجھے ایک چانس دیتا ہوں خنجر اٹھا سکتا ہے تو اٹھا لے۔

عثمان ڈگمگا رہا ہوا مشکل اٹھا اسی وقت رنجیت کی اچھین لک اس کی کنپٹی سے نکل گئی اس کے ہواں ساتھ چھوڑ گئے۔

اسے ہوش آیا تو حویلی کے صحن میں ایک ستون

سے بندھا ہوا تھا قریب ہی دوسرے ستون سے اس کا ہمشکل بھائی پردیپ رسیوں سے جکڑا ہوا تھا درد کی شدت سے اس کا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اس کے سامنے کرسیوں پر مہاراج، نارائن اور گوند بیٹھے تھے ایک طرف رنجیت اس کی بہن مائنی کا ہاتھ جکڑے کھڑا تھا مائنی اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔

لیکن رنجیت کی گرفت آہنی تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر مکیش نیچے پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی اس کے سر سمیت پورے بدن پر دہی وافر مقدار میں گرایا گیا تھا قریب میں دو گراناٹیل شخص ہاتھوں میں خونخوار دوکتوں کے زنجیریں تھامے کھڑے تھے کتے بار بار مکیش کی طرف لپک رہے تھے دہی کی خوشبو انہیں پاگل کئے ہوئے تھی وہ بار بار مکیش کی طرف جھپٹنے کی کوشش کر رہے تھے آج بغیر مکیش کے تم دو مٹا دیکھو گے یہ سب کچھ دیکھ کر تمہیں احساس ہوگا کہ تمہارے ماما اور پتا کو ہم نے کتنی آسانی سے شیشاں گھاٹ پہنچایا تھا یہ مکیش غدار ہے اسے معلوم بھی تھا کہ ہماری اجازت کے بغیر اس ریاست میں کسی اجنبی کو گھرانا جرم ہے اس کے باوجود اس نے تمہیں بنا دی یہ جانتے ہوئے کہ تم ہمارے دشمن ہو اب یہ ان کتوں کی خوراک بنے گا۔

مہاراج کے اشارے پر کتوں کی زنجیریں کھول دی گئیں کتے بھونکتے ہوئے مکیش پر جھپٹ پڑے فضا مکیش کی جینوں سے گونج اٹھی کتے دہی کی خوشبو سے پاگل ہو چکے تھے اور مکیش کو بھینچ کر کھا رہے تھے۔ چند لمحوں بعد مکیش کی خونچکان لاش پڑی تھی کتوں کو قابو کر کے وہاں سے لے جایا چکا تھا مائنی درندگی سے بھرپور یہ ہولناک منظر دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھی تھی وہ بے تحاشہ چیخ رہی تھی اور دروہی تھی رنجیت روتی بلکتی مائنی پر جھپٹ بڑا۔

”چھوڑ دے بغیر اسے میں تم سب کو زندہ دفن کر دوں گا عثمان غصے سے دھاڑا۔ پردیپ بھی چیخ چلا رہا تھا دونوں بھائی رنجیت اور مہاراج کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے بندھے ہونے کی وجہ سے

بے بس تھے ان کی چیخ و پکار کی پرواہ کئے بغیر شیطانی کھیل شروع کر دیا گیا دونوں بھائیوں نے کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں کچھ دیر بعد مائنی پھٹے ہوئے کپڑوں میں ایک طرف پڑی سبک رہی تھی۔

”لے جاؤ اس لڑکی کو، اور اس بکری کے بچے کو پتھرے میں بند کر دو کہ اس کی قسمت کا فیصلہ کریں گے۔“ مہاراج نے حکم دیا۔

روتی سکتی مائنی کو نیم عریاں حالت میں گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے جایا گیا عثمان کو حویلی کے ایک خالی کمرے میں دھکیل دیا گیا وہ کمرے کے فرش پر بیٹھا کافی دیر تک روتا رہا اس کی بہن کو اس کی نظروں کے سامنے بے آبرو کر دیا گیا تھا اور وہ اسے بچانے کے لئے کچھ بھی نہ کر پایا تھا کافی دیر تک رونے کے بعد وہ اٹھا بے تابلی سے کمرے میں ٹھٹھنے لگیا یہ ایک خالی کمرہ تھا اس کمرے میں نہ ہی کوئی روشن دان تھا اور نہ ہی کوئی کھڑکی کمرے سے نکلنے کا واحد راستہ ایک دروازہ تھا جو باہر سے بند تھا کمرے میں لگا بلک کمرے کو دروازے کے ہوئے تھا۔ عثمان کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے باہر سے کبھی کبھار قدموں کی چاپیں سننے ہونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رات رفتہ رفتہ گزرتی جا رہی تھی ہر مینٹے والا بل اسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ اس کی زندگی کے گھٹنے ٹک ہو رہے ہیں صبح ہوتے ہی وہ درندے نہ جانے اس سے کیا سلوک کرتے۔ اس کے ارد گرد نقل و حرکت کی آوازیں اب معدوم ہوتی جا رہی تھیں حویلی کے مکین سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ارد گرد کی غیر ضروری لائٹس آف کر دی گئیں کچھ دیر بعد حویلی پر مکمل سکوت چھا چکا تھا۔ اس سکوت کو کبھی کبھار رکھوالی کے کتوں کی آوازیں توڑتی تھیں۔

اچانک دروازے پر دھمکی آہٹ سنائی دی۔ اس نے سوچا اس کا زندگی سے ناٹھونے کا وقت آچکا ہے مہاراج کا کوئی ہرکارہ اسے موت کے گھاٹ اتارنے آیا ہے۔ کسی نے آہٹ کی سے تالا کھولا دروازے کا ایک پٹ کھلا اور عثمان اندر آنے والی شخصیت کو دیکھ کر بھونچکا رہ

گیا میں بائیس سالہ ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کا جسم گویا سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ گلابی رنگ کا ریشمی سوٹ اس کی گوری رنگ پرچ رہا تھا وہ دھیمی چال سے چلتی ہوئی آہستگی سے کمرے میں داخل ہوئی۔

عثمان نے بولنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ اس نے اپنے یا توئی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی کے ہاتھوں میں پتل موجد تھا اس نے اشارے سے عثمان کو کمرے سے باہر نکلنے کو کہا۔

”جلدی چلو!“ وہ سرسراہٹ ہوئی سرگوشی میں بولی عثمان اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ دونوں بڑی احتیاط سے چلتے ہوئے ایک برآمدے میں جا پہنچے یہاں کی آئیں آنکھیں عثمان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگی۔

”یہ لڑکی کون ہے اور مجھے کہاں لے جا رہی ہے؟ اگر کسی نے مجھے اس طرح آزادی سے حویلی میں گھومتے دیکھ لیا تو“ یہ سوچتے ہی وہ خوف زدہ ہو گیا۔

ایک کمرے سے کسی کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی لڑکی نے سرگوشی کی۔ ”یہاں مہاراج محو سترامت ہیں احتیاط سے چلنا۔“ وہ دونوں دبے پاؤں دروازے کے سامنے سے گزرے سامنے بیرونی دروازہ تھا۔ اندرونی عمارت سے باہر نکلنے کے لئے انہیں ایک کمرے سے

گزرنا پڑا۔ یہاں جہازی ساز بیڈ پر رنجیت سو رہا تھا ابھی وہ کمرے کے وسط میں تھے کہ رنجیت نے کروٹ بدلی۔ ان کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا وہ خوف سے اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے لیکن خیرت گزری وہ جاگ نہیں وہ احتیاط سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل کر حویلی کے احاطے میں آ گئے ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ تین خونخوار کتے

جارحانہ انداز میں ان کی طرف لپکے وہ خطرناک قسم کے بل ڈاک تھے عثمان خوف سے کانپنے لگا ان ہی کتوں نے اس کے سامنے مکیش کو بری طرح بھینچ ڈکڑا رکھا تھا۔ کتے جیسے ہی قریب آئے لڑکی نے کتوں کو آہستگی سے پکڑا

تو حیرت انگیز طور پر کتے اس کے پاؤں سے اپنا منہ رگڑنے لگے۔ کتے شاید اس سے مانوس تھے۔

اوپر مورچوں میں خاموشی تھی شاید وہاں کے محافظ سردی کی وجہ سے کونے کھدروں میں دیکھے ہوئے تھے وہ سرگوشی میں بولی۔ ”جلدی باہر چلو۔“ عثمان نے اس کی ہدایت پر عمل کیا وہ حویلی سے باہر آئے اور پھر دونوں نے ادھر ادھر دیکھا اور تیزی سے حویلی سے دور جانے لگے کچھ دور جانے کے بعد عثمان نے دیکھا ان سے کچھ فاصلے پر سیاہ رنگ کی بڑے ٹائروں والی جیپ ایک ڈھلوان پر کھڑی تھی۔ لڑکی خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور عثمان کو کہا۔ ”جیپ کو دکھا دو۔“ عثمان نے جیپ کو ہلکا سا دکھایا تو جیپ تیزی سے ڈھلوان سے لڑھکتے لگی۔ عثمان دوڑ کر جیپ میں بیٹھ گیا تھا۔

”میں مہاراج کی بیٹی اور رنجیت کی بہن ہوں۔“ اس کے الفاظ ہم کی طرح عثمان کی سماعت سے نکلے۔

”تم پاگل تو نہیں ایک اجنبی کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دی اپنے بھائی اور باپ پر دوسرے مذہب کے فرد کو قوت دی۔“ عثمان حیرت و استعجاب کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے چٹاکو دوسروں پر ظلم ڈھاتے دیکھا ہے۔ میری ماما جی بھی ان کی ان حرکتوں سے نالاں تھیں۔ مہاراج نے سازش کر کے انہیں قتل کروا دیا۔ قتل انہوں نے اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ لوگ اس قتل کو حادثہ سمجھے، ہمارے ہاں عورت کو بوجھ سمجھا جاتا ہے لڑکیوں کو پیدیا ہوتے ہی قتل کر دیا جاتا ہے مجھ سے پہلے میری تین بہنوں کو مہاراج نے پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا تھا مجھے بھی میری ماں نے بڑی مشکلوں سے بچایا جب وہ امید سے تھیں ان دنوں وہ میکے چلی گئیں میں اپنے نانا کے گھر پیدیا ہوئی زندگی کے ابتدائی دس سال وہیں گزارے میری ماں کو قتل کرنے کے بعد مہاراج مجھے حویلی میں لے آیا میں کہنے کو توراں کماری ہوں۔ لیکن اچھوتوں سے بدتر زندگی گزار رہی ہوں۔“

مہاراج اور رنجیت بحالت مجبوری مجھے برداشت کر رہے ہیں ایک واقعہ کے بعد ان کی مجھ سے نفرت اور بڑھ گئی۔

ہوا اس طرح کہ ہماری ریاست میں ایک مارشل آرٹ کا ماہر آ نکلا۔ اس کا نام کامران تھا بہت ہی اچھا اور مخلص انسان تھا رنجیت نے ان دنوں لڑکپن سے نوجوانی میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔

کامران سر کی مارشل آرٹ میں مہارت کی شہرت سن کر مہاراج نے انہیں رنجیت کو مارشل آرٹ کی تربیت دینے کو کہا۔ وہ مہاراج کے حکم پر رنجیت کو اور ان کے چند خاص پرکاروں کو تربیت دینے لگے جب وہ انہیں مارشل آرٹ کی تربیت دیتے، میں کھڑی یہ سب دیکھتی رہتی وہ مجھ سے شفقت سے پیش آتے تھے چونکہ وہ ہر وقت حویلی میں رہتے تھے اس لئے ان کے تمام معمولات میرے سامنے تھے۔ خاص طور پر جب وہ پانچوں وقت نماز پڑھتے تو میں دلچسپی سے یہ سب دیکھتی میں اکثر ان سے ان کے مذہب کے بارے میں سوالات کرتی جن کے جواب وہ قلی بخش دیتے انہوں نے اسلام کے بارے میں بہت سی باتیں مجھے بتائیں۔

اسلام میں عورت کے حقوق کے بارے میں سن کر میں بہت متاثر ہوئی، ان کی باتیں میرے دل و دماغ پر اثر کرنے لگیں۔ میں نے ضد کی میں بھی مارشل آرٹ سیکھنا چاہتی ہوں انہوں نے مہاراج سے نہ جانے کیسے مجھے مارشل آرٹ سکھانے کی اجازت لے لی، اب میں بھی ان کے زیر تربیت تھی کئی ماہ بعد جب میں مذہب اسلام کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تو میری ضد پر انہوں نے مجھے کلمہ پڑھایا۔ میرا نام راج کماری گیتا تھا جسے تبدیل کر کے انہوں نے میرا اسلامی نام صدف رکھا۔

رنجیت ڈھین تھا دو سال میں ہی مارشل آرٹ میں مہارت حاصل کر لی پھر سب کچھ ختم ہو گیا انہیں کسی طرح میرے مسلمان ہونے کی اطلاع ملی گی سر کامران کی محبت کو رنجیت نے اپنے ہاتھوں سے برباد کیا ایک لڑکی تھی جو سر کامران سے محبت کرتی تھی وہ بے چاری اپنی

بے عزتی برداشت نہ کر پانی اور خود شی کر لی۔ سر کامران کے احتجاج پر ان کی آنکھوں میں آگ میں لوہے کی کی سنجیں گرم کر کے ڈالی گئیں انہیں اندھا کرنے کے بعد مار مار کر ادھ موا کر کے جنگل میں پھینکوا دیا گیا مجھے بھی یہی طرح مارا گیا۔

رات کو آپ کی بہن پر ہونے والے ظلم کو دیکھ کر میرا دل خون کے آنسوؤں کا تھا اس غریب انسان کو بے دردی سے روندنا گیا رات کو آپ کی بہن نے خود شی کر لی شاید وہ اپنی بے عزتی سہہ نہ پانی تھی۔ اس لئے گلے میں پھندا ڈال کر خود شی کر لی۔

”میں مہاراج اور رنجیت کا خون پی جاؤں گا۔ گاڑی واپس موڈو۔“ عثمان غرایا۔

”پاگل مت بنو! ان درندوں سے نکرانا تمہارے بس کی بات نہیں قریبی ہستی میں مہاراج کے سوتیلے بھائی گنیش چاچا رہتے ہیں وہ مہاراج سے بالکل مختلف ہیں مہاراج کے ظلم کی وجہ سے ان کی مہاراج سے نہیں بنتی تھی اس لئے وہ ان سے الگ ہو گئے سیدھے سادے انسان ہیں لالچ ڈرا بھی نہیں۔ ہم ان سے مدد مانگیں گے ہو سکتا ہے وہ کسی طرح مہاراج سے تمہارے مشکل بھائی پر دیپ کو آزاد کرالیں۔“

باتوں باتوں میں ان کا کافی سفر طے ہو چکا تھا ان کی گاڑی حویلی سے کافی دور آ چکی تھی ان کا یہ سفر مزید تین گھنٹے جاری رہا۔ اب وہ جنگل کی حدود میں داخل ہو چکے تھے صدف نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی اس جنگل کے پار چاچا گنیش کا علاقہ ہے جہاں ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔ ”یہ راستہ اگرچہ خطرناک ہے لیکن مہاراج سے محفوظ ہے ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ہم اس خطرناک جنگل میں گھس جائیں گے۔“ صدف بولی۔

صبح کے چھ بج رہے تھے جنگل میں جانور اور چند پرند اپنی اپنی بولیوں میں اپنی موجودگی کا اظہار کر رہے تھے کوئی خطرناک درندہ ان کے سامنے نہیں آتا تھا اس لئے وہ پرسکون تھے اب وہ جنگل میں کافی آگے پہنچ چکے تھے ان کی جیپ کی رفتار کافی کم ہو چکی

تھی ان کا سکون گولی کی آواز سے ٹوٹا۔

”گولی نامعلوم سمت سے آئی تھی جو جیب کے اگلے ٹائر میں لگی تار دھماکے سے پھٹا اور جیب بری طرح لہرائی ان کی قسمت اچھی تھی جو جیب کی رفتار کم تھی اس لئے دونوں زخمی ہونے سے محفوظ رہے ان کے چہروں پر خوف و ہراس تھا۔

”تم یہ پھل لے لو“ صدف نے اپنا پھل اس کی طرف بڑھایا۔ ”مجھے پھل چلانا نہیں آتا وہ شرمندگی سے بولا۔

اچانک ان کی جیب کو تین رائفل بردار افراد نے گھیر لیا ان کے چہروں پر ڈھانٹے بندھے ہوئے تھے۔ ”واہ! آج تو ہمارے دارے نیارے ہو گئے صبح ہی صبح ایک حسین شکار ملا آج تو جنگل میں منگل ہوگا۔“ ان میں سے ایک خباثت سے ہنسا اور صدف سے پھل چھین کر اسے کھیت کر ایک طرف لے جانے لگا عثمان نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی بھایا دور رائفل برداروں نے اس کی مرمت شروع کر دی ادھر صدف کو کھیت کر لے جانے والا اچانک زمین پر گر کر ترپنے لگا۔

ایک تیر سننا ہٹ کی آواز کے ساتھ اس کی گردن میں پیوست ہو گیا تھا خون فورے کی طرح اس کی گردن سے بہہ رہا تھا چند لمحے ترپنے کے بعد وہ ساکت ہو گیا اپنے ساتھی کی چیخ سن کر بھایا دو ٹیرے چوکنے ہو کر دادر اور نظریں دوڑانے لگے مگر تیر انداز انہیں نظر نہ آیا وہ عثمان کو بھول کر اپنے ساتھی کی طرف بڑھے اسی وقت ایک اور تیر سننا تھا ہوا ایک ایک دوسرے ڈھانٹے پوش کے سینے میں دل کے مقام پر پیوست ہو گیا۔

آخری بیج جانے والے نے ایک طرف لگا تار تین فائر کئے۔ ”میں ادھر ہوں۔“ اس کے عقب سے ایک بھاری آواز گونجی وہ پھرتی سے مڑا اور آواز کی سمت فائر کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا آواز دینے والا وہاں سے بھی غائب ہو چکا تھا ڈھانٹے پوش جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو گیا اس نے مختلف سمتوں میں کئی فائر کئے۔

بائیں سمت سے آواز آئی ”پاگل کے بیج کیا

آتش بازی کر رہا ہے۔“ اس نے آواز کی سمت فائر کرنا چاہا مگر کھینک کی آواز سنائی دی اور اس کی رائفل خالی ہو چکی تھی اپنی بے وقوفی سے وہ تمام گولیاں ضائع کر چکا تھا رائفل ایک طرف پھینک کر اپنے مردہ ساتھی کی رائفل کی طرف لپکا کہ اچانک اس کے سامنے ایک درخت کی آڑ سے ایک دراز قد شخص نکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا چہرے کی رنگت گندمی، بیچڑ اور ٹی شرٹ میں ملبوس آنکھوں پر سیاہ رنگ کا چشمہ موجود تھا ہاتھوں میں تیرکان اور ہولسٹر میں پھل دکھائی دے رہا تھا۔

صدف اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی ”سر کامران یہاں کیسے؟“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ایک ماہر فائر ہے اس نے اپنی آنکھوں سے چشمہ ہٹا کے بیٹک میں اس لئے ڈھانٹے پوش اور عثمان حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگے وہ شخص آنکھوں سے محروم تھا یہ دیکھ کر ڈھانٹے پوش کا حوصلہ بڑھ گیا کہ اس کا مد مقابل اندھا ہے وہ جابجا انداز میں اس کی طرف بڑھا ڈھانٹا پوش نے اس کے چہرے پر گھونسا مارا حیرت انگیز طور پر اس نے پھرتی سے جھکا دیکر خود کو کچایا اور پے درپے کئی کس اس کے جسم پر رسید کر دیں ڈھانٹا پوش کا ہر وار وہ انتہائی مہارت سے روک کر اس کی پٹائی کر رہا تھا چند لمحوں بعد ڈھانٹا پوش زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ وہ پر اعتماد انداز میں اس کی طرف لپکا اس کی گردن کو پکڑ کر مخصوص انداز سے جھکا دیا تو کڑا کے کی آواز کے ساتھ ڈھانٹا پوش کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

اب وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا ”تم لوگ کون ہو اور صبح ہی صبح اس جنگل میں کیا کر رہے ہو؟“ سر میں صدف ہوں مہاراج کی بیٹی اور میرے ساتھ عثمان ہے اس کا تعلق پاکستان سے ہے صدف نے عثمان کی پوری روداد سے سنا ڈالی۔

عثمان بولا ”آکھیں نہ ہونے کے باوجود آپ نے تین خطرناک ڈاکوؤں کا مقابلہ جس مہارت سے کیا

وہ ناقابل یقین ہے۔“

”ایسا کرتے ہیں یہاں سے کچھ فاصلے پر میری جھوپڑی ہے وہاں چلتے ہیں باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔“ وہ انہیں لے کر ایک سمت چل دیا۔

اس نے اپنی داستان سنانا شروع کی۔ ”میرا نام کامران ہے، میں بچپن ہی سے مارشل آرٹ میں دلچسپی رکھتا تھا۔ مجھے جنون کی حد تک مارشل آرٹ سے دلچسپی تھی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ کی جہاں جہاں اس فن کا ماہر مجھے ملا ہے اس سے کھینچ بیٹھ گیا۔ میرا مشغلہ صرف سیر و سیاحت اور مارشل آرٹ تک محدود تھا۔ اس فن کو سیکھنے کے لئے میں جاپان تک گیا پانچ سال وہاں گزارے۔ پھر ایک روز یہاں کے جنگلات میں گھومنے آیا اور ایک لڑکی ساوتری کو دل دے بیٹھا وہ بھی مجھ سے متاثر تھی۔ ہم دونوں کے پیار پر اس کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ ہندو میں مسلمان اس کے باوجود ہم دونوں شدت سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ ہمارے درمیان مذہب کی دیوار حائل نہ تھی اسی دوران مہاراج کو میری مارشل آرٹ میں مہارت کی خبر ہو گئی اس نے مجھے آفری کی میں اس کے بیٹے رنجیت اور اس کے خاص کارندوں کو مارشل آرٹ کی تربیت دوں۔ حویلی میں اکھاڑہ بنایا گیا میں رنجیت اور اس کے خاص ہرکاروں کو تربیت دینے لگا۔

لگ بھگ 2 سال میں وہاں جانا رہا۔ رنجیت اپنی دلچسپی اور محنت سے جلد ہی مارشل آرٹ میں ماہر ہو گیا راج کماری جو اس وقت موجود ہے اس کو بھی مارشل آرٹ سکھانے لگا۔ اللہ نے اسے ہدایت دی تھی اسے اسلام سے دلچسپی ہو گئی بالآخر وہ مسلمان ہو گئی میں نے اس کا نام صدف حسین تجویز کیا۔ نہ جانے کیسے مہاراج اور رنجیت کو اس بات کی خبر ہو گئی۔ ان ہی دنوں اس کی گندمی نظریں ساوتری پر پڑیں اس نے میری لاعلمی میں ساوتری کو اغوا کر لیا۔

زبردستی اس کی عزت لوٹ لی وہ اپنی بے حرمتی

سمہ نہ پائی میرے نام خط میں سب کچھ لکھ کر خود کشی کر لی میرے دل میں آتش فشاں پھڑک اٹھا میں طوفان کی طرح حویلی پر چڑھ دوڑا میرے ہاتھوں آٹھ کے قریب ساہی مارے گئے میں اکیلا تھا وہ سینکڑوں مجھے پکڑ کر بے بس کر دیا گیا میری آنکھیں پھوڑ کر مجھے جنگل میں پھنکوا دیا گیا ساوتری کے والدین اس کے غم میں گھل کر مر گئے میں نے جنگل میں جھگی بنالی۔

”عثمان بولا آپ بنا دیکھے اتنی مہارت سے کیسے لڑ لیتے ہیں۔ اور بنا دیکھے ہدف کا درست نشانہ کیسے لیتے ہیں۔؟“

میں آواز کی سمت کا اندازہ لگاتا ہوں۔ میں بلا سنڈ فائٹ کا بھی ماہر ہوں اندھا ہونے سے پہلے اکثر آنکھوں پر پٹی باندھ کر فائٹ کرتا تھا۔ آنکھوں کی روشنی جانے کے بعد اس مہارت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ کامران نے جواب دیا۔

”سر پلیز! خدا کے لئے میری مدد کریں زندگی میں کبھی بھی لڑائی جھگڑے سے میرا واسطہ نہیں پڑا آپ مجھے مارشل آرٹ سکھائیں تاکہ میں اس قابل ہو جاؤں کہ اپنے ماں، باپ، بہن کا بدلہ اس ظالم انسان سے لے سکوں اور یہاں کے مظلوم لوگوں کو ان شیطانوں سے نجات دلاؤں۔ عثمان اسے امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”مسٹر عثمان مارشل آرٹ کو آسان مت سمجھ یہ انتہائی کٹھن آرٹ ہے اسے سیکھنے کے لئے اپنے جسم کو تکلیف سہنے کا عادی بنانا پڑتا ہے اس قدر عادی کہ ہر چوٹ پر مسکراؤ موسم کے جبر کو جھیلو تھر کے تپتے ریگستانوں میں ہماری طرح کے انسان بستے ہیں ان کے جسم گری سہنے کے عادی ہوتے ہیں برفانی علاقے میں برف کے نیچے سخت سردی میں جاندار رہتے ہیں۔ سب سے پہلے درد کو سہنا سیکھو۔ جب تم حد سے بڑھتی تکلیف پر مسکرائے لگو تو سمجھو لینا تم مارشل آرٹ سیکھ سکتے ہو۔ جہاں درد اور اذیت کی حد ختم ہوتی ہیں وہیں سے انسان کی جیت شروع ہوتی ہے۔“

عثمان پوری توجہ اور انہماک سے کامران کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کا کہا ہوا ہر لفظ اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو رہا تھا۔

”سب سے پہلے میں تمہارا ایک امتحان لوں گا۔ تم اس امتحان میں پورے اترتے تو تمہیں مارشل آرٹ کی تربیت دوں گا۔“

”سر میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی توقعات پر پورا اتروں گا۔“ کامران مسکرا کر اپنی جگہ سے اٹھا ایک جگہ شے کی نصف درجن خالی بوتلیں پڑی تھیں۔ کامران نے بوتلیں اٹھائیں اور عمان کو جھوپڑی سے باہر نکلے کو کہا۔ وہ اس کے ہمراہ جھوپڑی سے باہر نکلا صدف بھی حیران پریشان باہر نکل آئی باہر آتے ہی کامران نے ایک ایک کر کے ساری بوتلیں زمین پر توڑ ڈالیں وہ دونوں حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔

”عثمان اپنے پاؤں سے جوتے اتار کر ایک طرف پھینک دو اور ان کاچ کے ٹکڑوں پر آنکھیں بند کر کے چلتے ہوئے میرے پاس آ جاؤ یہ تمہاری برداشت کا امتحان ہے۔“ عثمان سوچ میں پڑ گیا۔

”کیا ہوا گھبرا گئے خیر میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم تکلیف سہہ نہ پاؤں گے۔“ وہ بولا۔

عثمان غصے سے جھنجھلا اٹھا اس نے جوتے اتارے اور آنکھیں بند کر کے قدم آگے بڑھا دیے دائیں پاؤں میں کاچ کا بڑا سگلا پیوست ہوتے ہی اس کے منہ سے سسکاری سی نکلی دردی شدت سے اس کا پورا وجود کپکپا اٹھا۔ اس نے لب لبب جھنجھنے اور دوسرا قدم آگے بڑھایا اس کے منہ سے سسکاری نکلی وہ لڑکھایا بکھشل سنبھلا اور آگے بڑھا۔ بلا آخر کامران کے قریب پہنچ کر گر گیا۔

صدف نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تھیں عثمان کے پاؤں بری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ کامران نے اسے اٹھایا اور جھوپڑی میں لے جا کر چٹائی پر لٹا دیا۔ اس کے بعد ایک طرف پڑی بیٹن سے میڈیکل کٹ نکالی اور عثمان کے پاؤں میں پیوست کاچ کے ٹکڑے نکالنے کے

بعد اس کے زخموں پر مرہم لگانے لگا چند روز میں اس کے پاؤں کے زخم ٹھیک ہو گئے۔

عثمان اور صدف شب و روز جنگل میں کامران کے ساتھ گزارنے لگے کامران نے عثمان پر تختیوں کی انتہا کردی ہر وقت انتہائی سخت قسم کی ایکسرسائز کرواتا سارا سارا دن اسے تیز رفتاری سے دوڑتا رہتا درختوں پر عثمان کو لکھ بیچ مارنے کا حکم دیتا کئی کئی گھنٹے سینڈ بیک پر اسے مصروف رکھتا عثمان کے ہاتھ پاؤں لہو لہان ہو جاتے ٹائنگر نامی سیاہ رنگت کا گھوڑا کامران کا پسندیدہ گھوڑا تھا۔

کامران خود گھوڑے پر سوار ہوتا اور عثمان کو بھاگنے کا حکم دیتا۔ عثمان آگے آگے بھاگتا وہ اس کے پیچھے گھوڑے پر ہوتا۔ جہاں کہیں عثمان کے قدم زراست ہوتے وہ قریب پہنچ کر عثمان کے جسم پر اپنے ہاتھوں میں موجود ہتھ سے وار کرتا۔ دن میں ایک آدھ دفعہ خود بھی اس سے لڑتا عثمان بری طرح اس کے ہاتھوں پٹتا۔ اب عثمان کو کسی بھی قسم کی چوٹ اذیت پہنچانے کے بجائے لطف دیتی تھی۔

وہ جتنا عرصہ وہاں رہے جنگل سے باہر کی دنیا کو یکسر فراموش کر چکے تھے عثمان مارشل آرٹ میں مہارت اختیار کرتا جا رہا تھا خجڑی، نن، چکو، شیشیرنی اسٹک فائٹ رائفل اور پستل سے نشانہ بازی تیر اندازی غرض کہ ہر قسم کی لڑائی کا ماہر ہو چکا تھا۔ ان کی گزربسر چھوٹے موٹے شکار کئے ہوئے جانوروں سے ہو رہی تھی۔

عثمان اور صدف کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے ایک بے نام سی الفت جنم لے چکی تھی وہ نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے حال دل کہہ ڈالتے تھے۔

کامران فائز ہونے کے ساتھ ساتھ پانچ وقت کا نماز بھی پڑھتا تھا اس نے عثمان کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔

ایک روز عثمان نے اس سے جانے کی اجازت

چاہی وہ بولا۔ ”اب تم فولاد میں ڈھل چکے ہو جانا چاہتے ہو تو بے شک جاؤ لیکن میری ایک بات یاد رکھنا جذبات میں بھی نہ آنا غصہ اور جذبات فائز کو کمزور کر دیتے ہیں۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔“ عثمان نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

”نہیں دوست میری زندگی کی شام اب اسی جنگل میں ہوگی۔“ کامران اداس لہجے میں بولا۔

”سر میں آپ کے احسان کا بدلہ ساری زندگی نہیں چکا سکتا۔“

”تم مہاراج اور اس کے ٹولے خاص کر رنجیت کو کیکر کر دار تک پہنچا کر ساوتری کی روح کو سکون پہنچا سکتے ہو۔ جس دن تم نے ایسا کر لیا سمجھو میرا شاگرد ہونے کا حق ادا کر دیا۔“ کامران کے چہرے پر اداسی مسکراہٹ تھی۔

دوسرے روز علی الصبح وہ کامران سے اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے اس بار سر کامران کے پسندیدہ گھوڑے پر سوار عثمان اسے تیز رفتاری سے دوڑا رہا تھا۔ صدف عثمان کی کمر میں بازو حائل کئے اس کے پیچھے بیٹھی تھی اس کے گداز جسم کا لمس عثمان کے سینے میں پچھل چار تھا۔

کئی گھنٹوں بعد وہ جنگل کی حدود سے بخیر و عافیت باہر نکلنے میں کامیاب ہو چکے تھے گھوڑے کی پیٹھ پر کئی گھنٹوں سے بیٹھے رہنے کی وجہ سے وہ تھک چکے تھے دونوں گھوڑے کی پشت سے اتر کر پیدل چلنے لگے ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی وہ بھیگنے لگے پھر عثمان نے اپنی جیکٹ اتار کر صدف کو پہنا دی۔ وہ اسے مشکور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکرا دی۔ اور بولی۔ ”میں تمہیں راستوں پر تمہارے ساتھ ہوں منزل پر پہنچ کر مجھے تمہا تو نہیں چھوڑو گے؟“

عثمان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا صدف کی خوبصورت آنکھوں میں پیار کا سمندر بھرا نظر آیا۔ ”دیکھو صدف میرا راستہ برا دکھن ہے ہزاروں

آزمائشیں ہیں بہت سے امتحان ہیں۔ ان سب سے گزر کر اگر زندہ رہا تو وہ وعدہ کرتا ہوں تمہیں اپنی زندگی کا ہمسفر ضرور بنالوں گا۔

چلتے چلتے وہ اچانک ٹھٹھک کر رک گئے ایک کٹیا سی نظر آ رہی تھی جس کے دروازے پر بھاری بھر کم پردہ لٹک رہا تھا وہ حیرت زدہ سے اس طرف چل پڑے۔ ”چلو دیکھتے ہیں اس ویرانے میں کون رہتا ہے؟“ عثمان بولا اور دروازے سے پردہ ہٹا کر صدف کے ہمراہ اندر داخل ہو گیا۔

اندرا ایک طرف نورانی چہرے والے بزرگ بیٹھے آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے تھے ان کے سامنے ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی سر جھکائے بیٹھی تھی وہ دونوں ان سے کچھ فاصلے پر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ”تم لوگ کھڑے کیوں ہو اگر اندر آ ہی گئے تو ہو تو بیٹھ جاؤ۔“ بابا آنکھیں بند کئے ہوئے بولے دونوں لڑکی سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔

”بیٹا گھبراؤ مت اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں بابائے آنکھیں کھول دیں۔ اور مسکرائی نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔ بابا جی اجازت ہو تو میں جاؤں۔ لڑکی نقرائی آواز میں بولی اس کی خوبصورت آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی بابائے اثبات میں گردن ملا دی۔ اگلا ہی لمحہ انہیں حیرت اور خوف میں مبتلا کر گیا لڑکی بیٹھے بیٹھے اچانک غائب ہو چکی تھی۔

”یہ..... کک..... کون تھی؟“ صدف نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”بیٹا یہ ایک نیک روح تھی۔“

”بابا آپ ہماری کامیابی کے لئے دعا کریں۔ ہم پر بہت مشکل دور گزرے ہیں آنے والا وقت بھی کڑی آزمائش کا ہے۔“ عثمان نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ”تم اس وقت شمال کی طرف محسوس ہو، اپنا رخ تبدیل کر کے مشرق کی طرف چل پڑو اللہ بہتر کرے گا۔“ بابائے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیے وہ کچھ دیر وہیں

بیٹھے رہے بارش تھم چکی تھی اس لئے بابا سے اجازت لے کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

شمال کی طرف مہاراج کی حویلی تھی بابا نے نہ جانے کس وجہ سے وہاں جانے سے منع کیا تھا وہ اس وقت گھوڑے پر سوار مشرق کی سمت جا رہے تھے۔ ”اس سمت تو میرے اٹکل کا گھر ہے۔“ صدف بولی۔

وہ شام ڈھلے اس سرسبز علاقے میں پہنچے چاروں طرف کچے مکانات تھے صدف کا چاچا گنیش ایک بہت بڑی وسیع حویلی میں رہتا تھا مختصر فیملی تھی ایک اٹھارہ سالہ بیٹی دیویا اور پچیس سالہ بیٹا جگولیش اور چینی جیا بہت ہی مہربان عورت تھی انہوں نے خندہ پیشانی سے ان دونوں کا استقبال کیا ان کی روداد گنیش چاچا آبدیدہ ہو گئے۔

”مہاراج کی ان ہی حرکتوں سے نالاں ہو کر میں نے اس کا ساتھ چھوڑا ہے۔ مہاراج کے سپاہی تین چار بار تم لوگوں کی تلاش میں یہاں آئے ہیں شاید اسے یقین ہے تم یہیں کا رخ کرو گے پھر لوگ گھبراؤ مت جب تک میں یہاں ہوں آخری سانس تک تم لوگوں کی حفاظت کروں گا میرے جیسے جی تمہارا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ کھانے کے بعد انہوں نے کافی دیر تک کپ شپ لگائی پھر سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا۔

عثمان کو ایک الگ کمرہ دیا گیا وہ جاتے ہی بستر پر ڈھیر ہو گیا انہیں وہاں رہتے ہوئے ہفتہ سے زائد وقت بیت چکا تھا اس دوران صدف اور عثمان نے کافی کوشش کہ گنیش چاچا کسی طرح مہاراج کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائیں مگر مہاراج کے خلاف کسی قسم کا قدم اٹھانے سے ہچکچاہے تھے۔

ایک روز رات کے وقت عثمان نے صدف کے نام خط لکھا۔ ”بیاری صدف مہاراج کے مظالم جب میری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں میرا خون کھول اٹھتا ہے میں سر پر کفن باندھ کر مہاراج کی طرف جا رہا ہوں تم میرے حق میں دعا کرنا اور ہمیں اپنے چاچا کے پاس رہنا اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تو لوٹ کر ضرور آؤں گا۔ اس نے خط لکھ کر اپنے کمرے میں

رکھی میز پر رکھا اور خاموشی سے رات کے اندھیرے میں کمرے سے باہر نکلا اس نے اصطبل میں جا کر اپنا گھوڑا کھولا اور اس کی لگام تھام کر چلتا ہوا گیٹ تک جا پہنچا۔ گیٹ پر موجود پہرے دار اسے گھوڑے سمیت آدھی رات کو گیٹ پر دیکھ کر چونک پڑے۔ ”خیریت تو ہے رات کے سے کہاں جا رہے ہیں؟“ ایک پہریدار نے پوچھا۔

”گیٹ کھولو مجھے ایمر جنسی جانا ہے۔ گنیش جی کو بتا کر آ رہا ہوں۔“

”لیکن رات کے اس سے؟“ پہریدار نے کہا نا چاہا۔

”دراصل رات کے وقت مجبوری میں جانا پڑ رہا ہے۔“

عثمان نے کہا پہریدار الجھن میں مبتلا تھے عثمان کے اصرار پر گیٹ کھول دیا گیا وہ گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے نکل گیا۔ صبح کے وقت اس کا گھوڑا جنگل کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ اسے مہاراج تک پہنچنے کے لئے اس جنگل کو پار کرنا تھا اس کا گھوڑا جنگل میں سر پٹ دوڑ رہا تھا کہ اچانک فائر کی ہولناک آواز سے جنگل کی فضا گونج اٹھی اس نے گھوڑے کی رفتار آہستہ کر دی وہ چونکا ہو چکا تھا اسی وقت بے درپے کئی فائر ہوئے فائرنگ قریب ہی کہیں ہو رہی تھی گھوڑے کو روک کر نیچے اترا گھوڑے کو قریبی درخت سے باندھ کر وہ پیدل ہی اس سمت چل پڑا جہاں سے گولیوں کی آواز آرہی تھی اس وقت دوبارہ بے درپے فائر ہوئے اور ساتھ ہی ایک کرب میں ڈوبی انسانی چیخ سنائی دی اسے براستہ مانوس لگ رہا تھا وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ گیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر اس کے محسن سرکامران کی جھونپڑی تھی جس کے سامنے تین افراد کی خون میں لت پت لاشیں پڑی تھیں اسی وقت جھونپڑی کے سامنے ایک درخت کی آڑ سے فائر ہوا وہ کرانگ کرتا ہوا اس طرف بڑھا اسی وقت درخت کے

پہنچے چھپا شخص چلا یا۔

”اندھے ہم ہم جانتے ہیں تمہیں گولی لگ چکی ہے اور تم شدید زخمی ہو تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تمہارا ڈال کر ہمارے سامنے آ جاؤ ورنہ اس جنگل کو تمہارے لئے شمشان گھاٹ بنادیں گے۔“ اس دھمکی کے جواب میں ایک دوسرے درخت کی آڑ سے دھمکی دینے والے پر پٹل سے فائر کیا گیا گولی دھمکی دینے والے کے سر میں لگی وہ چیخا ہوا زمین پر گر پڑا۔

اسی وقت مختلف سمتوں سے درخت کی آڑ میں چھپے کامران پر فائرنگ کی گئی عثمان کرانگ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے رکنا پڑا ایک لاش اس کے راستے میں پڑی تھی راقط اب تک اس لاش کے ہاتھوں میں موجود تھی گویا وہ مرنے کے بعد بھی مزاحمت کا ارادہ رکھتا تھا عثمان نے راقط اس کے ہاتھوں سے نکالی اور دوبارہ کرانگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ جہاں اس کے اندازے کے مطابق کامران زخمی حالت میں موجود تھا۔

اچانک عثمان پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی شاید اسے دیکھ لیا گیا تھا لیکن تب تک وہ لکڑیوں کے ایک بڑے ڈھیر کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ اس پر فائر کرنے والا ایک درخت کی آڑ میں چھپا ہوا تھا عثمان نے ذرا سا سر باہر نکال کر اس درخت کی طرف دیکھا جس کی آڑ میں اس کے اندازے کے مطابق کامران چھپا ہوا تھا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیا جس کا واضح مطلب تھا کہ وہ کہیں چھپا ہوا ٹارگٹ فائرنگ سے محفوظ تھا عثمان نے اپنی کن سیدھی کی لاک پن بٹائی اور کرانگ کرتا ہوا لکڑیوں کے ڈھیر کی انہیں سمت پہنچا۔ اس نے درخت کی سمت نال کا رخ کیا اور دشمن کو کھوجے لگا۔

آج اس کی صلاحیتوں کا امتحان تھا اس کا استاد اور محسن شدید زخمی تھا جسے اس نے بچانا تھا اس نے لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھایا لینے لینے ایک طرف پھینکا کھڑکا ہوا۔ دشمن نے فوراً اس سمت فائر کیا جہاں لکڑی گری تھی۔ فائر کرنے والے کے سامنے آتے ہی اس نے چند سیکنڈ کی بھی دیر نہ کی نشانہ لیا اور گولی داغ دی۔ فضا میں ایک

دلدوز چیخ سے لرز اٹھی حملہ آور زمین پر گر کر ساکت ہو گیا مختلف سمتوں سے عثمان پر فائرنگ ہونے لگی چاروں طرف بارود کی بو پھیل چکی تھی وہ چند لمحوں اپنی جگہ پر دیکار پھر ایک درخت کی آڑ میں جا پہنچا اب فائرنگ رک چکی تھی شاید دشمن کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی گولیاں ضائع کر رہا ہے کامران کی طرف سے بھی کوئی فائر نہیں ہو رہا تھا شاید وہ بے ہوش تھا یا اپنی زندگی کی بازی ہار چکا تھا وہ مضطرب ہو گیا زیادہ انتظار فضول تھا وہ ملی کی طرح سبک رفتاری سے درخت پر چڑھ کر کھنچے پتوں میں روپوش ہو گیا۔ اب تک اس پر کسی بھی طرف سے فائر نہ ہوا تھا۔ اسے حوصلہ ہوا کہ دشمن درخت پر اس کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ وہ بلندی سے چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔

اچانک اسے ایک درخت کی آڑ سے ایک سرابھرتا دکھائی دیا اس نے کن سیدھی کی اور فائر کر دیا گولی درخت کی آڑ سے ابھرنے والے سر میں پیوست ہو گئی وہ چیخا ہوا زمین بوس ہو گیا اس کے کسی ساتھی نے درخت پر پے درپے کئی فائر کئے خوش قسمتی سے عثمان محفوظ تھا، گولیاں اس کے ارد گرد سے گزر رہی تھیں اب عثمان پر ایک ہی گن سے فائر ہو رہے تھے اس نے اندازہ لگایا کہ ان کے تقریباً سارے دشمن جہنم رسید ہو چکے ہیں۔ صرف ایک ہی باقی ہے وہ کچھ دیر درخت پر دیکار رہا۔ وہ محتاط انداز سے اترا اور کرانگ کرتا ہوا ایک دوسرے درخت کی آڑ میں چلا گیا۔

اچانک ایک طرف سے پٹل سے دائیں سمت والے درخت کی آڑ میں موجود شخص پر فائر کیا گیا جواب میں وہاں چھپے شخص نے باہر نکل کر بے درپے فائر کئے یہی اس کی حماقت تھی عثمان نے اس کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر دو فائر کئے دونوں گولیاں اس کی ٹانگوں پر لگیں وہ چیخا ہوا گر اور بری طرح تر پے لگا عثمان پھرتی سے اس کی طرف بھاگا وہ خاصا قوی ہیکل اور خوفناک شکل کا مالک تھا بڑی بڑی سیاہ موٹھیں اس کے چہرے کو مزید خوف ناک بنا رہی تھیں۔ اس کی گن ایک طرف پڑی تھی

اور وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔

عثمان نے اپنی گن اس پر تان لی تو وہ شخص بولا۔

”مہم، میں..... مہاراج کا سپاہی اے ہوں۔“ اس نے جواب دیا خوف اے کے چہرے سے عیاں تھا۔

اسی اثناء میں ایک درخت کی آڑ سے شدید زخمی

کامران گرنا پڑا باہر نکلا وہ بری طرح گھائل تھا اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا کپڑے خون میں تر ہو چکے تھے

”تم لوگوں نے کامران سر کو کیوں زخمی کیا؟“ عثمان نے یہ درپہ اس کی پللیوں پہ ٹھوکریں ماریں اس کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔ ”بھگوان کے لئے مجھے مت مارو

مہاراج نے ہمیں تمہیں دھونڈنے کا حکم دیا تھا ہم جنگل سے گزر رہے تھے کہ راجا جھاری کی جیب پر نظر پڑی کچھ

فاصلے پر جھونپڑی موجود تھی کامران سے تم لوگوں کا پوچھا تو اس نے بتانے سے انکار کر دیا اور ہم سے بھر گیا اور اس

جھڑپ میں کامران کے ہاتھوں ہمارے تین ساتھی مارے گئے۔“ وہ تھوک نکل کر بولا۔

”تم کتنے افراد تھے؟“

”مجھ سمیت ہم آٹھ ساتھی تھے سوائے میرے سب کے سب مارے گئے۔ بھگوان کے لئے مجھے

چھوڑ دو، اس نے عثمان کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔“

کامران عثمان کے کاندھے پر ہاتھ رکھے

بہشکل کھڑا تھا۔ ”میرا بھائی کیسا ہے اور کہاں ہے؟“ عثمان نے پوچھا۔

”مہاراج کی قید میں آج سے چار دن بعد ایک

مقابلہ ہے، اس مقابلے والے دن اسے پھانسی دے دی جائے گی۔“ وہ بولا۔

”مقابلے کے روز کیا مطلب ہے؟“ عثمان نے پوچھا۔

ہرسال حویلی کے باہر فروری کو زور آزمائی کا مقابلہ ہوتا ہے اس کے مقابلے کا فاتح ہمیشہ سے مہاراج کا بیٹا ہوتا ہے، کوئی مشکل سے ہی اس کے مقابلے میں آتا ہے جو آتا ہے مارا جاتا ہے اس مقابلے کا دستور ہے کہ لڑائی ایک حریف کے مرنے تک جاری رہتی ہے فاتح

فائز کو مہاراج مہنگا انعام دیتا ہے۔“ اے نے جواب دیا اس کی آواز خوف سے ڈوبنے لگی۔

اسی لمحے کامران لڑکھڑا کر گڑبڑا عثمان نے ٹریگر

دبا دیا گولی اے کی پیشانی میں لگی اس نے نفرت سے اس کی لاش کو ٹھوکر ماری اور کامران کے سر کو گود میں لے

لیا۔ ”کیا ہوا سر؟“

”کک..... کچھ نہیں، میرا..... وقت..... پورا ہو چکا ہے وہ دور آسمانوں میں میرا انتظار کر رہی ہے

مجھے یہی دفنا دینا۔“ اس نے پچھلی لی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

کافی دیر تک وہ کامران کے بے جان وجود سے لپٹ کر روتا رہا کچھ دیر بعد جھونپڑی سے کدال اٹھائی

اور اس کے لئے قبر تیار کرنے لگا کامران کو دفن کرنے کے بعد فاتح پڑھی اور بوجھل دل کے ساتھ گھوڑے پر

بیٹھ کر روانہ ہو گیا راجا عشق کا مسافر اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔

عثمان کا گھوڑا جنگل میں سر پٹ دوڑ رہا تھا رات کے تقریباً گیارہ بجے وہ مہاراج کی ریاست کی حدود میں

داخل ہو گیا تھا اس نے گھوڑے کو آزاد کر دیا راتفل ہاتھوں میں تھا مہاراج کی حویلی کی طرف بڑھنے لگا

حویلی سے کچھ فاصلے پر جا کے رک گیا وہ نظریں گھا کر چاروں طرف جائزہ لے رہا تھا۔ حویلی کے سامنے

والی سمت چار سپاہی پہرہ ادا رہے تھے وہ دودھ کی ٹولیوں میں گشت کر رہے تھے وہ شیش و بچ میں پڑ گیا یہاں سے

حویلی کے اندر جانا نامکن تھا، وہ کراننگ کرتا ہوا وسیع و عریض حویلی کے بائے سمت گیا وہاں بھی یہی پوزیشن

تھی وہاں سے گھوم کر حویلی کی پشت پر گیا وہاں جھاڑیاں کثرت سے موجود تھیں حویلی کی پشت پر ایک چھوٹا سا کمرہ

بنا ہوا تھا جس کی لائٹ آف تھی اس نے سوچا شاید یہاں کے گارڈ شدید سردی میں کمرے میں دیک کے بیٹھے ہیں

وہ دیوار کا معائنہ کرنے لگا۔

دیوار کافی اونچی تھی اس پر چڑھنا بہت مشکل تھا۔ اگر کسی طرح اوپر چڑھ بھی جاتا تو دیوار کے چاروں کونوں پر چار حفاظتی چوکیاں قائم تھیں جن میں ہر وقت سب سپاہی

موجود تھے۔ اچانک اس کی نظر دیوار کے قریب موجود ایک لمبے چوڑے درخت پر پڑی وہ درخت کی طرف

بڑھنے لگا اسی وقت چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک سپاہی باہر نکلا۔ ”کون ہے ادھر؟“

عثمان پر نظر پڑتے ہی اس نے لٹاکر پوچھا۔

عثمان نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ سپاہی نے فاتح کیا اس کا نشانہ خطا گیا مگر گولی کی آواز سے بھٹکر ڈنچ

گئی چاروں طرف سے ”پکڑو جانے نہ پائے“ کی آوازیں آنے لگیں۔

عثمان تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر اپنے پیچھے آنے والے سپاہیوں

پر چند فاتح کئے اور دوبارہ زیک زیک انداز میں بھاگنے لگا اس پر پچھا کرنے والے سپاہیوں نے جوابی فاتح کئے

خوش قسمتی سے گولیاں اس کے قریب سے گزرنے لگیں گارڈز موت کے ہر کاروں کی طرح اس کے پیچھے تھے۔

اس کے بھاگنے کی رفتار بہت تیزی سے بھاگتے بھاگتے ایک گلی میں داخل ہوا۔ دونوں اطراف میں مکانات بنے

ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے بھاگنے والے گارڈز نے فاتح کئے اس بار بھی ان کا نشانہ خطا ہو گیا اس نے

مڑ کر فاتح کرنا چاہا مگر کھٹک کی آواز سنائی دی گولیاں ختم ہو چکی تھیں بھاگتے بھاگتے داخل ایک طرف پھینک

کر تیزی سے گلی کے اختتام پر دوسری گلی میں داخل ہو گیا بھاگتے بھاگتے اس نے مڑ کر دیکھا سپاہی ابھی تک پچھلی

گلی میں تھے۔ ان میں سے کوئی بھی دکھائی نہ دے رہا تھا لیکن کسی بھی لمحہ اس گلی میں پہنچ سکتے تھے۔ وہ لمبی کی طرح

پھرتی سے ایک مکان کی دیوار پر چڑھا اور اندر کود گیا۔

گھر کے صحن میں ایک نوجوان خوبصورت لڑکی آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہی تھی لڑکی نے

چیننے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے چھلانگ لگائی اور اسے دیو بج لیا اس نے اپنی پنڈی سے ہاندا خنجر نکالا

اور لڑکی کی شہرہ رگ پر رکھ دیا۔ ”خبردار! شور مچاؤ گی تو اس سے پہلے تمہاری خوبصورت گردن پر خنجر پھیر دوں گا۔“

”دیکھو پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ابھی زندہ

رہنا چاہتی ہوں اس لئے شونہیں مچاؤں گی مگر تم کون ہو اور اس طرح میرے گھر میں گھس کر مجھے کیوں

دھمکا رہے ہو؟“

”مہاراج کے کتے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں میں ان کے ہاتھ نہیں آتا چاہتا۔“ عثمان فرمایا۔

”پھر تو وہ ضرور ہر گلی ہر گھر کی تلاشی لیں گے یہاں بھی آئیں گے یہ خنجر ہٹا کر مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں

بچانے کی کوشش کرتی ہوں۔“

”میں تم پر کیسے بھروسہ کر سکتا ہوں؟“

”دیکھو مجھے مار کر تمہیں کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوگا، بالآخر پکڑے جاؤ گے اسی لئے تمہاری بہتری اسی

میں ہے کہ مجھ پر بھروسہ کرو۔“

عثمان نے لمحہ بھر کے لئے سوچا لڑکی کی بات اسے مقبول لگی۔ اس نے اسے چھوڑ دیا اور خنجر دوبارہ

پنڈی سے ہاندا دیا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر زور دار قسم کی دستک ہوئی۔

لڑکی نے ہاتھ روم کا دروازہ ذرا سا کھولا اور پوچھا۔ ”کون ہے؟“ باہر سے آواز آئی۔ ہم مہاراج

کے آدمی ہیں مہاراج کا ایک دشمن ادھر آیا ہے وہ اس گلی کے کسی گھر میں گھس گیا ہے ہمیں تمہارے گھر کی تلاشی

لینی ہے۔“

لڑکی نے اپنے گیلیہ بدن پر جلدی سے کپڑے پہنے اور دروازہ کھول دیا دروازے پر تین سپاہی ہاتھوں میں

رافٹیں تھامے کھڑے تھے۔ سپاہیوں نے دیکھا لڑکی کے گیلیہ بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی

تھیں۔ ”یہاں کوئی نہیں آیا تم چاہو تو تلاشی لے سکتے ہو۔“

سپاہی اندر آئے کمرہ چھت کی تلاشی لی ہاتھ روم کا دروازہ ہلکا سا کھول کر دیکھا وہاں بھی کوئی نہ تھا وہ

ملاؤں ہو کر باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی لڑکی نے آواز لگائی ”وہ چلے گئے ہیں باہر آ جاؤ۔“

عثمان پانی کی ٹینکی سے باہر آ گیا اس کے کپڑے پانی میں شربور ہو چکے تھے۔ ”مجھ نہیں آتا کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں ہندو ہونے کے باوجود تم نے ایک

مسلمان کی زندگی بھائی ہے۔

وہ بولی۔ ”تم مسلمان ہو کر بھی ان بھائیوں سے بہتر ہو۔ تم نے اب تک مجھے میلی نظر سے نہیں دیکھا جبکہ مہاراج جو کہ میرا ہم مذہب بھی ہے اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا میرے ماتا پتا اور بھائی کو احتجاج کرنے پر قتل کروادیا۔ اسی شیطان کی وجہ سے میں تنہا رہتی ہوں اور گناہ آلود زندگی بسر کر رہی ہوں۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس وقت وہ ایک کمرے میں موجود تھے عثمان لباس تبدیل کر چکا تھا۔ ان کے درمیان کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ عثمان نے اپنی رواداد سے سنائی لڑکی کا نام پوچھا۔ کہنے لگی۔ ”لگتا ہے مہاراج کا اتم سداکار ہونے والا ہے اس ریاست میں آج ایک دوسرے باغی نے جنم لیا ہے۔“

”دوسرے باغی سے کیا مراد ہے؟“ عثمان چونک پڑا۔

”ارجن پانڈے مہاراج کا سب سے بڑا دشمن ہے اس کا تعلق اچھوت برادری سے تھا۔ مہاراج نے شادی کے پہلے روز اس کی پتی کو اغوا کروادیا۔ پانڈے کے گھرانے کے احتجاج پر سب کو زندہ جلا ڈالا۔ پانڈے نے ظالم مہاراج کے ظلم کا شکار دوسرے افراد کے ساتھ مل کر باغیوں کا ایک گروپ بنالیا جو مہاراج کے خلاف ہے مگر وہ آج تک مہاراج کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔“ پوچھنے سے اسے پانڈے کے بارے میں بتایا۔

”سنو! میں آج یہیں رہوں گا تم مجھے کل کے میلے میں ہونے والی فائننگ کے بارے میں بتاؤ۔“ عثمان نے پوچھا۔

”یہ مقابلہ گزشتہ کئی سالوں سے حویلی کے باہر ایک میدان میں ہوتا ہے شروع میں چھوٹے موٹے کشتی کے مقابلے ہوتے ہیں آخری میں بڑا مقابلہ بہت ہی خطرناک ہوتا ہے اس مقابلے کا اختتام ایک حریف کی موت پر ہوتا ہے فاتح فائزر کو مہاراج منہ مانگا انعام دیتے

ہیں فاتح فائزر اگلے سال رنگ میں آ کر سب کو لاکڑا رہے گزشتہ کئی سالوں سے اس مقابلے کا فاتح رنجیت ہے ڈر کے مارے تین سالوں سے اس کے مقابلے میں کوئی نہیں آتا اور وہ بنا مقابلے کے جیت جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے آج رات میں یہیں رکنا ہوں کل صبح مقابلہ شروع ہونے سے پہلے چلا جاؤں گا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔“ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے تم ایک شریف انسان ہو۔“ وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اس کے بعد وہ سونے چلی گئی۔

صبح سویرے اٹھ کر عثمان نے نماز پڑھی ایک بڑی سی چادر اپنے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹی اس نے چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ اس کا چہرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا کچھ دیر بعد وہ اس کے گھر سے نکل رہا تھا گلی کوچوں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی لوگوں کا ایک جھوم تھا جو حویلی کے سامنے میدان کی طرف جارہا تھا۔ عثمان اس جھوم میں شامل ہو گیا اب اسے کوئی بھی آسانی سے شناخت نہیں کر سکتا تھا ہر گلی ہر محلے سے لوگ نکل کر میدان میں جمع ہو رہے تھے حویلی کے سامنے وسیع عریض میدان میں سینکڑوں لوگ جمع تھے میدان کے وسط میں اکھاڑہ سا بنا ہوا تھا اگلی نشستوں پر نارائن مہاراج اور سپاہ سالار گوندیشے تھے۔ میدان میں سیکڑوں کی تعداد میں مہاراج کے پاسی راٹھلیں اٹھائے چونکا کھڑے تھے۔ عام تماشاخی ہزاروں کی تعداد میں میدان میں موجود تھے۔

وقت مقرر پر میلہ شروع ہو گیا سب سے پہلے اسٹیج پر درجنوں کے قریب نیم عریاں لباس میں ملیوں خوبصورت لڑکیاں نمودار ہوئیں جنہوں نے ہجیاں خیر رقص پیش کیا۔ ان کا رقص اس قدر جذبات کو بڑھکا رہا تھا کہ دیکھنے والے بچے بھگدھر، اور بوڑھے خود کو جوان سمجھنے لگے تھے اور جوان بے قابو ہوتے جارہے تھے انہوں نے میدان میں ہی دھمال قسم کا رقص شروع کر دیا تھا۔ میدان طرح طرح کی آوازوں اور سیٹیوں سے گونج رہا تھا۔ مہاراج کے ظلم و ستم کے شکار لوگوں کے لئے آج کا دن

غیبت تھا۔ وہ میلے سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ رقص تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا اس کے بعد جو کڑوں نے اپنے تماشوں سے لوگوں کو خوب ہنسیا مہاراج بھی ریاست کا عجیب سربراہ تھا سال کے تین سو پتیسھ دن عوام کو لانے کے بعد آج ایک دن ہنسا رہا تھا اس کے بعد نشانہ بازی کا مقابلہ شروع ہوا جو کافی دیر جاری رہا۔ اس مقابلے میں ماہر نشانہ بازوں نے حصہ لیا پھر دوسرے کھیل تماشے ہوئے۔

دوپہر بارہ بجے کے قریب لڑائی کے مقابلے شروع ہوئے۔ پہلا مقابلہ ہاتھی کی طرح دو موٹے پہلوانوں کے درمیان تھا جو بدست ہاتھیوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ اس مقابلے کا اختتام ایک فریق کی شکست پر ہوا۔ دوسرا مقابلہ ایک پہلوان نما شخص ام چھریے بدن کے ایک شخص کے درمیان ہوا۔ وہ ایک بے جوڑ مقابلہ تھا گویا ہاتھی اور چیونٹی کی لڑائی تھی ایک موقع پر موٹے نے داؤ لگا کر دوسرے کو بے بس کر دیا لیکن چھریے بدن والے نے بڑی ہی مہارت سے اپنے آپ کو آڑ کر والیا۔ بالآخر جیت اس کی ہوئی۔

چند مقابلوں کے بعد اصل مقابلے کا اعلان ہوا جو اس میلے کی جان تھا۔ لوگوں کے دلوں کی دھڑکن تھمنے لگی۔ میدان میں عجیب سا سکوت چھا گیا تھا۔ رنگ میں رنجیت پوری شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہوا۔ ایک ریفری نما شخص نے اس کی شان میں قصیدہ گوئی کی۔ جس کا لہجہ یہ تھا کہ ”رنجیت گزشتہ کئی سالوں سے ان مقابلوں کا فاتح ہے۔ اس کے چیلنج کے جواب میں جو بھی فائزر آئے گا جیتنے کے بعد مہاراج سے منہ مانگے انعام کا حقدار ہوگا۔ یہ مقابلہ ایک فریق کی موت پر اختتام پذیر ہوگا پچھلے دو مقابلوں کی طرح اگر اس کے مقابلے پر آنے کی کسی نے ہمت نہ کی تو رنجیت بنا لڑے اس مقابلے کا فاتح ہوگا۔“

رنجیت نے بنا مقابلے جیتنے کی ہیبت ٹرک بنانے کا پروگرام بنا رکھا تھا اس نے رنگ میں آ کر مختلف قسم کے نعرے لگائے۔ اور میدان میں موجود لوگوں

کو لاکڑا کرنے لگا۔ ”کسی میں ہمت ہے تو میرے سامنے۔“ میدان میں صرف رنجیت کی لاکڑاں گونج رہی تھیں۔ لگتا تھا لوگوں کو سانپ سگھ گیا ہے سب خاموشی سے اسے رنگ میں اچھلتے کودتے دیکھ رہے تھے وقت دیر سے دیر سے آگے کی طرف سرک رہا تھا ریفری کی آواز گونجی۔ ”اگلے چند منٹ تک اگر رنجیت کے مقابلے پر کوئی نہ آیا تو رنجیت اس سال بھی بنا لڑے جیتھیں ہوگا۔“ کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ اعلان کیا۔ ”میں دس تک گنوں گا اگر پھر بھی کوئی نہ آیا تو رنجیت فاتح ہوگا۔“ ایک دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات۔“ پرتھک کر وہ رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

اچانک تماشاخیوں کے جھوم سے بڑی سی چادر جسم پر لپیٹی ایک شخص نمودار ہوا اس نے چہرے پر بھی چادر لپیٹی ہوئی تھی اس لئے وہ پہچان میں نہیں آ رہا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں ظاہر تھیں ”رک جاؤ ریفری! اس کا چیلنج میں قبول کرتا ہوں۔ میں اس سے مقابلہ کروں گا۔“

”سکوت زدہ ماحول میں اس کی گونجنے والی آواز نے ہلچل مچا دی۔ وہ چلتا ہوا پہلی نشستوں پر موجود مہاراج کے قریب چند لمحوں کے لئے رک پھر رنگ پر چڑھ گیا۔ رنجیت کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے چادر پوش رنجیت کے دم مقابل کھڑا تھا۔ ”اپنے چہرے سے چادر تو ہٹاؤ تاکہ پتہ چلے خودکشی کے لئے میرے سامنے آئے والا کون ہے؟“ رنجیت نے تہقہہ لگایا۔

”صبر کرو جلدی کیا ہے تم اپنی موت کو دیکھ لو گے۔“ بھرائی ہوئی آواز میں جواب ملا۔

ریفری مقابلے کی شرائط دہرانے لگا شرائط دہرانے کے بعد اس نے ایک کاغذ پر دونوں فائزوں کے دستخط لئے اور درمیان سے ہٹ گیا۔

عثمان نے چادر اتار کر پھینک دی رنجیت کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا مہاراج نارائن گوند اپنی اپنی کریسیوں سے کھڑے ہو گئے۔ ”اس کی ہمت کیسے ہوئے یہاں آنے کی، پکڑ لو اسے، اس نے حویلی سے فرار ہوتے

ہوئے راجکمار کی کوٹھیاں کیا ہے۔“ مہاراج چنچا۔
”چندر گارڈز رانفلیمس تھا میں رنگ میں بیچ گئے
اور عثمان کو رانفلیمس کی زد میں لے کر مہاراج کے سامنے
جانچنے۔“ مرنے سے پہلے تو یہ بتا کہ تو نے راجکمار
کو کہاں چھپا رکھا ہے؟“ مہاراج سانپ کی طرح
پھنکارا۔

عثمان بولا۔ ”مہاراج شاید بیٹے کی موت
اور متوقع شکست کے صدمے نے تمہارے ہواس
چھین لئے ہیں تمہارے بیٹے نے اس میدان میں
موجود تمام افراد کو لگا کر اتھان افراد میں، میں بھی
شامل تھا تمہارے بیٹے کے چیلنج کو قبول کر کے جان
تھیلی پر رکھ کر اس رنگ میں آیا ہوں اگر تم نے یہ
مقابلہ نہ ہونے دیا تو لوگ سمجھ گئے کہ تم باپ بیٹا مجھ
سے ڈر گئے۔“ عثمان مسکرایا۔

”تجھے اگر رنجیت کے ہاتھوں مرنے کا اتنا ہی
شوق ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میری ایک شرط
ہے رنگ میں جانے سے پہلے تو راجکمار کا پتہ بتائے
گا۔“ مہاراج اشتعال بھرے لہجے میں بولا۔

”میری بھی ایک شرط ہے رنگ میں جانے
سے پہلے راجکمار کا پتہ ضرور بتاؤں گا لیکن مقابلہ
شروع ہونے سے پہلے میرے بھائی کو یہاں
لایا جائے، اگر میں مقابلے میں مارا گیا تو تم بے شک
اسے مار دینا اگر جیت میری ہوئی اور تمہارا بیٹا میرے
ہاتھوں مارا گیا تو تم منہ مانگے انعام میں مجھے
اور میرے بھائی کو زندہ یہاں سے جانے دو گے، بولو
یہ شرائط تمہیں منظور ہیں؟“ عثمان تقریباً چیختے ہوئے
بولا۔ اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ میدان میں موجود
تمام لوگوں نے سنی۔

مہاراج سوچ میں پڑ گیا اگر انکار کرتا تو لوگ ان
باپ بیٹے کو بزدل سمجھتے، برسوں سے لوگوں کے دلوں میں
اس کا رعب اور جوہشت تھی لوگوں کے دلوں میں کم
ہو جاتی اگر یہ مقابلہ ہو جاتا تو عثمان جو کہ اس کی نظر میں
کمزور فریق تھا رنجیت کے ہاتھوں مارا جاتا اس طرح اس

کا انتقام بھی پورا ہو جاتا اور راجکمار بھی اس کے ہاتھ
آ جاتی اور دوسرے بھائی کو بھی پھانسی پر چڑھا دیتا۔
لوگوں کے دلوں میں ان کی ڈھاک بیٹھ جاتی یہ سوچ
کر مہاراج نے ہامی بھری۔

”مجھے تیری تمام شرائط منظور ہیں میں وچن دیتا
ہوں کہ جیت کی صورت میں تجھے اور تیرے بھائی کو زندہ
یہاں سے جانے دیا جائے گا۔ اب رنگ میں جانے سے
پہلے راجکمار کا پتہ بتا کیونکہ تو رنجیت کے ہاتھوں مارا
جائے گا پھر راجکمار کا پتہ کون بتائے گا۔“ وہ مکاری
سے بولا۔

اس طرح نہیں مہاراج پہلے میرے بھائی
کو یہاں بلاؤ۔“ مہاراج کے حکم پر اس کے بھائی کو یہاں
بولایا گیا پردیپ کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے
تھے اس کے چہرے پر زخموں کے نشان تھے کپڑے جگہ
جگہ سے پھٹے ہوئے تھے عثمان کے کہنے پر اس کے دونوں
ہاتھ کھول دیئے گئے۔

”میں اپنے بھائی سے ملنا چاہتا ہوں۔“ عثمان بولا۔
”ہاں مرنے سے پہلے لو، ہم مرنے والے کی
آخری خواہش ضرور پوری کرتے ہیں۔“

عثمان آگے بڑھ کر پردیپ کے سینے سے لگ
گیا۔ ”پردیپ میرے بھائی تم فکر مت کرو میں تمہیں
زندہ سلامت یہاں سے لے جاؤں گا۔“ اس کے لہجے
میں یقین تھا۔

”بھائی یہ بہت ظالم لوگ ہیں، انہوں نے دیدی
کو بھی مار دیا، ہمیں بھی مار دیں گے۔“ پردیپ رونے لگا۔
نہیں پردیپ اب رو نہا تم اب رو نے کی باری
مہاراج کی ہے میں گن گن کر ان سے ظلم و ستم کے بدلے
لوں گا تم گھبراؤ ستم اس نے بھائی کی پیٹھ پھینکی اور مہاراج
کے رو برو کھڑا ہو گیا۔

”مہاراج تمہاری بیٹی اپنی مرضی سے میرے
ساتھ گئی تھی میں زبردستی نہیں لے گیا وہ مظلوم لڑکی بھی
تمہارے ظلم و ستم سے تنگ تھی، یہ وضاحت میں اس لئے
نہیں کر رہا کہ میں تم سے ڈرتا ہوں، صرف اس لئے

کر رہا ہوں کہ یہ لوگ مجھے غلط نہ سمجھیں اس وقت بھی وہ
اپنے چاچا کنیش کی حویلی میں ان کے پاس موجود ہے
اگرچہ تم لوگوں کی بہن بیٹیوں کو بے عزت کرتے ہو اس
کے باوجود بھی میں نے اسے چھوٹا کیا نہیں۔“

وہ رنگ میں چلا گیا رنجیت اور عثمان دونوں ایک
دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہے
تھے۔ میدان میں موجود تمام افراد کو عثمان کی کبھی شکست
نظر آ رہی تھی۔ رنجیت ساڑھے چھ فٹ سے نکلتے ہوئے
قد و قامت اور ورزشی جسم کا مضبوط فولادی شخص تھا اس
کے علاوہ مارشل آرٹ اور لڑائی بھڑائی کے فن میں ماہر
تھا۔ رنجیت نے پیٹرا بدلتے ہوئے عثمان کی کبھی
پراپر کوئچنگ کا وار کیا۔

عثمان نے نہایت مہارت سے ہلاک کر کے اس
کا وار روکا اور ساتھ ہی سائیڈ کلک اس کے سینے پر رسید
کی، رنجیت لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کی طرف گیا اس کے چہرے
پر حیرت کے آثار نمایاں نظر آ رہے تھے ماضی میں اس
کے ہاتھوں پٹنے والے کمر و شخص نے فائٹ کے پہلے ہی
مرحلے پر اسے باور کرایا تھا کہ اب وہ رنجیت کے لئے
تروالہ نہیں بلکہ لوہے کا چٹنا ثابت ہوگا رنجیت اب محتاط
انداز میں کھڑا تھا۔

”لگتا ہے تم نے تھوڑی بہت اچھل کود سیکھ لی
ہے لیکن تم میں اپنی بہن کے جتنا بھی زور نہیں۔ رنجیت
نے زہر افشانی کی اس کا مقصد عثمان کو طیش میں دلانا تھا
جس میں وہ کامیاب رہا۔

وہ اندھا دھند رنجیت سے جا کر لکڑیا اس کا گھونہ
پوری شدت کے ساتھ رنجیت کے سینے پر لگا اس وقت
اسے اندازہ ہوا کہ اس کا مد مقابل رنجیت کوئی عام شخص
نہیں اس کے جسم میں جیسے گوشت پوست کے بجائے
فولاد بھرا ہوا ہے۔ سینے پر گھونہ کھا کر رنجیت رنگ کے
رسوں سے ٹکرا کر اس طرح تیزی سے واپس اس کی
طرف آیا کہ اسے لگتا رسوں میں طاقتور اسپرنگ لگے ہوں
اس کا فولادی ہاتھ عثمان کے جڑے پر پڑا اور آنکھوں
میں ستارے سے قفس کر گئے یکا یک وہ کسی وحشی کی

طرح عثمان پر ٹوٹ پڑا وہ خالی ہاتھ تھا مگر لگتا تھا کہ اس
کے ہاتھوں میں تھوڑے ہیں۔

چند ہی منٹ میں عثمان کو اپنے جسم پر درجنوں
ضربیں سہا پڑیں وہ کئی بار رسوں سے ٹکرایا مگر پھر اٹھا
پھر عثمان کا داؤ چل گیا عثمان نے اس پر ایسا وار کیا کہ
جو کسی کرائے فائٹ میں سراسر فاول ہوتا ہے مگر یہ زندگی
موت کی جنگ تھی اس میں ہر داؤ جائز تھا عثمان نے اس
کی رانوں کے عین درمیان زوردار ٹھوک ماری تو وہ تڑپ
کر پیچھے کی طرف گیا عثمان کو اٹھنے اور سنبھلنے کا موقع مل
گیا۔ اگلے چند منٹ تک ان دونوں کے درمیان
خطرناک معرکہ ہوا، معرکہ کے دوران رنجیت نے اپنی
پتلون کی جیب میں پوشیدہ تیز دھار چاقو نکال لیا اس کے
چاقو کے خطرناک ترین وار اس نے بشکل رو کے ایک
موقع پر اس نے پوری قوت سے رنجیت کے منہ پر لات
ماری عثمان کے پاؤں کا بالائی حصہ اس کی تھوڑی پر لگا وہ
اوپر کی طرف اچھلا اور پشت کے بل نیچے گرا اس نے
سرعت سے اٹھنے کی کوشش میں مگن رنجیت پر چلا ٹنگ
لگا دی۔ اس کے دونوں گھٹنے رنجیت کی پسلیوں پر لگے تو وہ
کراہ کر دوبارہ گر گیا وہ چلایا اور اپنے ہاتھ میں موجود چاقو
کو سنبھالنے لگا وہ عثمان کے سینے میں چاقو پیوست
کرنا چاہتا تھا مگر عثمان کے سر پر بھی خون سوار تھا اس نے
دونوں ٹانگیں ہوا میں بلند کیں اور ایڑیاں اس کی ٹانگوں
کے بیچ ماریں رنجیت ہلکا کر اٹھ بیٹھا شدید تکلیف سے
اس کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے تھے عثمان نے موقع
سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چاقو پر ہاتھ ڈال دیا۔

رنجیت نے جھک کر دیکر چاقو چھڑانا چاہا مگر ناکام
رہا۔ عثمان نے دوسرے ہاتھ کا زوردار گھونہ اس کے سینے
پر مارا اور چاقو کو اپنی گرفت میں لے کر کوشش کی مگر ناکام
رہا۔ اس نے رنجیت پر اندھا دھند گھونوں کی بارش کر دی
پورے میدان میں سکوت چھا چکا تھا سب لوگ پھٹی پھٹی
آنکھوں سے موت اور زندگی کی خوف ناک کش مکش دیکھ
رہے تھے۔

مہاراج کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا لڑائی

میں مداخلت کروانا اس کی بے عزتی تھی اس لئے خود پر مضبوط کرتے ہوئے خونی مقابلہ دیکھتا رہا۔ اس سے پہلے کہ عثمان اس سے چاقو چھیننے میں کامیاب ہوتا۔ رنجیت کا زوردار گھونسا اس کی چٹنی پر پڑا اور دیکھ کر اس کے رگ و پے میں جھیل گئی لمحے بھر میں اس کا وجود بے جان ہو گیا وہ کولہوں کے بل گرا اور بری طرح تڑپنے لگا میدان رنجیت کے حمایتیوں کے شور اور تالیوں سے گونج اٹھا رنجیت کے لئے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ اس نے چاقو ہاتھ میں پکڑتے ہوئے عثمان کے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی عثمان فٹ بال کی طرح ادھر ادھر لڑھکھٹنے لگا اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے سے رقص کر رہے تھے اسے پورا میدان گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ رنجیت نے چند لمحے رک کر اسے نفرت سے دیکھا پھر اس کے سینے پر چڑھ کے بیٹھ گیا اس نے اپنے دونوں گھٹنوں سے عثمان کے دونوں بازوؤں پر دباؤ ڈالا اور خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند کر کے فاتحانہ نگاہ سے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے حمایتی شور مچانے لگے۔ ”مارو، اس مسئلے کو مار دو۔“ عثمان بے بسی سے اس کے نیچے پڑا تھا۔

اچانک عثمان کی نگاہوں کے سامنے اپنی بہن پڑھائے جانے والے ظلم کے مناظر گھوم گئے اس کے ذہن میں بجلی سی گھنٹی اس نے دونوں ٹانگیں فضا میں بلند کیں اور رنجیت کی گردن میں چٹینی بنا کر زوردار جھٹکا دیا۔ رنجیت اس کے سر پر سے ہوتا ہوا دوسری طرف جا کر اور وہ لڑھکتا ہوا اٹھا اور اٹھتے ہی رنجیت کے سینے پر چب سا سائڈ لک ماری رنجیت اچھل کر نیچے گرا چاقو اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر ایک طرف جا گرا۔ عثمان نے فضا میں قلا بازی کھائی اور اٹھتے ہوئے رنجیت کے سینے پر فلاٹنگ لک ماری رنجیت دوبارہ نیچے گر گیا رنجیت جہاں گرا اس سے کچھ فاصلے پر چاقو پڑا تھا اس نے چاقو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

عثمان نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور چھلانگ مار کر اس پر سوار ہو گیا عثمان نے بے درپے کئی گھونٹے اس کے چہرے پر مارے اور لپک کر چاقو اٹھالیا اس کا ہاتھ

میں چاقو آتے ہی مہاراج اور نارائن اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے اس نے بجلی کی سی تیزی سے تیز دھار چاقو رنجیت کے سینے میں ڈالنے کے مقام پر پھوسٹ کر دیا۔ رنجیت بنا کوئی آواز نکالے جنم رسید ہو گیا۔ عثمان رنجیت کی لاش سے اٹھا اور رنگ سے اتر کر مہاراج کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”مہاراج اپنا وعدہ پورا کرو۔“

مہاراج کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا اس کی نظروں کے سامنے سینکڑوں حمایتیوں کے درمیان عثمان نے اس کے اکلوتے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر وہ کچھ نہ کر سکا تھا اب بھی وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا وہ اس سے اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ اس جگہ نہیں لے سکتا تھا۔ سینکڑوں لوگوں کے سامنے مہاراج نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کرنا تھا۔

پردیپ کو عثمان کے حوالے کر دیا گیا ”سنو بالک ہم اپنے وعدے کے مطابق اپنی حدود میں کچھ نہیں کہیں گے مگر اس ریاست سے تمہارے نکل جانے کے بعد ہم آزاد ہو گئے۔ تمہیں رنجیت کے خون کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔“

”مہاراج اس وقت میں تمہارے سامنے تمہارے بیٹے کے خون سے ہاتھ رنگ کر جا رہا ہوں کل کیا ہوگا اس کا فیصلہ کل کریں گے تم نے ماضی میں جو مظالم کئے ہیں اس کا حساب تمہیں بھی دینا پڑے گا تم بھی انتقام کا نشانہ بنو گے۔“ عثمان فیصلہ کن لہجے میں بولا اور پردیپ کو لے کر میدان سے رخصت ہو گیا۔

مہاراج نے حسب وعدہ اسے ایک تیز رفتار گھوڑا دیا تھا گھوڑا تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے ریاست سے باہر جانے والے راستے کی طرف جا رہا تھا وہ ریاست کی حدود سے جب باہر پہنچے تو رات کے نو بج چکے تھے ہر طرف تاریکی کا راج تھا عثمان گھوڑا دوڑاتا ہوا جنگل کی حدود میں داخل ہو گیا پردیپ اس کے پیچھے اس سے چپکا بیٹھا تھا۔ جنگل کی حدود میں داخل ہوتے ہی اس نے گھوڑے کی رفتار کم کر دی چاروں طرف گھپ اندھیرا

تھا۔ اس اندھیرے میں تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا ناممکن تھا جنگل مختلف قسم کے جانوروں کی آوازوں سے گونج رہا تھا یہ آوازیں کم عمر پردیپ کو خوف زدہ کر رہی تھیں۔ ”بھیا مجھے ڈر لگ رہا ہے وہ بولا۔ اور عثمان نے گھوڑا روک دیا وہ دونوں گھوڑے سے نیچے اترے۔ بھائی یہ بہت خطرناک جنگل ہے اگر کوئی جنگلی جانور آ گیا تو ہمیں کون بچائے گا۔“ پردیپ معصومیت بھرے لہجے میں بولا۔

اچانک وہ چونک بڑا اس کے ارد گرد سے ڈھول اور باجوں کی آوازیں آنے لگیں تھیں وہ متلاشی نظر سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ آوازیں ان کے قریب بڑھنے لگیں پھر وہ ظاہر ہو گئے وہ پچاس ساٹھ کے قریب تنگ ڈھرنگ گورتیں اور مرد تھے لباس سے عاری جسم پر انہوں نے مختلف قسم کے رنگ رنگے ہوئے تھے وہ اب ان دونوں کے ارد گرد گورتیں تھیں وہ دونوں حیرت سے ان تنگ ڈھرنگ افراد کی اچھل کود دیکھ رہے تھے ان پچاس ساٹھ افراد میں سے کچھ افراد نے ڈھول اور باجے اٹھا رکھے تھے جن کے شور سے ان کے کان کے پردے پھٹنے لگے تھے ان میں بیس کے قریب نوجوان اور صحت مند افراد نے ہاتھوں میں بھالے اور تلواریں اٹھا رکھی تھیں اس ہجوم میں کچھ پجاری قسم کے افراد بھی موجود تھے جن کے گلے میں مختلف قسم کی مالاں ڈلی ہوئی تھیں۔ چند لمحے کے اس تماشے کے بعد انہوں نے ڈھول اور باجے بجانا بند کر دیے اب سب اپنی اپنی جگہ پر خاموش کھڑے تھے۔

ایک پجاری آگے بڑھا اور ان سے مخاطب ہوا۔ ”ہم کالی کے پجاری ہیں تمہیں ہمارے ساتھ مندر جانا ہوگا۔“

”مگر کیوں اور اگر تم نہ جانا چاہو تو“ عثمان نے کرخت لہجے میں پوچھا؟

”اس صورت میں ہمیں زبردستی کرنی پڑے گی اور تم دیکھ بھی رہے ہو ہمارے پاس ہتھیار بھی موجود ہیں۔“ پجاری نے جواب دیا، وہ انہیں اپنے نرغے میں

لئے آگے بڑھ گئے، کافی دیر پیدل چلنے کے بعد وہ قافلہ ایک سرنگ نما راستے میں داخل ہوا یہاں پہنچ کر پجاریوں نے نارنجیں روشن کر لیں تھیں وائیں طرف سرنگ کی نیم پختہ دیواروں میں کہیں کہیں سوراخ تھے جن سے ہلکی ہوا اور مدھم روشنی اندر آتی تھی ان کے سامنے سیڑھیوں کا ایک سلسلہ آگیا یہ سیڑھیاں سرنگ کے پتھرے فرش کو کھود کر بنائی گئی تھیں وہ آگے بڑھنے لگے انسانی ہاتھوں کی بنائی گئی یہ سرنگ آگے جا کر تنگ ہونے لگی تھی جگہ تنگ ہونے سے انہیں کھٹن محسوس ہو رہی تھی پچاس قدم آگے جا کر انہیں ہلکا سا شور سنائی دیا ایسا لگ رہا تھا کہ آپس میں کچھ افراد زور زور سے باتیں کر رہے ہیں وہ چلتے ہوئے ایک وسیع و عریض ہال میں داخل ہو گئے یہاں بڑے بڑے ستون تھے جنہوں نے چھت کو ہمارا دے رکھا تھا۔ دیواروں پر جا بجا دیوی دیوتاؤں کی تصویریں آویزاں تھیں ان کے سامنے ایک ادھیڑ عمر کا شخص آگیا شکل اور حلیہ سے وہ کوئی پنڈت لگ رہا تھا قریب ہی پانچ کے قریب افراد آپس میں باتیں کر رہے تھے ان کے کندھوں سے راتھلیں لٹک رہی تھیں ان کے اندر داخل ہوتے ہی عثمان کے ساتھ آنے والے پجاریوں میں سے ایک پجاری ان کی طرف بڑھا اور ان کی گفتگو میں شامل ہو گیا سب عثمان اور پردیپ کو غور سے دیکھ رہے تھے انہیں یوں دیکھی سے دیکھا جا رہا تھا جیسے قربانی کے جانور کو دیکھا جاتا ہے آپس میں باتیں کرتے ہوئے گاہے بے گاہے وہ عثمان کی طرف اشارے بھی کرتے تھے عثمان کو بے چینی ہو رہی تھی جبکہ پردیپ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ان کی گفتگو کا اختتام ہو گیا اب وہ ان دونوں کو لے کر آگے بڑھے یہاں کالی کا بیت ناک بت موجود تھا دونوں کو بت کے قدموں میں کچھ دیر بیٹھا کر اشلوک پڑھے گئے پھر ان دونوں کو لے کر راہداری سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں آگے ان دونوں کو کمرے میں دھکیل کر ہاتھ پشت پر مضبوطی سے باندھے گئے۔ اس کے بعد پاؤں کی باری

آئی۔ ”سنو بہم دووٹوں آرام سے یہاں پڑے رہو، کل رات کالی کے چروں میں تم دووٹوں کی بلی دی جائے گی۔“ پردیپ خوف سے چیخنے پکارنے لگا بچاری اس کی چیخ و پکار سے بے نیاز کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل کر کے چلا گیا۔

”پردیپ خاموش ہو جاؤ دروست اللہ بہتر کرے گا۔“ عثمان نے بظاہر اسے تسلی دی مگر خود سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کالی کے بچاریوں کے بارے میں بہت کچھ نہ رکھا تھا اپنا انجام اسے صاف نظر آ رہا تھا۔

رات گہری ہو چکی تھی، پردیپ سوچ کا تھا تقریباً رات بارہ بجے دروازے کی طرف بڑھتی قدموں کی چاپ سنائی دی ساتھ ہی ایک مانوس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ہاں بھی دکھاؤ تو سہی تم نے بلی کے لئے کون سے بندے پکڑے ہیں۔“ دروازہ کھلا اور دو بچاریوں کے ساتھ آنے والی شخصیت کو دیکھ کر عثمان حیران رہ گیا وہ مہاراج کا دوست راست نارائن تھا۔

نارائن بھی انہیں دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ”واہ بھی واہ! تم لوگوں نے آج ایسا کارنامہ سر انجام دیا ہے کہ میں تم لوگوں سے خوش ہوں۔ یہ دونوں بمشکل بھائی مہاراج کو مطلوب ہیں کل رات بلی کے بعد ان کے کئے ہوئے سر مجھے دینا، میں مہاراج کو تحفے میں دوں گا۔“ نارائن بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکل گئے رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔

صبح جاگنے کے بعد کچھ دیر تک عثمان بے حس و حرکت پڑا رہا دیوار پر لگے وال کلاک میں صبح کے چھ بجے تھے۔ پردیپ بدستور سو رہا تھا۔ اس نے بیروں کو زور دے کر رسی کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا مہاری مضبوطی سے بندھی تھی اس نے گھٹنے اکٹھے کئے اور اٹھ کر بیٹھ گیا دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا شاید ان کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے کی وجہ سے وہ بے فکری سے جاتے وقت دروازہ کھلا چھوڑ گئے تھے ہر طرف خاموشی کا راج تھا کسی قسم کی آواز سنائی نہ دے رہی تھی

یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں کوئی ذی نفس موجود نہ ہو۔ اس نے اپنے بندھے ہاتھوں کو بیروں میں بندھی رسی کی گانٹھ تک پیچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اس کوشش پر اس کی کلائی بری طرح جھل گئی تھی۔ ہاتھوں میں تکلیف سی محسوس ہو رہی تھی وہ تکلیف کے باوجود برابر اپنی کوشش میں لگا رہا۔

بالآخر اس کی انگلیوں نے گانٹھ کو چھو لیا۔ اسے رسی کو ٹول کر گانٹھ کھولنے کی کوشش کی اور آخر کار اپنی کوشش میں اسے کامیابی ہوئی۔ وہ اپنے بیروں کو رسی سے آزاد کرا چکا تھا پاؤں رسی سے آزاد ہوتے ہی وہ اٹھا اور پردیپ کی طرف بڑھا سرگوشی میں چند آوازیں دیں! پردیپ نیند میں کسمانے لگا مگر اٹھ نہیں آ کر جنگ آ کر اس کے قریب بیٹھ کر پاؤں سے اسے جھنجھوڑا، اس بار پردیپ اٹھ بیٹھا۔ ”بولنے کی کوشش مت کرنا۔“ عثمان سرگوشی میں بولا اور اس کی پیٹھ سے اپنی کمر لگا کر اس کے ہاتھوں پر بندھی گانٹھ کھولنے کا کچھ دیر بعد پردیپ کے ہاتھ آزاد ہو چکے تھے پردیپ نے اپنے پاؤں کھولنے کے بعد عثمان کے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیئے وہ کمرے سے نکل کر راہداری میں پہنچنے یہاں کوئی نہیں تھا انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور دے پاؤں چلتے ہوئے ہال نما کمرے میں آ گئے ہال نما کمرے میں چند بچاری سکرے سٹے سو رہے تھے ان کے قریب شراب کی چند بوتلیں خالی پڑی تھیں غالباً کثرت شراب نوشی سے وہ مدھوش ہو چکے تھے وہ دونوں چلتے ہوئے سرنگ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے سرنگ میں آتے ہی وہاں کا طائرانہ جائزہ لیا وہاں بھی کوئی موجود نہ تھا شاید کالی کے مندر میں موجود تمام افراد شراب کے نشے میں مدھوش پڑے تھے وہ تیزی سے چلتے ہوئے سرنگ سے باہر نکل گئے۔

تقریباً پچاس قدم چلنے کے بعد عثمان نے پلٹ کر دیکھا ان کے تعاقب میں کوئی نہ تھا یعنی کسی کو بھی انکے فرار کا علم نہ تھا جوں جوں وہ مندر سے دور ہوتے گئے ان کے چلنے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی، یعنی اب

وہ بھاگنے کے سے انداز میں چل رہے تھے کافی دیر چلنے کے بعد وہ جنگل میں داخل ہو چکے تھے وہاں سے باحفاظت نکل جانے پر عثمان نے خدا کا شکر ادا کیا مگر اسی وقت اس کی نگاہوں کے آگے اندھیرا اچھا گیا۔

ایک سیاہ رنگ کی جیب اچانک ان کے قریب آ کر رک گئی اس میں سے نارائن نکل کر ان کی سمت بڑھا وہ حیران اور پریشان تھے کہ یہ مصیبت دوبارہ کہاں سے نازل ہوگئی نارائن کے ہاتھوں میں رائفل موجود تھی جس کی نال کارخانہ ان کی طرف تھا۔

”رات کو ہم لوگوں نے زیادہ پی پی لی تھی اس لئے تم وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے وہ تو اٹھ کھلتے ہی مجھے تمہارا خیال آیا کمرے میں جھانکا تو تم لوگ غائب تھے میں سمجھ گیا تم فرار ہو چکے ہو اس لئے فوراً ہی اس طرف دوڑ پڑا یہ تو بھگوان کی کرپا ہے کہ تم ہاتھ آگے چلو آگے بڑھو۔“ اس نے عثمان کو رائفل کی نال سے دھکا دیا۔

وہ دونوں بھائی جیب کی طرف بڑھنے لگے نارائن انکے پیچھے رائفل تھامے چل رہا تھا اچانک ایک جگہ ٹھوکر کھانے سے وہ ٹوٹ کر ایا تو عثمان نے موقع سے فائدہ اٹھا تے ہوئے بیک لک اس کے رائفل والے ہاتھ پر ماری رائفل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گری اس نے رائفل اٹھانے کے لئے جھکنا چاہا تو عثمان نے زوردار لالت اس کے جڑے پر ماری وہ چیخا ہوا ایک طرف گر گیا عثمان وحشیوں کی طرح اس پر پل پڑا۔ اس کی لاتیں گھونٹنے نارائن کے جسم پر پڑنے لگے چند لمحوں بعد وہ زمین پر پڑا تھا عثمان نے لپک کر اس کی رائفل اٹھائی۔

”یاد کرو برسوں پہلے تم نے ظالم مہاراج کے سامنے شوشہ چھوڑا تھا کہ اس امادس کی رات پیدا ہونے والا بچہ اس کے لئے خطرناک ثابت ہوگا اسی شوشے کی وجہ سے اس ظالم نے درجنوں بچوں کو ذبح کر دیا۔“ عثمان بولا۔

”مم..... مجھے معاف کر دو بھگوان کے لئے مجھے

مت مارو۔“ وہ گڑگڑایا عثمان نے رائفل کارخانہ اس کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا کئی فائر ہوئے فضا اس کی چیخوں سے گونج اٹھی وہ نارائن کی لاش کو کھوکر مارکر پردیپ کا ہاتھ تھامے نارائن کی جیب کی طرف بڑھا۔

اسی وقت گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی وہ چونک پڑا۔ ”یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے ایک مصیبت سے بمشکل جان چھڑائی تھی اب کون نازل ہو گیا۔“

دیکھتے ہی دیکھتے انہیں درجنوں مسلح گھڑسواروں نے گھیر لیا گھڑسواروں کے چہروں پر نقاب موجود تھا۔ سفید رنگ کے گھوڑے پر سوار نقاب پوش ان کے قریب پہنچ گیا پردیپ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں عثمان بھی پریشان نظر آ رہا تھا گھڑسوار درجنوں کی تعداد میں تھے۔ ”کون ہوتا اور اسے کس نے مارا؟“ سفید گھوڑے پر سوار نقاب پوش نے اس سے پوچھا۔

”میرا نام عثمان ہے اور اسے میں نے مارا ہے۔“ ”نقاب پوش گھوڑے سے اترا اور اس کے سینے

سے جا لگا شاباش میرے شیر شاباش تمہارے بہت چرچے سنے تھے میں نے تم نے رنجیت جیسے درندے کا خاتمہ کیا تھا اور اب اس شیطان کو انجام تک پہنچا کر تم نے یہاں کے لوگوں کو اس درندے سے نجات دلوائی ہے میں پانڈے ہوں مہاراج کا بہت بڑا مخالف۔“ اور پانڈے نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا وہ گندی رنگت کا قبول صورت نوجوان تھا کچھ دیر بعد پردیپ اور عثمان پانڈے کے ہمراہ اس کے ٹھکانے پر پہنچے یہ ساتھ افراد پر مشتمل گروہ تھا جو پہاڑی غاروں میں رہتے تھے۔ وہ چھاپا پاروں کی طرح کارروائی کرتے تھے جہاں کہیں مہاراج کے کارندے کم تعداد میں دکھائی دیتے وہ حملہ کر دیتے پانڈے اور اس کے تمام ساتھی ہمدرد اور مخلص تھے یہ مہاراج کے مظالم سے تنگ لوگ تھے جنہوں نے مجبور ہو کر ہاتھوں میں ہتھیار اٹھا رکھے تھے۔ سب عثمان سے متاثر نظر آ رہے تھے وہ اس کے احسان مند تھے کہ اس نے انہیں اور ریاست کے لوگوں کو ان ظالموں سے نجات دلوائی۔

عثمان اور پردیپ ان میں گل مل گئے انہوں نے قہوہ بنایا جو سب نے ساتھ مل کر پیا، سب ایک جگہ بیٹھے گپ شپ اور ہنسی مذاق کرتے رہے۔

اس طرح خوش گپیوں میں خاصا وقت گزر گیا۔ مغرب کے وقت ایک گھڑ سوار تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے، گھوڑے سے اتار کر وہ پاؤں کے طرف بڑھا۔ ”سو لو کیا ہو کیوں اتنا گھبرائے ہوئے ہو؟“ پاؤں نے پوچھا۔

”سردار غضب ہو گیا نارائن کی لاش ملنے ہی مہاراج اچھوتوں سمیت چلی ذات کے بندوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے ہیں۔ جگہ جگہ قتل ہو رہے ہیں نو جوان عورتوں کو اغوا کیا جا رہا ہے گھروں کو آگ لگائی جا رہی ہے رنجیت کے بعد نارائن کے قتل نے اس کے حواس چھین لئے ہیں وہ وحشی ہو چکا ہے اب وہ اپنے سیکڑوں مسلح کارندوں کے ہمراہ بستیوں کو تباہ و برباد کرتا ہوا یہاں کارخ کر رہا ہے۔“ سو لو گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

اس کی بات سنتے ہی پاؤں بولھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہم صرف پچاس افراد ہیں سیکڑوں تربیت یافتہ سپاہیوں کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔ فوراً یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔ عثمان تم ہم سے راستے میں الگ ہو کر گنیش کی حویلی چلے جانا مہاراج وہاں حملہ کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ تم کوشش کرو کہ گنیش اپنی طاقت کو مہاراج کے خلاف استعمال کر کے اسے روکے ورنہ مہاراج ریاست کے نچلے طبقے کے تمام افراد کو ہتھیاری سے مٹا دے گا۔ ہم یہاں سے روپوش ہو کر ریاست کے بہادر نو جوانوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنی کوشش میں کامیاب رہے اور گنیش کو تم نے راضی کر لیا تو مہاراج کا خاتمہ یقیناً ہو جائے گا۔“

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہاں سے کوچ کر گئے آدھے راستے میں عثمان ان سے الگ ہو کر گنیش کی طرف چل پڑا کتے چلتے صبح آٹھ بجے کے قریب وہ حویلی میں تھا۔

صدف اسے دیکھتے ہی خوشی سے پاگل ہو گئی

جذبات میں وہ عثمان سے لپٹ کر رونے لگی۔ ”بس کرو صدف مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو، پلیز! کچھ خیال کرو سب دیکھ رہے ہیں۔“ عثمان نے احساس دلایا۔

صدف شرمندگی سے عثمان سے الگ ہو گئی۔ گنیش اور اس کی جتنی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ عثمان کے آنے سے حویلی میں ہل چل مچ چکی تھی عثمان کے کارناموں کی خبر اس سے پہلے یہاں تک پہنچ چکی تھی عثمان نے گنیش کو بتایا کہ مہاراج نے اپنی رعایا پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی ہے اگر اسے روکا نہیں گیا تو ریاست میں صرف مہاراج اور اس کے کارندے ہوں گے باقی سب انسانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

گنیش سوچ میں پڑ گیا اب تک وہ اپنے بھائی سے تصادم سے بچتا آ رہا تھا۔ مگر اب تصادم ناگزیر تھا ایک طرف بھائی تھا تو دوسری طرف ہزاروں انسان اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔

شام کے وقت پاؤں نے ایک ساتھی تیز رفتار گھوڑے پر وہاں پہنچنا اس نے ایسی خبر سنائی کہ گنیش کے اوسان خطا ہو گئے۔ مہاراج سیکڑوں کی تعداد میں بذات خود اپنے سپاہیوں کے ہمراہ گنیش پر حملے کی غرض سے چل پڑا تھا گنیش سر پکڑ کر پیٹھ گیا اس کے مسلح کارندوں کی تعداد 80 کے قریب تھی وہ اس قلیل تعداد میں مہاراج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پاؤں نے اس کا ساتھی خبر سنا کہ جا چکا تھا بھگت گنیش پریشان بیٹھا تھا۔

اس خبر کو سن کر سب پریشان ہو گئے وہ جانتے تھے کہ مہاراج یہاں آتے ہی قتل عام شروع کر دے گا کوئی بھی اس کے انتقام سے بچ نہیں سکتا۔

”میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔“ صدف بولی۔

”وہ کیا؟“ گنیش نے پوچھا۔

”یہ حویلی کسی قلعے کی طرح اگرچہ مضبوط نہیں لیکن کافی وسیع و عریض ہے اس میں سیکڑوں افراد آسکتے ہیں یہاں کے تمام لوگوں کو گھروں سے نکال

کر یہاں لایا جائے کچھ افراد کے پاس چھوٹا موٹا اسلحہ بھی ہوگا انہیں اپنے محافظ دستے میں شامل کر لیں چھت پر باؤنڈری وال کی دیوار چار فٹ کے قریب ہے اس لئے چھت پر اچھی خاصی تعداد میں مسلح افراد کی چوکیاں رہنے کا حکم دیں تاکہ وہ حملہ آوروں کو با آسانی اندر نہ آنے دیں۔“ صدف نے انہیں مسئلے کا بہترین حل بتایا گنیش سمیت وہاں تمام افراد کے چہرے کھل اٹھے۔ ”زبردست! زبردست! واہ زبردست حل تم نے بتایا ہے۔“ گنیش کھل اٹھا۔

”میں نے سنا تھا کہ عورت ناقص عقل ہوتی ہے لیکن تم نے ایسی تدبیر بتائی ہے کہ دل چاہتا ہے تمہیں انعام دیا جائے لیکن اس وقت نہیں۔“ عثمان شوخ لہجے میں بولا۔

”نہیں جی یہ آپ کی غلط فہمی ہے عورت کمزور نہیں اسے کمزور سمجھنے والے ان حقوق کی دنیا میں رہتے ہیں عورتیں ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ رہتی ہیں۔“ صدف چپک کر بولی۔

”میری بیٹی بھگوان کی کرپا سے بہت سمجھدار ہے!“ گنیش نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”مگر بیٹا یہ حویلی ہمیں پناہ دینے کے لئے مضبوط سہارا نہیں ہو سکتی ہے پہلے ہی حملے میں وہ لوگ حویلی میں داخل ہو جائیں۔“ گنیش نے نکتہ نکالا۔

”چاچا جی ہمارے پاس نو جوان لاقعداد میں ہیں آپ اپنے محافظ دستے کے نو جوانوں کو حویلی سے چند گز کے فاصلے پر گہری خندق کھود دیں گے۔“

صدف کی تجویز سن کر سب کے چہروں پر اطمینان دوڑ گیا علاقے کے تمام لوگوں کو صورتحال سے آگاہ کر کے حویلی میں محفوظ کر لیا گیا گنیش کے حکم پر سیکڑوں کی تعداد میں نو جوان خندق کی کھدائی میں مصروف ہو گئے۔

چند گھنٹوں میں حویلی کے چاروں طرف کافی گہری اور چوڑی خندق کھودی جا چکی تھی اب اسے پھلانگ کر پار کرنا ناممکن تھا۔

چھت پر ماہر نشانہ باز رائفلیں لے کر اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے خندق کے اوپر کمزور قسم کی درخت کی لمبی لمبی ٹہنیاں ڈال کر اوپر گھاس پھوس ڈال دی گئی اب پہلی نظر میں کسی کو اس خندق کی موجودگی کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو حویلی کے پچھلے بال میں بٹھرایا گیا۔

صبح سویرے پچھلے مچ حویلی کے اطراف میں گھوڑوں کی اور بچپوں کی آوازیں سنائی دیں، ساتھ ہی کئی فائر ہوئے اور نعرے مارے گئے۔

عثمان چھت پر محافظ دستے کے ہمراہ چوکی کھڑا تھا۔ اس نے تھوڑا سا سر اٹھا کر دیکھا اسے اپنے رونگٹے کھرے ہوئے محسوس ہوئے، حویلی کے چاروں طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے ابھی وہ حویلی سے کچھ فاصلے پر تھے اور حویلی پر حملے کا آغاز نہیں کیا تھا ابھی وہ خندق سے بھی کچھ فاصلے پر حویلی کے گرد گھیرا ڈال رہے تھے پھر حملے کا آغاز کر دیا گیا۔ بے درپے مختلف اقسام کی رائفلوں اور بندوٹوں سے فائرنگ شروع ہو گئی، فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی چھت پر موجود عثمان اور محافظ دستے کے ارکان نے اب تک جوابی فائر نہیں کیا تھا اس کے پاس گولیاں محدود تھیں اس لئے وہ گولیاں بغیر ہدف کے ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

مہاراج کے سپاہی فائرنگ کرتے ہوئے تیزی سے اندھا دھند آگے بڑھے ان میں سے کئی سپاہی لاعلمی میں چیختے ہوئے خندق میں جا گرے اسی وقت چھت پر موجود عثمان اور محافظ دستے نے نشانہ لے کر تباہ توڑ فائرنگ شروع کر دی کئی سپاہی چیختے ہوئے ان کی گولیاں کا شکار ہو گئے۔

اب حویلی میں سے بھی نعروں کی گونج شروع ہو چکی تھی صورتحال کو بھانپ کر مہاراج کے سپہ سالار نے اپنے سپاہیوں کو منظم کیا اور ادھر ادھر مورچہ زن ہو گئے اب وہ سمجھل کر حویلی کی طرف بڑھ رہے تھے اور فائرنگ کر رہے تھے۔

مہاراج دور کہیں چھپا غصے سے دھاڑ رہا تھا شاید

پہلے حصے میں اپنے سپاہیوں کی ہلاکت نے اس کے غصے میں اضافہ کر دیا تھا سپہ سالار نہایت مہارت سے سپاہیوں کی کمان کر رہا تھا پھر وہ تشویش میں مبتلا ہو گئے مہاراج کے سپاہی خندق پر لمبے لمبے تختے رکھ رہے تھے حویلی کی دیواروں میں فائرنگ میں شدت آگئی تھی اب عثمان اور محافظ دسٹے کے لئے فائرنگ کرنا ناممکن تھا گولیاں ان کے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں محافظ دسٹے کے کچھ نوجوانوں نے اٹھ کر فائر کرنے کی کوشش لیکن سروں میں گولیاں کھا کر وہیں ڈھیر ہو گئے ان کا حشر دیکھ کر دوسروں کا حوصلہ جواب دے گیا مہاراج کے سپاہی اس شدید فائرنگ کی آڑ میں آرام سے خندق پا کر رہے تھے۔ سامنے والی دیوار زمین بوس ہوئی۔ وہ دقتی بم تھے جو مہاراج کے سپاہیوں نے سامنے کی دیوار پر پھینک تھے دھماکوں کی آواز اور شدت نے حویلی میں موجود عورتوں اور بچوں کو خوف زدہ کر دیا تھا وہ چیختے چلاتے اور رونے لگے۔

صورتحال بہت گھمبیر ہو چکی تھی سینکڑوں معصوم لوگوں کی زندگی خطرے میں تھی ان میں بوڑھے بھی تھے نوجوان بھی تھے عورتیں اور بچے بھی تھے پھر چشم فلک نے حیرت انگیز منظر دیکھا ماضی کی راجکماری گیتا جواب صدقہ تھی مارشل آرٹ کے ماہر کامران کی تربیت یافتہ ہاتھوں میں رائفل تھا جسے پچاس کے قریب نوجوانوں کے ہمراہ کرالنگ کرتی ہوئی حویلی سے باہر آئی صدقہ نے چہرے اور سر پر سفید رنگ کا رومال باندھا ہوا تھا گویا وہ سر پر نق بانداہ کر میدان جنگ میں آ کر آئی تھی صدقہ اور اس کے ساتھی سپہ سالار کے سپاہیوں پر تہہ بن کر ٹوٹ پڑے۔ ان کی گولیاں خندق پار کر کے آنے والے دشمنوں کے جسم میں چھید کر رہی تھیں بارود کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔

صدقہ کے ساتھ باہر نکل کر لڑنے والے جوانوں میں سے کچھ نوجوان مہاراج کی سپاہیوں کی گولیوں کا شکار ہو چکے تھے حویلی میں صدقہ کی بہادری سے اندر موجود بقیہ نوجوانوں کو غیرت آگئی سینکڑوں کی

تعداد میں نوجوان ہاتھوں میں تلواریں خنجر، کلہاڑیاں لاشیاں اور بعض رائفلیں اٹھا کر حویلی سے باہر آ گئے اب دونوں طرف سے دست بدست لڑائی شروع ہو چکی تھی باہر موجود سینکڑوں جوان صدقہ کی قیادت میں لڑ رہے تھے ہر طرف لاشیں اور زخموں کی چیخ پکارت تھی۔

صدقہ کی طرف سے مزاحمت کی وجہ سے مہاراج کے سپاہیوں کی توجہ عثمان وغیرہ کی طرف سے ہٹ چکی تھی اب چھت پر موجود عثمان اور محافظ دسٹے کے نوجوان تاک تاک کر مہاراج کے سپاہیوں پر گولیاں برس رہے تھے حویلی کے اندر کشیش بچوں اور عورتوں کو حوصلہ دے رہا تھا تمام مرد حویلی سے باہر مہاراج کے سپاہیوں سے لڑ رہے تھے کشیش کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے آثار تھے انہیں معلوم تھا ان کے نوجوان کے پاس اسلحہ اور گولیاں کم ہیں اس اسلحہ سے کافی دیر تک مہاراج کا مقابلہ ناممکن تھا بالآخر انہیں پسپا ہونا پڑتا پھر یہاں کوئی زندہ نہیں بچتا مہاراج کے سپاہی مہاراج کے حکم پر سب کا خاتمہ کر دیتے۔

لڑائی شروع ہوئے تقریباً آٹھ گھنٹے ہو چکے تھے صدقہ اور اس کے ساتھ لڑنے والے اب پسپا ہو کر دوبارہ حویلی میں داخل ہو چکے تھے ان کے کافی ساتھی مارے جا چکے تھے بہت سے شدید زخمی تھے جن کی چیخ و پکار سے حویلی کے درو دیوار لرز رہے تھے اب ان کے لئے خطرہ بڑھ چکا تھا مہاراج کے سپاہی کرالنگ کرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے حویلی میں موجود افراد اپنی بقاء کی آخری جنگ لڑ رہے تھے صدقہ اور دوسرے جوان حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والے سپاہیوں پر نشانے لگا کر فائر کر رہے تھے چھت کے اوپر سے عثمان اور محافظ فورس کے جوان مزاحمت کر رہے تھے ان کی گولیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔

مہاراج کے سپہ سالار کی ہدایت پر حویلی میں پنڈ گریڈ جھپٹے گئے فضا خوفناک دھماکوں اور انسانی چیخوں سے گونج اٹھی احاطے میں موجود بہت سے جوان ان دھماکوں کی نظر ہو گئے کشیش کا چہرہ خوف سے زرد

پڑ چکا تھا۔ اب کوئی معجزہ ہی انہیں شکست اور موت سے بچا سکتا تھا۔

صدقہ نے رائفل ایک طرف رکھی اور دعا کے لئے ہاتھ کھڑے کر دیئے ”یا اللہ کثیر کے مقابلے میں قلیل جماعت کو فتح دلانے والے رب ہماری مدد فرما کوئی معجزہ دکھا دے میرے اللہ۔“ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو چکی تھیں اور پھر معجزہ ہو گیا۔

مہاراج کی سپاہیوں میں بھگدڑ مچ گئی ان پر عقب سے سینکڑوں کی تعداد میں لوگ حملہ آور ہو گئے یہ پانڈے اور اس کے ساتھی تھے ان میں پردیپ بھی شامل تھا ان کے ساتھ ریاست کے نچلے درجے کے سینکڑوں جوان تھے جو مہاراج کے حد سے بڑھتے ہوئے ظلم سے تنگ آ کر پانڈے کے ساتھ مہاراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے باہر سے مدد آتی دیکھ کر حویلی میں موجود جوانوں کا حوصلہ بڑھ گیا وہ سب حویلی سے باہر آ کر جنگ میں شریک ہو گئے۔

عثمان بھی چھت سے اتر کر لڑنے والوں میں شامل ہو چکا تھا مہاراج کے سپاہی عقب سے ہونے والے سے بھلا چکے تھے حویلی سے نکلنے والے جوان جب ان پر حملہ آور ہوئے تو وہ مزید بھلا ہٹ کا شکار ہو چکے تھے وہ چلنے کے دوپاٹوں میں پس چکے تھے چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔

صدقہ ماہر شیر زنوں کی طرح نہایت مہارت اور بے جگر سے لڑ رہی تھی اس کی تلوار سامنے آنے والے سپاہیوں کو گاجرمولی کی طرح کاٹ رہی تھی اور تو اور پردیپ بھی بڑھ چڑھ کر اس جنگ میں حصہ لے رہا تھا۔ دونوں ہمشکل بھائی الگ الگ لڑ رہے تھے لیکن دیکھنے والے انہیں میں جتلا ہو جاتے تھے عثمان اور صدقہ اس جنگ کے ہیرو یا مرکزی کردار تھے اس وقت میدان جنگ میں تمام لوگ ان ہی کی زیر نگرانی جنگ کر رہے تھے صدقہ نے ایک نئی تاریخ رقم کی تھی اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ عورت کمزور نہیں وہ چاہے تو پہاڑوں کو ہلا دے، صدقہ اس وقت چہرے پر نقاب

باندھے نوجوان لڑکا دکھائی دے رہی تھی جو اس کی تلوار کی زد میں آتا گا جرمولی کی طرح کٹ کر نیچے گر جاتا۔

مہاراج کے سپاہیوں کا خاتمہ ہوتا جا رہا تھا کچھ ہی گھنٹوں میں اس جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ مہاراج کے سپاہیوں کی بڑی تعداد ماری جا چکی تھی کچھ سپاہی بچے تھے جو افراتفری میں ادھر ادھر بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے ان بھاگنے والوں میں مہاراج، سپہ سالار گووند بھی چند سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے بھاگنے لگے۔ اچانک پانڈے کی نظر ان پر پڑی۔ ”مہاراج بھاگ رہا ہے پکڑو اسے۔“ وہ چلایا اور چند ساتھیوں کے ہمراہ اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

عثمان اور صدقہ نے بھی یہ منظر دیکھا قریب ہی ایک جیب کھڑی تھی خوش قسمتی سے چابی انکیشن میں لگی تھی صدقہ نے تیز رفتاری سے جیب ان کے پیچھے دوڑا دی۔

مہاراج کی جیب گووند پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا کچھ دیر بعد مہاراج کی جیب جھٹکا کھا کر کٹ گئی مہاراج اور اس کے ساتھی قریب موجود گھر میں بھاگتے ہوئے گھس گئے اس اثنا میں پانڈے اپنے نصف درجن ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ انہوں نے اس گھر کو گھیرے میں لے لیا جس میں مہاراج اور اس کے ساتھی روپوش تھے۔

صدقہ اور عثمان بھی پہنچ چکے تھے۔ ”اب کیا کریں؟“ پانڈے نے پوچھا۔ ”تم لوگ سامنے پوزیشن لے کر کھڑے ہو جاؤ میں عقبی سمت سے اندر جاتا ہوں۔“

”میں بھی چلوں گی۔“ صدقہ فیصلہ کن لہجہ میں بولی اور عثمان نے اثبات میں سر ہلادیا۔

وہ دونوں عقبی سمت کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے چاروں طرف سکوت چھایا ہوا تھا اسی وقت گھر کے سامنے والے حصے سے فائرنگ کی آواز سنائی دی شاید پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تھی مزاحمت میں مہاراج کے

پانڈے ان کا دست راست بنائے عثمان نے کسی قسم کا عہدہ لینے سے انکار کر دیا اس کا کہنا تھا کہ وہ مہمان ہے آج نہیں توکل چلا جائے گا۔

عثمان اور صدف کی شادی دھوم دھام سے ہوئی کچھ روز حویلی میں مہمان رہے۔ گنیش جی سے جانے کی اجازت چاہی مگر گنیش جی اور ریاست کے لوگوں نے اسے وہاں سے جانے کی اجازت نہ دی۔

ایک روز صدف اور عثمان اپنے بستر پر سوئے تھے کہ عثمان کو گئی نے جھنجھوڑ کر اٹھایا، وہ اٹھا سامنے وہی خوابوں والی روح کھڑی تھی جس کی وجہ سے وہ آج یہاں تھا۔ ”ماں تم آ گئی، میں نے سب کو ان کے انجام تک پہنچا دیا ہے۔“ عثمان بے اختیار بولا۔

وہ مسکرائی۔ ”ہاں تم نے اپنا حق ادا کر دیا ہے، اب پردیپ یہیں رہے گا تم ان لوگوں میں جاؤ گے جنہوں نے تمہاری پرورش کی تھی، تم پر ان کا حق ہے، یہ تمہاری تقدیر ہے، میرے پیچھے آؤ، اسے بھی اٹھاؤ، اب تم دونوں میرے زیر اثر چلتے رہو گے کوئی تمہیں نہیں دیکھے گا۔“ روح بولی۔

صدف بھی اٹھ چکی تھی وہ دونوں روح کے سحر کے اثر اس کے ساتھ چلتے ہوئے مندر میں جا پہنچے سرنگ کا راستہ کھلا تھا وہ سرنگ میں چلتے رہے آخر دوسرے دہانے پر جانکلے مندر کے باہر وہی بڑی جیپ کھڑی تھی شاید یہ اتفاق تھا وہ سحر زدہ سے اس میں بیٹھے۔

جیپ خود بخود چل پڑی کافی دیر بعد بلکہ کئی گھنٹوں بعد عثمان کو ہوش آیا۔ تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ جیپ ان کے گھر کے دروازے پر تھی اس کے پہلو میں صدف موجود تھی اور گیٹ پر اس کی پرورش کرنے والے والدین ایڈووکیٹ زبیر احمد والدہ بلیقیس بانو حیرت اور خوشی سے اسے اور صدف کو دیکھ رہے تھے دونوں جیپ سے نیچے اترے تو زبیر احمد اور والدہ بلیقیس بانو نے آگے بڑھ کر دونوں کو گلے لگالیا۔

لوگوں نے ان پر فائزنگ کی تھی وہ دونوں ہاتھوں میں رائفلیں تھامے چوکنے انداز میں دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوئے ایک سمت سے ان پر پے درپے دو فائر ہوئے دونوں نیچے گر گئے صدف نے گرتے گرتے اس سمت گولی چلا دی جہاں سے ان پر فائزنگ کی گئی تھی۔

جواب میں کرب میں ڈوبی انسانی چیخ سنائی دی عثمان نے سر اٹھا کر دیکھا ان سے کچھ فاصلے پر ایک سپاہی فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا وہ دائیں سمت والے کمرے کے دروازے کے پاس سے گزر رہے ہی تھے کہ اک دم کمرے کا دروازہ کھلا اور عثمان کے سر سے رائفل کی نال آ گئی اس نے مڑ کر دیکھا تو دروازے میں گووند کھڑا تھا جس کی رائفل کی نال اس کے سر سے لگی تھی جب کہ اس کے دراز قد ساتھی نے رائفل کی نال صدف کی پشت سے لگا رکھی تھی ”مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ، تم لوگوں کی وجہ سے مہاراج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔“ گووند سفاک لہجے میں بولا۔

صدف نے سر سالٹ قلابازی کھائی اور دراز قد کے سر سے ہوتی ہوئی اس کی پشت پر پہنچ گئی گووند نے گھبرا کر فائر کر دیا عثمان پھرتی سے گرا رائفل کی گولی دراز قد کے سینے میں لگ گئی اس سے پہلے کہ گووند رائفل کا رخ صدف یا عثمان کی طرف کرتا صدف نے برسٹ چلا دیا تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ گولیاں گووند کے سینے میں پیوست ہو گئیں وہ چیخا ہوا گر اور جہنم رسید ہو گیا۔

عثمان اور صدف آگے بڑھے، مہاراج دروازے کی طرف پانڈے اور اس کے ساتھیوں پر فائر کر رہا تھا آہٹ سن کر مڑا اور عثمان پر فائر کرنا چاہا جبکہ پانڈے کی رائفل سے گولی نکلی اور مہاراج کی پشت میں پیوست ہو گئی وہ لہرایا، عثمان نے اس کے دل کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ ریاست کا ظالم ترین انسان لاوارثوں کی طرح بے حس و حرکت نیچے پڑا تھا، ظلم کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

مہاراج کی ریاست کی گدی پر گنیش جی بیٹھے

